جلد پنجم

نفائس الفقہ

علمی وفقہی
مباحث ومضامین کا مجموعہ

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

مکتبہ مسیح الامت دیوبند و بنگلور

نفائس الفقہ

علمی وفقہی مباحث ومضامین کا مجموعہ

جلدِ پنجم

مؤلف

حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور

نام کتاب : نفائس الفقہ جلد پنجم

مؤلف : حضرت مولانا مفتی محمد شعیب اللہ خان صاحب مفتاحی دامت برکاتہم

بانی ومہتمم الجامعۃ الاسلامیہ مسیح العلوم بنگلور

وخلیفہ حضرت اقدس شاہ مفتی مظفر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ ناظم مظاہر علوم وقف سہارنپور

صفحات : ۵۲۲

تاریخ طباعت : رجب المرجب ۱۴۳۸ھ

ناشر : مکتبہ مسیح الامت دیوبند وبنگلور

موبائل نمبر : 9036701512 / 09634830797

ای۔میل : maktabahmaseehulummat@gmail.com

نفائس الفقہ (جلد پنجم)
پر ایک اجمالی نظر

- کیا اسلام نے حقِ میراث میں عورت سے ناانصافی کی ہے؟
- فتنہ انکار حدیث پر ایک طائرانہ نگاہ
- مولانا مودودی اور جماعت اسلامی
- قصہ نگاری میں قرآنی اسلوب
- اتفاق واختلاف کے شرعی حدود وآداب
- ربیع الاول کے مروجہ جلوس کا شرعی حکم
- عید کا مصافحہ اور راہ اعتدال
- اسلام اور نفقہ مطلقہ
- ووٹ اسلامی نقطۂ نگاہ سے
- کرسی پر نماز کی فقہی تحقیق
- یوتھینزیا [EUTANASIA] یعنی جذبہ رحم سے مریض کو مار دینے کا شرعی حکم
- دعائے سری اور جہری پر ایک محققانہ نظر
- عمرہ کیسے کریں؟
- ایک اہم فتوی بہ سلسلہ تبلیغی جماعت
- ہندوستان میں سعودی عرب کے مطابق رمضان وعید ایک علمی وفقہی تبصرہ

عناوین	صفحہ
کیا اسلام نے حقِ میراث میں عورت سے ناانصافی کی ہے؟	

اسلام اور نفقہ مطلقہ

کیا اسلام نے حقِ میراث میں عورت سے ناانصافی کی ہے؟

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
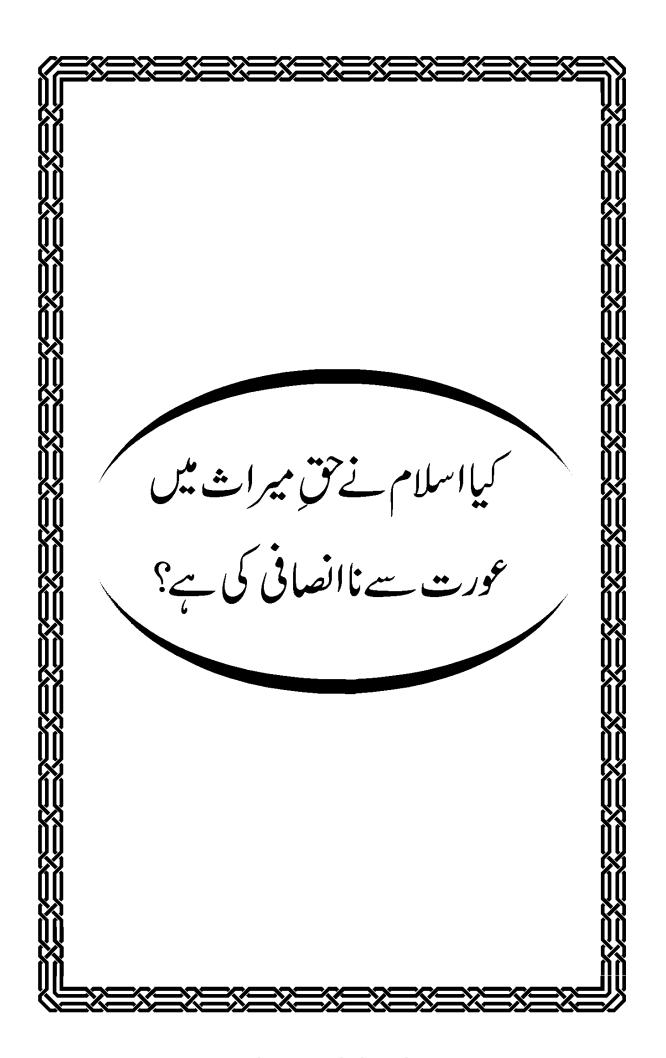
الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد الأنبياء و المرسلين: أما بعد

معاندینِ اسلام نے اپنی اسلام دشمنی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسلام کے خلاف جو محاذ بنانے کی کوشش کی ہے، اس کے لیے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگاتے رہتے ہیں اور اس کے لیے اسلام کی جانب جھوٹی سچی باتیں منسوب کی جاتی ہیں اور اسلامی تعلیمات کو بگاڑ کر پیش کرنے کی جدوجہد کی جاتی ہے اور ایک یہ بھی کرتے ہیں کہ اپنی نافہمی وقصورِ عقل وفہم کی وجہ سے سمجھ میں نہ آنے والی باتوں کو اسلام کے لیے عیب ونقص قرار دینے کی سعیٔ لاحاصل کرتے رہتے ہیں۔

اسی سلسلے کی ان کی ایک سعیٔ لاحاصل یہ بھی ہے کہ وہ بار بار یہ دہراتے رہتے ہیں کہ اسلام نے میراث میں عورتوں کو برابر کا حق نہیں دیا اور مرد کے مقابلے میں اس کا آدھا حق قرار دے کر اس کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔

چناں چہ ایک فرانسیسی مستشرق "Gaston Wiet" لکھتا ہے:

''اسلامی معاشرے میں عورت کا مقام بہت حد تک حقیر وذلیل ہے اور اس کے مقام ومرتبے کی حقارت اس کے تمام شعبہ ہائے زندگی میں ایک مسلمہ امر ہے...... یہاں تک کہ میراث میں بھی اس کا حصہ مرد کے حصہ سے آدھا ہے۔''(۱)

---

(۱) بہ حوالہ مفتریات الیونسکو از محمد عبداللہ السمان: ۳۸

یہ تو ان کی اسلام دشمنی کا ایک روپ ہے، جو ان سے کوئی بعید اور ناقابل تصور نہیں ہے؛ بل کہ ان کی اسلام دشمنی کے پیش نظر ان سے اسی کی امید کی جاسکتی ہے؛ کیوں کہ مشہور ہے:

وعين الرضا عن كل عيب كليلة

ولكن عين السخط تبدي المساويا

لہٰذا اگر دشمنانِ اسلام کی جانب سے ایسی باتیں پیش آئیں اور وہ اسلام کے خلاف زہر اگلیں اور اس کی خوبیوں کو بھی خامیوں کا نام دیں، تو کوئی تعجب وحیرت بالکل بھی نہیں ہے۔

لیکن، لیکن، لیکن: افسوس تو یہ ہے کہ یہ بے ہودہ پروپگنڈا ان لوگوں کو بھی متاثر ومرعوب کررہا ہے، جو اسلام کے نام لیوا اور دین وشریعت کے حامل ہیں، چناں چہ جدید تعلیم یافتہ لوگوں کا ایک طبقہ جو مستشرقین کی کتابوں ہی کو معیارِ حق وانصاف اور تحقیق وریسرچ کا منبع خیال کرتا ہے، وہ بھی اسلام دشمن لوگوں کے ساتھ ہاں میں ہاں ملاتا نظر آتا ہے۔

چناں چہ ایک مسلم دانشور دکتور ''نصر ابوزید'' نے لکھا ہے:

''اسلام میں عورت کی تکریم وعزت عموماً اور خاص طور پر میراث کے مسئلے میں دورِ اسلام سے پہلے کے لحاظ سے مانی جاسکتی ہے؛ لیکن جب ہم اسلام کے زمانے کے بعد اور خاص طور پر موجودہ دور کے لحاظ سے غور کرتے ہیں، تو اسلام کی تعلیم عورت کی عزت وکرامت کے لائق نہیں معلوم ہوتی؛ کیوں کہ اسلام کہتا ہے کہ لڑکے کو لڑکی کے مقابلے میں دو حصے ہیں؛ بات یہ ہے کہ اسلام کا پیغام اس دور میں آیا تھا، جب

کہ عورت کو میراث میں کوئی بھی حصہ نہ ملتا تھا؛ بل کہ خود عورت کو میراث میں وارثین کو دے دیا جاتا تھا؛ لہٰذا اسلام کی مراد و مقصد اس حکم سے یہ ہے کہ عورت کے مقام کو آہستہ آہستہ آگے لایا جائے۔‘‘(۱)

یہ سب دراصل اسلام کے بارے میں صحیح معلومات نہ ہونے اور دشمنانِ اسلام کی پروپگنڈے سے مرعوب و متاثر ہونے کا نتیجہ ہے۔

اور بعض لوگ جو اس سلسلے میں کچھ سنجیدہ ہیں اور اسلام کی عظمت و فوقیت کے قائل ہیں، وہ بھی قرآن میں بیان کردہ مرحوم کے بیٹے اور بیٹیوں کے حصے کے تفاوت و فرق کو ہضم نہیں کر پاتے اور اس قرآنی حکم میں تاویل کرتے ہیں۔ چناں چہ بعض نے یہ کہا ہے کہ لڑکی کو نصف دینے کا حکم یہ مطلب رکھتا ہے کہ کم از کم اتنا دیا جائے، یہ مطلب نہیں کہ صرف اس قدر دیا جائے۔

لیکن جن انصاف پسند روحوں نے ’’قرآنی نظامِ حیات‘‘ اور ’’شرعی دستورِ عمل‘‘ کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ وہ اس قانون و نظام کی دل کھول کر تعریف کریں اور اس کو سب سے زیادہ عمدہ و بہتر قانون و نظام تسلیم کریں۔

غوستاف لوبون اپنی کتاب ’’حضارۃ العرب‘‘ میں لکھتا ہے:

’’میراث کے جو اصول قرآن بیان کرتا ہے، وہ نہایت ہی عدل و انصاف پر مبنی ہیں اور ان کے پڑھنے والے کے لیے ان آیات سے جو میں نقل کروں گا، اس کو سمجھنا ممکن ہے اور ان آیات اور فرانسیسی اور انگریزی حقوق کے تقابل سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ اسلامی شریعت نے بیویوں کو جن کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ

---

(۱) بہ حوالہ: شبهات حول قضايا المراة المسلمة : از عبدالحمید عید عوض :۳

مسلمان ان کے ساتھ بہتر معاشرت اختیار نہیں کرتے، انھیں میراث میں اتنے حقوق دیے ہیں کہ ہم اس جیسے حقوق ہمارے قوانین میں نہیں پاتے''۔(۱)

اور مسز اینی بیسنٹ(Annie Besant) لکچرس میں ایک جگہ کہتی ہیں:

I often thick that woman is more free in Islam than in Christianity. Woman is more protected by Islam than by the faith that preaches monogamy. In Al-Quran the law about woman is more just and liberal. It is only in the last twenty years that Christian England has recognized the right of women to property , while Islam has allowed this right from all times.(۲)

(میں بارہا سوچتی ہوں کہ عورت اسلام میں عیسائیت کی بہ نسبت زیادہ آزاد ہے۔عورت اسلام کی جانب سے زیادہ محفوظ ہے بہ نسبت اس نظریے کے جو یک زوجگی کی تعلیم دیتا ہے۔قرآن میں عورت سے متعلق قانون زیادہ عادلانہ اور آزادانہ ہے۔صرف گزشتہ بیس کا عرصہ ہوا ہے کہ عیسائی انگلینڈ نے عورت کا حق ملکیت تسلیم کیا ہے، جب

---

(۱) المرأة بين الفقه و القانون:۱۷۱،۱۷۲

(۲) The Life and Teachings of Muhammad : 25-26

کہ اسلام نے اس کو یہ حق ہر وقت عطا کیا ہے۔)

الغرض جن لوگوں نے اسلام کا سنجیدگی اور انصاف پسندی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے، انھوں نے بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے اس کی خوبیوں اور اس کی معقولیت وانصاف پسندی کو تسلیم کیا ہے۔

ہم یہاں صرف اسی ''میراثِ خاتون'' کے پہلو سے مختصر کلام کرنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اسلام نے عورت کو جو حق دیا ہے، وہ عدل وانصاف کا ضامن ہے۔

اسلام سے قبل اقوامِ عالم میں عورت کی میراث

اس سلسلے میں اسلامی نقطۂ نظر سے کلام کرنے سے قبل ہم یہ چاہتے ہیں کہ یہ دکھائیں کہ اسلام سے قبل جو اقوام و مذاہب دنیا میں پائے جاتے تھے، ان میں عورت کی میراث کا کیا نظام وقانون تھا؟ تاکہ اس تقابلی مطالعے سے یہ سمجھا جاسکے کہ اسلام کا نظامِ میراث کس قدر معقول ومعتدل اور فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے اور یہ کہ جو لوگ اسلام کے نظامِ میراث پر تعصب وتنگ دلی کی بنا پر اعتراض واشکال کرتے ہیں، ان کی بات میں کہاں تک صداقت ومعقولیت پائی جاتی ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ قانون و نظامِ میراث تو تمام آسمانی مذاہب اور وضعی قوانین میں ملتا ہے؛ مگر اس کا ایک مکمل نظام اور اس کے تمام اصول وقواعد کے ساتھ جس طرح کہ اسلام نے پیش کیا ہے، کہیں اور نہیں ملتا؛ بل کہ پیش تر مذاہب میں یہ نظام وقانون لوگوں کے اجتہادات کا نتیجہ ہے۔

رہی عورت، تو اس کے بارے میں کہیں افراط سے کام لیا گیا ہے، تو کہیں تفریط کو دخل دیا گیا ہے؛ جس کی وجہ سے عورت سے متعلق نظامِ میراث حدودِ اعتدال سے خارج نظر آتا ہے۔

بابلیوں کا نظامِ میراث اور عورت

بابلیوں کا نظامِ میراث ''حمورابی قانون'' (جس کو ''مدونۂ حمورابی'' کہتے ہیں اور جو بابل کے بادشاہوں میں سے ایک مشہور بادشاہ حمورابی کی جانب منسوب ہے) پر قائم تھا، جو کہ نہایت قدیم قوانین میں شمار کیا جاتا ہے اور یہ ان قوانین میں سے ہے، جن کو زمانۂ قدیم میں ترقی یافتہ قانون سمجھا جاتا تھا۔

اس قانون کی رو سے عورتوں کا کوئی حق میراث میں نہیں مانا جاتا تھا؛ الا یہ کہ وارثین میں کوئی نرینہ اولاد نہ ہو۔

اسی طرح عورت کو اس وقت بھی میراث میں حصہ نہیں تھا، جب کہ میت کا کوئی بھائی موجود ہو؛ لہٰذا میت کی نرینہ اولاد اور کوئی بھائی نہ ہو، تب عورت کو حصہ ملتا تھا۔ (۱)

اور جس لڑکی کی شادی ہو جائے، اس کا باپ کی جائیداد میں کوئی حصہ نہیں تھا، خواہ اس کے ساتھ اس کا بھائی ہو یا نہ ہو؛ البتہ شادی کے وقت اس کو ''جہیز'' دے دیا جاتا تھا، اس کے بعد اس کا کوئی حصہ میراث میں نہیں ہوتا تھا۔ (۲)

یونانیوں کا قانونِ میراث اور عورت

یونانی قوم اپنے وقت کی تہذیب یافتہ اور متمدن اقوام میں شمار ہوتی تھی؛ مگر اس کے باوجود ان کے یہاں قانونِ میراث یہ تھا کہ جو شخص خاندان اور فیملی کی نگہ داشت اور اس کے حقوق و فرائض انجام دینے کی صلاحیت رکھتا تھا، اسی کو میراث کا حق دار قرار دیا گیا تھا۔ لہٰذا ان کے یہاں بھی صرف لڑکوں کو حصہ ملتا تھا، لڑکیاں چوں کہ یہ

---

(۱) الإعجاز لنظام المیراث از احمد یوسف سلیمان

(۲) تاریخ الشرق الأدنی القدیم مصر و العراق از عبدالعزیز الصالح

ذمے داری نہیں اٹھاتیں؛ اس لیے ان کا کوئی حصہ میراث میں نہیں۔ (۱)

شیخ مصطفیٰ السباعی لکھتے ہیں:

''رہی قانونی جہت تو اس لحاظ سے عورت ان کے نزدیک ایک گرے پڑے سامان کی طرح تھی، جس کو بازار میں خریدا اور بیچا جا سکتا تھا اور ان تمام حقوق سے جو شہری حقوق کی جانب عائد ہوتے ہیں، اس کو محروم کر دیا گیا تھا اور اس کو میراث میں حق نہیں دیا جاتا تھا۔''(۲)

ہندو قانونِ میراث اور عورت

ہندو مذہب کے مطابق میراث میں عورتوں کا کوئی حق نہیں تھا اور باپ کی ساری میراث لڑکوں کو دی جاتی تھی؛ بل کہ ان کے یہاں ایک زمانے تک عورت اس کی بھی حق دار نہیں سمجھی جاتی تھی، کہ وہ کسی چیز کی مالک بنے اور ہندوؤں کے ایک مکتبِ فکر ''متا کشرا'' کے مطابق مشترک خاندان میں صرف اس قدر حق تھا، کہ وہ اپنے روزانہ کا خرچہ حاصل کر سکتی تھی۔

یہاں ہم عورت کے تعلق سے ہندو قانون کے حوالے سے چند امور کا ذکر کرتے ہیں، جن سے ہندو قانون میں عورت کی میراث پر روشنی پڑتی ہے۔

منوسمرتی (۹:۱۰۴) میں لکھا ہے:

''ماں باپ کی تمام دولت بڑا بیٹا لے، چھوٹا اور منجھلا بھائی سب بڑے بھائی سے اوقات گزاری کریں، جس طرح والدین سے پرورش

---

(۱) أحكام الميراث في الشريعة از دکتور محمد محمد براج: ۵۷، ميراث المرأة بين الشريعة والقانون: ۲۰

(۲) المرأة بين الفقه والقانون: ۱۳

پاتے تھے۔"(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ ہندو قانون کے مطابق ماں باپ کی تمام دولت کا مستحق بڑا بیٹا ہے؛ حتی کہ چھوٹے بیٹے بھی اسی کے دست نگر ہوتے ہیں اور ان کو بھی میراث سے کوئی حصہ نہیں ملتا۔

"مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ" میں ہندو مذہب کی معتبر کتب: "یجر وید"، "اتھر وید" اور "منو" وغیرہ کے حوالے سے عورت کے متعلق ہندو مذہب کے درج ذیل قانون بیان کیے ہیں:

(۱) عورت اور شودر دونوں کو نردھن (مال سے محروم) کہا گیا ہے۔

(۲) لڑکی باپ کی جائیداد کی وارث نہیں ہے۔

(۳) اگر کسی بیوہ کو اپنے خاوند کی طرف سے جائیداد ملتی ہے، تو اسے جائیداد کی بیع وفروخت کا کوئی اختیار نہیں۔

(۴) مذکر اولاد نہ ہوتے ہوئے بھی بیٹی وارث نہیں؛ بل کہ متبنی جو غیر کا بیٹا ہوتا ہے، وارث ہوگا۔(۲)

اس سے اندازہ لگانا کوئی مشکل نہیں، کہ ہندو مذہب میں عورت کا کیا مقام ہے اور اس کو کیا حقوق دیے گئے ہیں؟ اور یہ کہ میراث میں اس کا کوئی حصہ نہیں اور اگر خاوند سے جائیداد ملے، تو وہ اس کو بیع وفروخت کرنے کا اختیار نہیں رکھتی تھی۔

پھر ہندوستان میں ۱۹۵۶ء میں ایک ایکٹ منظور ہوا، جس کے ذریعے عورت کو ملکیت کی حق دار قرار دیا گیا، اس ایکٹ کو (Hindu Succession Act 1956)

(۱) بہ حوالہ مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ: ۱۶۱

(۲) بہ حوالہ مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ: ۱۲۸

کہا جاتا ہے۔ یہ ایکٹ بھارت کی پارلیمان کی جانب سے ایک قانونی ترمیم تھی؛ تا کہ غیر وصیت شدہ وراثت اور نظام وراثت کو یقینی بنایا جا سکے۔ یہ قانون ہندؤں، بدھ متیوں، جینیوں اور سکھوں میں نافذ ہے۔ یہ ہندؤں کے دو مکاتبِ فکر میتا کشر اور دایہ بھاگ دونوں کے ماننے والوں پر لاگو ہوتا ہے۔ اس قانون کے ذریعے جائیدادوں کے حوالے سے ہندو خواتین کے محدود اختیارات کو کالعدم قرار دیا گیا اور کسی بھی عورت کی محصلہ جائداد پر اس کا مکمل اختیار مانا گیا اور اس کو اس میں تصرف، دیکھ ریکھ اور فروخت کا مکمل اختیار دیا گیا۔

مگر اس میں بھی عورت کو میراث میں حصہ دینے کا کوئی واضح قانون نہیں تھا، اس لیے پھر ۲۰۰۵ء میں ایک بل منظور ہوا، جس کو (The Hindu Succession Amendment Act , 2005) کہا جاتا ہے، اس ایکٹ کی دفعہ ((3/a)) کے ذریعے ہندو عورت کو یہ حق دیا گیا، کہ باپ کی مشترکہ جائداد میں لڑکی کا حصہ بھی لڑکے کے برابر ہوگا۔

یہودی نظامِ میراث اور عورت

یہودی نظامِ میراث میں بھی عورت کا حق اسی وقت تھا، جب کہ اولاد نرینہ نہ ہو اور اولاد نرینہ کے ہوتے ہوئے عورت کو کوئی حقِ میراث میں نہیں دیا جاتا تھا۔

تورات میں جو اس سلسلے میں احکام ملتے ہیں، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کا میراث میں حصہ اس وقت ہے، جب کہ کوئی لڑکا موجود نہ ہو۔

چناں چہ تورات کی کتاب ''گنتی'' میں ہے کہ جب صلافحاد کی بیٹیاں حضرت موسیٰ سے اپنے باپ کی میراث مانگنے آئیں، تو آپ نے ان کا معاملہ خداوند کے

سامنے پیش کیا اور خداوند کا حکم آیا:

''اور تو بنی اسرائیل سے کہہ کہ اگر کوئی آدمی مر جائے اور اس کا کوئی بیٹا نہ ہو، تو اس کی میراث اس کی بیٹی کو دینا۔ اگر اس کی کوئی بیٹی نہ ہو، تو اس کی میراث اس کے بھائیوں کو دینا اور اگر اس کا کوئی بھائی بھی نہ ہو، تو اس کی میراث اس کے باپ کے بھائیوں کو دینا اور اگر اس کے باپ کے بھائی بھی نہ ہوں، تو تو اس فرقے میں جو بھی اس کا سب سے قریبی رشتہ دار ہو، اسے اس کی میراث دینا؛ تاکہ وہ اس کی ملکیت بن جائے اور یہ بنی اسرائیل کے لیے خداوند نے موسیٰ کو دیے ہوئے حکم کے مطابق شرعی فرض ہوگا۔''(۱)

تورات کی ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے بائبل کے معروف و مستند مفسر Metthew Henry نے لکھا ہے:

"In case a man has no son, his estate should go to his daughters, not to the eldest, as the eldest son, but to them all in copartner ship, share and share alike. Those that in such case deprive their daughters of their tight, purely to keep up the name of their family, unless a valuable consideration be allowed them, may make the entail of their land surer than the

(۱) تورات: کتاب گنتی: باب ۲۷/ آیات: ۱۱۵

entail of a blessing with them.(1)

تورات کی ان آیات اور اس کی اس تفسیر سے معلوم ہوا، کہ لڑکی کا حصہ اس وقت بتایا گیا ہے، جب کہ کوئی لڑکا نہ ہو اور اس کے بعد بھی بھائیوں کو دینے کا حکم تو ہے؛ لیکن بہن کو دینے کا کوئی قانون نہیں بیان کیا گیا ہے۔

اسی طرح تورات میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ لڑکی کو میراث کا حصہ اس وقت ملے گا، جب کہ وہ اپنی ہی قبیلے وخاندان میں بیاہی جائے اور اگر باہر کسی اور قبیلے میں اس کی شادی ہوئی تو اس کو میراث کا حصہ نہیں ملے گا۔

تورات کی اسی کتاب ''گنتی'' میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کا یہ حکم آیا:

''صلافحاد کی بیٹیوں کے حق میں خداوند کا حکم یہ ہے کہ وہ جس کسی کو چاہیں اس سے بیاہ کرلیں؛ لیکن وہ اپنے باپ دادا کے قبیلے کی فرقوں میں ہی بیاہی جائیں۔ بنی اسرائیل میں میراث ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں جانے نہ پائے اور ہر اسرائیلی اپنا ملک جسے اس نے اپنے باپ دادا سے میراث میں پایا ہے، اپنے ہی قبضے میں رکھے۔ ہر بیٹی جو بنی اسرائیل کے کسی قبیلے میں میراث پاتی ہے، وہ اپنے آبائی قبیلے کے فرقوں میں ہی بیاہی جائے؛ تاکہ ہر اسرائیلی اپنے باپ دادا کی میراث پر قابض رہے۔ کوئی میراث ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں جانے نہ پائے؛ بل کہ ہر اسرائیلی قبیلہ اپنی اپنی میراث اپنے قبضے میں رکھے۔''(۲)

---

(۱) Commentary of Bible by Matthew Henry , V : 1, p: 1012

(۲) تورات: کتاب گنتی: باب/36 آیات: ۵،۹

مزید یہ بھی تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کے دولڑکے ہوں ایک بڑا ایک چھوٹا تو بڑے بیٹے کو دو حصے دیے جائیں گے اور چھوٹے کو ایک حصہ ملے گا۔

تورات کی پانچویں کتاب ''استثناء'' میں ہے:

''اگر کسی مرد کی دو بیویاں ہوں اور وہ ایک سے محبت کرتا ہو اور دوسری سے نہیں اور دونوں سے اس کے بیٹے پیدا ہوں؛ لیکن پہلوٹھا اس بیوی کا ہو، جس سے وہ محبت نہیں کرتا؛ تو جب وہ اپنے بیٹوں کو اپنی جائیداد کا وارث بنائے، تب وہ پہلوٹھے کے حق کے پیشِ نظر اپنی چہیتی بیوی کے بیٹے کو اپنے حقیقی پہلوٹھے پر فوقیت نہ دے، جو اس بیوی کا بیٹا ہے، جو اس کی چہیتی نہیں تھی۔ وہ اپنے غیر محبوبہ بیوی کے بیٹے کو پہلوٹھا مان کر اسے اپنی جائیداد میں سے دوگنا حصے دے۔''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ یہود میں یہ دستور تھا کہ اگر کوئی ان کے یہاں مرتا تھا، تو اس کی ساری جائیداد و املاک کے وارث صرف لڑکے ہوتے تھے اور دوسرے تمام رشتہ دار محروم ہوتے تھے اور لڑکوں میں سے بڑا لڑکا دو حصہ پاتا تھا اور دوسرے لڑکوں کو ایک حصہ ملتا تھا؛ البتہ نابالغ لڑکیوں کو اور غیر شادی شدہ لڑکیوں کو باپ کی چھوڑی ہوئی جائیداد و املاک سے خرچہ ملتا تھا اور اگر کوئی لڑکا نہ ہوتا، تو لڑکیوں کو حصہ دیا جاتا تھا۔

اور بیوی کا کوئی حق میراث میں نہیں تھا اور بیوی اگر کچھ کمائے، تو اس کا مالک شوہر ہوتا تھا اور بیوی کا انتقال ہو جائے، تو شوہر اس کا حق دار سمجھا جاتا تھا۔(۲)

---

(۱) تورات: کتاب استثناء: باب ۲۱/آیات: ۱۵، ۱۷

(۲) أحکام المیراث في الشریعة از دکتور جمعہ محمد محمد براج: ۴۹

عیسائیوں کا نظامِ میراث اور عورت

عیسائی مذہب کے بارے میں پہلے تو یہ جان لینا چاہیے کہ ایک زمانہ گزرا ہے کہ ''عیسائی چرچ'' اور ''پاپائیت'' نے عورت کو ''انسان'' تک ماننے سے انکار کیا ہے اور عورت کو ایک نجس و ناپاک مخلوق قرار دینے پر اصرار کیا ہے؛ حتی کہ عورت کو ایک بے روح مخلوق کا درجہ دیا ہے۔

معروف عیسائی مصنفہ Matilda Joslyn Gage اپنی کتاب:
Woman , Church and State , A Historical Account of the Status of Woman Through the Chiristain Ages,
میں لکھا ہے:

> ''یہ قدیم (عیسائی) مذہبی لوگ جو عورت کی فطرت پر بحث کو ایک نتیجہ خیز موضوع سمجھتے تھے، ان میں سے بیش تر لوگ عورت کو روح و عقل سے عاری وحشی انسان Brute) کے زمرے میں داخل مانتے تھے۔ چھٹی صدی (۵۸۵) میں انسٹھ (۵۹) عیسائی بشپوں نے اس سوال پر بحث میں اپنا وقت گزارا کہ عورت کی روح ہوتی ہے یا نہیں؟ ایک جانب اس بات پر زور دیا جا رہا تھا کہ عورت کو انسان نہیں قرار دیا جاسکتا، جب کہ دوسری جانب یہ کہا جا رہا تھا کہ عورت کو انسان کہا جائے گا؛ کیوں کہ اولاً آسمانی کتابیں یہ باور کراتی ہیں، کہ خدا نے انسان، مذکر و مؤنث دونوں کو پیدا کیا اور دوسرے اس وجہ سے حضرت عیسیٰ مسیح، جو کہ عورت کے بیٹے ہیں، ان کو انسان کا بیٹا کہا جاتا ہے۔''

آگے چل کر وہ لکھتی ہے:

''عظیم پتر کے زمانے تک ان علاقوں میں جہاں عیسائیوں کی ولایت وحکومت تھی، جس کو''عظیم یونانی چرچ'' کہا جاتا ہے، عورتوں کو انسان تسلیم نہیں کیا گیا تھا، وہاں مردم شماری کے وقت صرف مردوں کو گنا جاتا تھا، کسی عورت کو نہیں گنا جاتا تھا۔''

وہ مزید رقم کرتی ہے:

''جب 1854 میں Philadelphia میں حقوق نسواں کنونشن ہوا، اس میں ایک حقوق نسواں پر اعتراض کرنے والے نے برملا یہ لوگوں کے سامنے کہا کہ عورتیں پہلے یہ ثابت تو کریں کہ ان کے روح بھی ہوتی ہے، جب کہ چرچ اور حکومت دونوں اس کا نکار کرتے ہیں۔''(۱)

آپ اس سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عیسائیوں کے مذہبی وسیاسی دونوں طبقات عورت کو انسان ہی نہیں مانتے تھے، تو اس کو حقوق دینے کا کیا سوال پیدا ہوتا ہے؛ بل کہ وہ عورتوں سے یہی مطالبہ کریں گے کہ اپنا انسان ہونا ثابت کرو، تو حقوق دیے جائیں گے۔

عیسائیوں کے یہاں ان کی کتاب:''انجیل'' میں اس سلسلے میں کوئی قانون ونظام نہیں ملتا؛ کیوں کہ اس میں عموماً وعظ وتذکیر ہی پر سارا زور دیا گیا ہے؛ اس لیے اس میں زیادہ تر مواعظ وامثال سے کام لیا گیا ہے۔ رہا کسی بھی سلسلے کا قانونی پہلو تو اس سلسلے میں کوئی خاص بات نہیں ملتی؛ اس لیے وہ یا تو خود کو تورات ہی کے احکام کے مکلّف سمجھتے ہیں یا ان کو اپنا نظامِ میراث مختلف شرائع سے لے کر ایک مخلوط قسم کا نظام بنانا پڑتا ہے۔

---

(۱) ۵۵-۵۷

یہاں تک کہ انگریزی قانون میں ۱۸۰۵ء تک یہ قانون تھا کہ مرد اپنی بیوی کو بیچ سکتا ہے اور اس کی قیمت چھ پنس مقرر کی گئی تھی اور جب انقلابِ فرانس واقع ہوا اور یہ اعلان کیا گیا کہ انسان غلامی اور ذلت سے آزاد ہے گا، تو اس میں بھی عورت کو شامل نہیں کیا گیا تھا، حتی کہ فرانسیسی شہری قانون نے یہ تصریح کی کہ اگر عورت شادی شدہ نہیں ہے، تو وہ اپنے ولی کی رضا کی بغیر کوئی معاملہ کرنے کی اہل نہیں ہے۔ (۱)

اور بعض تاریخی روایات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں میں بھی عورتوں کو میراث میں سے حصہ نہیں دیا جاتا تھا، بل کہ صرف لڑکوں کو دینے کا رواج تھا۔

ایک تاریخی واقعہ

یہاں اس سلسلے میں ایک تاریخی واقعے کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے، جس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں میں عورتوں کو حق دینے کا نہ صرف یہ کہ رواج نہیں تھا؛ بل کہ اس حق کو ماننے سے بھی انکار تھا اور جہاں کوئی ایسا قانون نافذ کیا گیا، تو وہ اس کے خلاف بغاوت پر آمادہ ہوئے۔

شیخ مصطفیٰ السباعی نے اپنی کتاب ''المراۃ بین الفقه و القانون'' میں ذکر کیا ہے، کہ خلافتِ عثمانیہ کے دور میں جب میراث کے متعلق اسلامی شریعت کے احکام لاگو کیے گئے اور وہاں کے عیسائیوں پر بھی وہ لاگو ہوئے، تو جبلِ لبنان کے رہنے والے عیسائی اس پر چراغ پا ہو گئے؛ کیوں کہ اسلامی قانون سے عورت کو اپنے بھائی کا نصف حصہ دیا جاتا ہے اور یہ لوگ عورتوں کو میراث دینے کے عادی نہیں تھے۔

پھر اس واقعے کا ذکر شیخ السباعی نے مطران عبد اللہ کی کتاب'' مختصر الشریعة '' پر لکھے گئے پولوس سعد کے مقدمے کے حوالے سے کیا ہے، جس کا

(۱) المرأة بين الفقه و القانون للشيخ السباعي:۱۹

خلاصہ یہ ہے:

''بطریق یوسف حبیش نے جو خط ''مجمع نشر الإیمان المقدس '' کے رئیس کو ۲۹ ر ستمبر ر ۱۸۴۰ء کو بھیجا تھا، اس میں لکھا تھا کہ اب جب کہ قاضی حضرات یہاں جبل کے علاقے میں تمام امور شریعتِ اسلامیہ کے مطابق کرنے لگے ہیں، تو یہاں کے لوگ اس تغیر کی وجہ سے ظلم و پریشانی کا شکار ہیں اور خاص طور پر لڑکیوں کی میراث کی وجہ سے؛ کیوں کہ اسلامی شریعت دو لڑکیوں کے لیے ایک لڑکے کے برابر میراث مقرر کرتی ہے اور یہیں سے لڑائیاں اور جھگڑے اور سنگین قسم کی شرانگیزیاں اور ہنگامے واقع ہو گئے: اس وجہ سے کہ پہلے سے یہاں جبل کے علاقے میں جمہور کی خواہ وہ مال دار ہوں یا فقیر؛ یہ عادت چلی آ رہی ہے کہ لڑکی کا میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے؛ الا یہ کہ اس کو باپ کے مال سے شادی کے وقت جہیز دے دیا جاتا ہے، یا یہ کہ وہ اس کے حق میں کوئی وصیت کر جائے۔ لہٰذا اب قاضیوں کے اس عادت کے خلاف سلوک کی وجہ سے والدین سخت قسم کی خبط الحالی میں مبتلا ہو گئے ہیں، جو ان کی جانوں کے لیے مضر ہے؛ کیوں کہ والدین شریعتِ اسلامیہ کے مطابق اپنی لڑکیوں کو میراث دینے اس لیے راضی نہیں ہیں کہ اس سے ان کے مالوں کا اسراف اور گھرانے کی خرابی پیدا ہوتی ہے اور اس لیے وہ لوگ یہ حیلہ کرنے لگے ہیں کہ اپنی زندگی ہی میں لڑکوں کو بہ طریقِ ہبہ وعطیہ دے دیتے ہیں؛ تا کہ بعد میں لڑکیاں اس کا دعوی نہ کر سکیں۔

اس کے بعد بطریق مذکور نے لکھا کہ اس سے ہمارے لیے یہ بات لازمی طور پر واضح ہوگئی کہ ہمیں کوشش کرنا چاہیے کہ لڑکیوں اور عورتوں کی میراث کے سلسلے میں ہم اپنے پرانے طریقے اور عادت کی جانب رجوع کریں یعنی عورتوں کو لڑکوں کے ہوتے ہوئے میراث نہ دیں؛ تاکہ سکون وقرار ہو اور شر کے اسباب ختم ہو جائیں۔ (۱)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ عیسائیوں میں لڑکیوں کی میراث کے سلسلے میں کیا حال تھا کہ وہ ان کو میراث دینے کے قطعاً روادار نہیں تھے، یہاں تک کہ خلافتِ عثمانیہ میں جب اسلامی شریعت کے مطابق لڑکی کو ایک حصہ دینے کا قانون نافذ کیا گیا، تو وہاں کے عیسائیوں کی نیندیں حرام ہوگئیں، فسادات و ہنگامے شروع ہوگئے اور ماں باپ پریشان ہوگئے اور اس کے خلاف جدوجہد کرنے پر اتر آئے اور لڑکیوں کو میراث سے محروم کرنے کی خاطر اپنی زندگیوں میں ہی لڑکوں کو ہبہ وتملیک کی شکل میں اپنا مال دینے لگے۔

الغرض عیسائی اقوام میں بھی عورت کو میراث سے حصہ دینے کا کوئی قانون ونظام نہیں تھا، پھر بعد میں یہ لوگ اپنے اپنے ممالک کے رائج قوانین ہی کو اختیار کرنے لگے اور آج اسی پر چل رہے ہیں۔

جاہلی عرب میں نظامِ میراث اور عورت

زمانۂ جاہلیت میں عربوں کے یہاں جو نظام میراث رائج تھا، اس میں بھی عورت کا کوئی حصہ نہیں تھا، ان کا خیال یہ تھا کہ میراث سے اسی کو حصہ ملنا چاہیے، جو جنگوں میں لڑتا ہے اور خاندان کی محافظت ونگہ داشت کرتا ہے اور یہ کہا جاتا تھا کہ ’’كيف نعطي المال من لا يركب فرساً و لا يحملُ سيفاً ولا يُقاتِلُ

(۱) المرأة بين الفقه و القانون للشيخ السباعي:۲۳،۳۱

عَدُوّاً ؟ ''(ہم کیسے مال اس کو دیں، جو نہ گھوڑے کی سواری کر سکتا ہے، نہ تلوار اٹھا سکتا ہے اور نہ دشمن سے لڑ سکتا ہے۔)(۱)

لہٰذا عربوں میں میراث کا حصہ دار وہی ہو سکتا تھا، جو یہ کام کرتا ہو؛ اس لیے بچے بھی وراثت سے محروم ہوتے تھے؛ کیوں کہ وہ یہ کام نہیں کر سکتے ،اسی طرح ان کے یہاں عورت کا بھی میراث میں کوئی حصہ نہیں تھا؛ کیوں کہ وہ جنگوں میں نہیں جاتی اور نہ تلوار اٹھانے اور دشمن سے مقابلہ کرنے کی ہمت رکھتی ہے۔

یہیں سے معلوم ہوتا ہے کہ جاہلی دور کے عربوں میں عورتوں کے لیے میراث کا کوئی حصہ نہیں ہوتا تھا؛ بل کہ ان کے یہاں میراث مخصوص تھی مردوں کے ساتھ، جو جنگ کرنے اور دشمن کا مقابلہ کرنے کی ہمت و طاقت رکھتا ہو۔

جب اسلام آیا اور اس نے ان کے جاہلی رسومات کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اس میں میراث کے احکام بھی نازل ہوئے اور قرآن میں عورتوں کا حق بتایا گیا ،تو جو لوگ اسلام لا چکے تھے، ان کو بھی اس پر اولاً حیرت و استعجاب ہوا کہ کیا عورتوں کا بھی میراث میں حصہ ہے؟ حتی کہ ان کو اس پر اس قدر حیرت ہوئی کہ اس حکمِ خداوندی کو آپ علیہ السلام کے سہو و نسیان پر محمول کرنے لگے اور بعض نے یہ خواہش کی کہ یہ حکم منسوخ ہو جائے۔

امام ابن جریر طبری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے:

''جب آیتِ میراث نازل ہوئی، جس میں مردوں اور عورتوں کا حصہ فرض کیا گیا ہے، تو بعض کو یہ بات حیرت ناک لگی اور انھوں نے کہا کہ کیا عورت کو بھی حصہ دیا جائے گا اور کیا چھوٹے بچے کو بھی دیا جائے گا،

(۱) روائع البيان للصابوني:۱/۱۹۸

جب کہ یہ لوگ قتال نہیں کرتے اور نہ مال غنیمت لاتے ہیں؟ اس کلام سے خاموشی اختیار کرو، ممکن ہے کہ اللہ کے رسول کو بھول ہوگئی ہو یا یہ کہ آپ اس کو بدل دیں ۔ چناں چہ ان لوگوں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے جا کر عرض کیا کہ کیا ہم لڑکی کو باپ کے ترکے سے آدھا دیں گے، جب کہ وہ نہ گھوڑے کی سواری کرسکتی ہے، نہ دشمن سے لڑسکتی ہے اور کیا ہم میراث سے بچے کا بھی حصہ دیں گے، جب کہ یہ ہمیں کچھ کام نہیں آتا؟ ابن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ جاہلیت میں میراث صرف اسی کو دیتے تھے، جو جنگ میں لڑنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پس وہ بڑے لڑکے کو پھر اس کے بعد والے کو ترتیب وار دیتے تھے۔''(۱)

الغرض عربوں کے دستور میں بھی عورتوں کا میراث میں کوئی حق نہیں تھا، صرف لڑکوں کو دینے کا رواج تھا اور وہ بھی صرف بالغ لڑکوں کو، جو جنگ میں ہتھیار سنبھالنے کی استعداد رکھتے تھے۔

اسلام میں عورت کی میراث

اس دور میں جب کہ دنیا کے مختلف مذاہب اور ملتوں میں عورت کے ساتھ ناانصافی نے قانون کی حیثیت اختیار کر لی تھی، اسلام نے آ کر عورت کا میراث میں حصہ دینے کا ایک ایسا اعلان کیا، جو ساری دنیا کو چونکا دینے والا تھا، اس نے عورت کے ساتھ ہونے والی ناانصافی پر ان تمام لوگوں اور فرقوں کا رد کیا، جو عورت کو میراث میں حصہ نہیں دیتے تھے اور قرآن کریم میں یہ معجزانہ اعلان کیا گیا:

﴿ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ص وَلِلنِّسَآءِ

(۱) تفسیر الطبري:۷/۲۳،تفسیر ابن أبي حاتم:۳/۲۸۸،في ظلال القرآن:۱/۵۹۰

نَصِیْبٌ مِّمَّا تَرَکَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ اَوْ کَثُرَ ؕ نَصِیْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ (النساء: ۷)

(مردوں کا حصہ بھی ہے اس مال میں سے جو والدین اور قریبی رشتے دار چھوڑ جائیں اور عورتوں کا بھی حصہ ہے، اس مال میں سے جو والدین اور قریبی رشتے دار چھوڑ جائیں، کم ہو یا زیادہ بہ طور مقررہ حصے کے۔)

آیتِ کریمہ کا شانِ نزول

اس آیت کے نزول کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت اوس بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا اور انھوں نے ایک بیوی ام کجہ رضی اللہ عنہا اور تین لڑکیاں چھوڑیں؛ مگر مرحوم کے دو چچا زاد بھائی سوید اور عرفجہ نے مرحوم کا سارا مال اپنے قبضے میں کرلیا اور مرحوم کی بیوی اور لڑکیوں کو کچھ نہیں دیا؛ کیوں کہ وہاں کا رواج ہی یہ تھا کہ لڑکیوں اور بچوں کو وراثت میں حصہ نہیں دیتے تھے اور صرف لڑکوں کو میراث میں حصہ دیتے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ہم صرف اسے دیتے ہیں، جو قتال کرتا اور مال غنیمت لاتا ہو۔ مرحوم کی بیوی ام کجہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! میرے شوہر اوس بن ثابت رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی اور انھوں نے میرے ذمہ تین لڑکیاں چھوڑی ہیں اور ایک میں ان کی بیوی ہوں اور میرے پاس ان لڑکیوں پر خرچ کرنے کچھ نہیں ہے اور میرے شوہر نے بہت خوب مال چھوڑا ہے؛ مگر وہ سب سوید اور عرفجہ کے قبضے میں ہے؛ لیکن ان لوگوں نے نہ مجھے کچھ دیا اور نہ میری بچیوں کو کچھ دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں کو بلا کر پوچھا، تو انھوں نے وہی جواب دیا کہ ان کی اولاد نہ تو گھڑ سواری کر سکتی ہے اور دشمن کا

مقابلہ کرسکتی ہے۔اس پر قرآن کریم کی مذکورہ آیت نازل ہوئی۔ (۱)

آیتِ میراث کے نزول کا مقصد

اس آیتِ کریمہ کے نزول کا مقصد کیا ہے؟ علامہ ناصر السعدی رَحِمَہُ اللہُ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''کان العرب في الجاهلية من جبروتهم و قسوتهم لا يورثون الضعفاء ، كالنساء والصبيان ، و يجعلون الميراث للرجال الأقوياء ؛ لأنهم بزعمهم أهل الحرب والقتال والنهن والسلب ، فأراد الرب الرحيم الحكيم أن يشرع لعباده شرعاً يستوي فيه رجالهم ونساؤهم و أقوياؤهم و ضعفاؤهم .''(۲)

(عرب لوگ اپنی سختی اور تندی کی بنا پر کمزوروں جیسے عورتوں اور بچوں کو میراث میں حصہ نہیں دیتے تھے اور یہ لوگ میراث صرف طاقت ور مردوں کے لیے قرار دیتے تھے؛ کیوں کہ مرد جنگ اور لڑائی کرتے ہیں اور لوٹ گھسوٹ کرتے ہیں، پس رب رحیم وحکیم نے اس کا ایک نظام بندوں کے لیے مقرر کرنے کا ارادہ کیا، جس میں مرد وعورت اور قوی وضعیف سب برابر ہیں۔)

اور امام مروزی رَحِمَہُ اللہُ نے کہا کہ یونانی میراث کا سارا مال لڑکیوں کو دیتے تھے:

---

(۱) تفسیر الإمام البغوي:۲۷۸،ابن جرير اللباب في علم الكتاب:۶/۱۹۴،تفسير القرطبي:۵/۴۶

(۲) تفسير السعد ي:۲۶۵

کیوں کہ لڑکیاں کمائی نہیں کرسکتیں اور اس کے برخلاف عرب کا دستور یہ تھا کہ وہ صرف لڑکوں کو میراث دیتے تھے، لڑکیوں کو نہیں، اس آیت سے اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کا رد کیا ہے۔ (۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اس آیت کا مقصد ہی یہ ہے کہ عورتوں کے بارے میں مختلف قوانین و نظاموں میں پائی جانی والی ناانصافیوں اور مظالم کا سد باب کیا جائے اور اس افراط و تفریط کے مابین غلو سے پاک معتدل قانون لاگو کیا جائے، جس میں عورتوں کی حق تلفی اور ان سے ناانصافی بھی نہ ہو اور نہ خواہ مخواہ ان کی بے جا طرف داری کرتے ہوئے مردوں سے ناانصافی کی جائے؛ بل کہ دونوں کا حق دیا جائے۔

آیتِ میراث کے بعض فوائد تفسیری

آیتِ کریمہ میں قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں جس طرح مردوں کا حقِ وراثت بیان کیا گیا ہے، اسی طرح مستقلاً عورتوں کا بھی حقِ وراثت بیان کیا گیا ہے، حالاں کہ یہ بھی عین ممکن تھا کہ صرف ایک جملے سے اس حق کو بیان کیا جائے، مثلاً یہ کہا جا سکتا تھا کہ ﴿وَلِلنِّسَآءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَ الْاَقْرَبُوْنَ﴾ (النسآء: ۷) مگر ایسا کرنے کے بہ جائے اللہ تعالیٰ نے مردوں کا الگ ذکر کیا اور عورتوں کو الگ ذکر کیا، جب کہ اس میں عبارت کی تطویل بھی لازم آتی ہے۔ اس سے ایک جانب اس اہمیت کو جتانا مقصود ہے، جو اسلام نے عورتوں کے حقوق کے سلسلے میں لوگوں کے ذہنوں میں اتارنی چاہی ہے اور دوسری جانب اسلام سے ماقبل جو نظامہائے وراثت جاری تھے اور ان میں عورتوں کے حقوق سے روگردانی اور ان کی حق تلفی کو روا رکھا گیا تھا، اس کا رد کرنا بھی مقصود تھا۔

---

(۱) البحر المحيط : ۱۸۲/۳

دوسرے اس آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے جاہلی دور کے اس نظریے پر ضرب لگادی کہ وہ میراث کی بنیاد دشمن کے مقابلے کی صلاحیت اور جنگ کرنے اور مالِ غنیمت لانے کی قوت کو قرار دیتے تھے، پھر اسی باطل نظریے کے مطابق صرف لڑکوں کو میراث دیتے اور لڑکیوں کو محروم کردیتے تھے، اس آیت میں ﴿ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ﴾ کا اعجازی کلام لا کر یہ بتادیا کہ میراث کی بنیاد ''قریبی رشتے داری'' ہے؛ لہٰذا جہاں بھی یہ ''رشتے داری'' پائی جائے گی، وہاں تقسیمِ وراثت ہوگی، خواہ وہ لڑکی ہو یا لڑکا ہو، بڑا ہو یا چھوٹا ہو۔

تیسرے اس میں کہا گیا ہے: ﴿ نَصِيْبًا مَّفْرُوْضًا﴾ اس لفظ کے ذریعے یہ واضح کردیا گیا کہ میراث میں حصہ دینا مردوں کو ہو یا عورتوں کو، یہ اللہ کا ایک محکم قانون اور اللہ کی جانب سے بندوں پر فرض ہے، اس میں کسی کو اختیار نہیں کہ اپنی مرضی سے کسی کو دے اور کسی کو محروم کردے، جیسے بعض جاہل لوگ آج بھی ایسے ہیں، جو لڑکیوں کو دینے کے سلسلے میں اپنی مرضی کا استعمال کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ ہم چاہیں؛ تو ان کو دیں اور ہم نہ چاہیں؛ تو نہ دیں اور بہت سے مقامات پر بھائی لوگ اپنے ماں باپ کی املاک اور اشیا پر قابض ہوجاتے اور اپنی بہنوں کو دینے میں اپنے رحم وکرم کا ان کو محتاج سمجھتے ہیں؛ حالاں کہ یہ اللہ کا قانون اور اس کی جانب سے مقرر کردہ فرض ہے، کہ جس طرح میراث میں لڑکوں کا حصہ ہے، اسی طرح لڑکیوں کا بھی حصہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع عثمانی رحمہ اللہ نے ''معارف القرآن'' میں اسی لفظ کی تفسیر میں فرمایا:

''اس سے یہ بھی بتلادیا کہ مختلف وارثوں کے جو مختلف حصے قرآن نے

مقرر فرمائے ہیں، یہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ حصے ہیں، ان میں کسی کو اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی یا تغیر و تبدل کا کوئی حق نہیں اور اسی لفظ سے ایک اور مسئلہ بھی معلوم ہوا کہ وراثت کے ذریعے جو ملکیت وارثوں کی طرف منتقل ہوتی ہے، ملکیت جبری ہے، نہ اس میں وارث کا قبول کرنا شرط ہے، نہ اس کا اس پر راضی ہونا ضروری ہے؛ بل کہ اگر وہ زبان سے بہ صراحت یوں بھی کہے کہ میں اپنا حصہ نہیں لیتا، تب بھی وہ شرعاً اپنے حصے کا مالک ہو چکا ہے، یہ دوسری بات ہے کہ وہ مالک بن کر شرعی قاعدے کے مطابق کسی دوسرے کو ہبہ کر دے یا بیچ ڈالے یا تقسیم کر دے''۔ (۱)

میراث سے کسی کو محروم کرنے کا وبال

جب یہ معلوم ہو گیا کہ میراث حکم جبری ہے اور جب کوئی انتقال کرتا ہے، تو اس کا ترکہ اس کے وارثین میں اللہ کے قانون کے مطابق خود ہی ان کی ملکیت میں منتقل ہو جاتا ہے، تو اسی سے یہ واضح ہو گیا کہ کسی کو اس کے حق وراثت سے محروم کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کا مملوک مال اس سے چھینا گیا اور غصب کیا گیا ہے؛ اسی لیے اسلام نے کسی کو حق میراث سے محروم کرنے پر سخت وعیدیں سنائی ہیں۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں:

«سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم يَقُولُ : مَنْ ظَلَمَ مِنَ الأَرْضِ شَيْئًا فَإِنَّهَا تُطَوَّقُهُ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ» (۲)

---

(۱) معارف القرآن: ۲/۳۱۲

(۲) البخاري: ۲۲۷۲، أحمد: ۱۶۴۱، صحيح ابن حبان: ۵۱۶۳، مسند أبي يعلى: ۹۵۶، سنن البيهقي: ۱۱۳۱۱، تهذيب الآثار للطبري: ۱۵۳۰

(میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ جوشخص زمین میں سے کچھ بھی مار لے گا، تو اس کو سات زمینوں کا طوق گردن میں ڈالا جائے گا۔)

ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ ظَلَمَ قِيدَ شِبْرٍ مِنْ أَرْضٍ طُوِّقَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ مِنْ سَبْعِ أَرَضِينَ.» (۱)

(جوشخص کسی کی زمین میں سے ایک بالشت بھر بھی دبا لیتا ہے، تو اس کو سات زمینوں کا طوق پہنایا جائے گا۔)

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ أَخَذَ مِنَ الْأَرْضِ شَيْئًا بِغَيْرِ حَقِّهِ خُسِفَ بِهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ إِلَى سَبْعِ أَرَضِينَ .» (۲)

(جس نے کسی کی زمین میں سے بلا استحقاق کچھ بھی مار لیا، تو وہ قیامت کے دن سات زمینوں تک دھنسا دیا جائے گا۔)

ان احادیث میں کسی کی زمین دبا لینے یا غصب کر لینے پر جو سخت وعیدیں ہیں، یہ وراثت سے کسی کو محروم کر دینے کو بھی شامل ہیں؛ لہٰذا جو لوگ کسی کی میراث مار لیتے ہیں، ان کے لیے بھی یہ عذاب مقرر ہے، خواہ کسی عورت کا حق ماریں یا کسی مرد کا، بچے کا یا کسی بڑے کا، سب کا حکم یہی ہے۔

---

(۱) البخاري:۲۲۷۳، مسلم:۴۲۲۲، مسند أحمد : ۲۴۵۴۸، سنن البيهقي: ۲۲۳۱۴، مستخرج أبي عوانة:۴۴۹۳

(۲) البخاري:۲۲۷۴، شرح السنة:۲۱۶۶، أحمد:۵۷۴۰

میراث سے متعلق دوسری آیت

مذکورہ بالا آیتِ کریمہ سے مردوں کے ساتھ میراث کے سلسلے میں عورت کا حق ہونا ثابت ہوگیا اور دوسری آیات میں اس کی تفصیل بیان کی گئی ہے کہ کس کا کتنا حق ہے؟ ان میں سے ایک آیت یہ ہے:

﴿يُوصِيكُمُ اللّٰهُ فِيٓ اَوْلَادِكُمْ ۚ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۚ فَاِنْ كُنَّ نِسَآءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۚ وَ اِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً فَلَهَا النِّصْفُ ؕ﴾ (النساء: ۱۱)

(اللہ تعالیٰ تمھیں تمھاری اولاد کے بارے میں وصیت کرتا ہے کہ لڑکے کو دولڑکیوں کے برابر حصہ ہے اور اگر ایک سے دولڑکیوں سے زائد ہوں، تو انھیں چھوڑے ہوئے مال سے دو تہائی ہے اور اگر ایک ہی لڑکی ہو تو اسے کل مال کا نصف ملے گا۔)

اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں مختلف حیثیتوں کے افراد اور رشتے داروں کا حقِ میراث بتایا گیا ہے اور اس میں سے ایک یہ حکم بیان کیا گیا ہے کہ اگر مرنے والے کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں موجود ہوں، تو میراث میں لڑکوں کو لڑکیوں سے دوگنا ملے گا اور اگر لڑکا نہ ہو، صرف لڑکیاں ہو؛ تو اگر ایک ہی لڑکی ہے، تو اس کو کل مال کا نصف ملے گا اور اگر ایک سے زائد لڑکیاں ہوں؛ تو ان کو دو تہائی مال مشترک طور پر ملے گا۔

اس آیت کا شانِ نزول یہ ہے کہ حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کی غزوۂ احد میں شہادت ہوگئی، تو ان کی بیوی حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! یہ سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کی دو لڑکیاں ہیں، ان کے

باپ سعد کا غزوۂ احد میں آپ کے ساتھ انتقال ہو گیا اور ان کے چچا نے ان کا مال لے لیا ہے اور ان لڑکیوں کے لیے کچھ نہیں چھوڑا اور ان لڑکیوں کی شادی بغیر مال کے ہو نہیں سکتی؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اس کا فیصلہ کریں گے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے ان لڑکیوں کے چچا کو بلایا اور فرمایا کہ سعد رضی اللہ عنہ کی بیٹیوں کو دو تہائی دے دینا اور ان کی ماں کو آٹھواں حصہ دینا اور جو بچے وہ تمھارا ہوگا۔(۱)

میراث میں عورت کا حصہ

اب آیئے دیکھتے ہیں کہ اسلام نے عورت کا میراث میں حصہ کیا دیا ہے؟ مذکورہ بالا پہلی آیتِ کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے مردوں کے ساتھ بالتخصیص عورتوں کا بھی حق میراث بیان کرتے ہوئے اخیر میں اتنی بات فرمائی ہے کہ ﴿نَصِيبًا مَّفْرُوضًا﴾ (ان کے حصے مقرر ہیں)؛ مگر اس میں یہ نہیں بتایا کہ کس کا کتنا حصہ ہے؛ کیوں کہ مرد وعورت کے میراث پانے کی صورتیں مختلف ہیں اور اسی لحاظ سے ان کے حصے بھی مختلف ہیں اور ان حصوں کی تفصیل اس دوسری آیت اور دیگر آیات میں ذکر کی گئی ہے اور احادیثِ نبویہ میں ان کا بیان وشرح وارد ہوئی ہے۔ اس میں کہیں مرد کو دُگنا اور عورت کو ایک حصہ ملتا ہے اور کہیں دونوں کو برابر بھی ملتا ہے اور کہیں مرد کے مقابلے میں عورت کو زیادہ ملتا ہے۔

ہماری اس وضاحت سے یہ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ عام طور پر عورت کا حق میراث بتاتے ہوئے جو یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کا حق مرد کے مقابلے میں نصف (آدھا) ہے، یہ علی الاطلاق صحیح نہیں ہے؛ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ عورت کو مرد کے مقابلے میں ''آدھا حصہ'' ملنے کی بات صرف بعض صورتوں اور حالتوں میں ہے اور

---

(۱) الدر المنثور:۴/۲۵۴، ابن کثیر:۲/۲۲۵

اس کے علاوہ متعدد صورتیں اور حالتیں میراث کی وہ ہیں، جن میں کہیں عورت کو مرد کے برابر ملتا ہے اور کہیں مرد سے بھی دوگنا بھی ملتا ہے۔

مگر افسوس کہ بعض متعصب حلقوں یا دین و شریعت سے بے گانہ لوگوں کی جانب سے ان سب امور کو نظر انداز کرتے ہوئے ، یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ اسلام میں عورت کو مرد کے مقابلے میں آدھا ملتا ہے اور یہ عورت کے حق میں ناانصافی اور ظلم ہے اور اس سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس غلط فہمی یا غلط بیانی کو خود بہت سے مسلمان اس طرح قبول کر لیتے ہیں گویا کہ یہ واقعی اور حقیقی بات ہو؛ حالاں کہ یہ سراسر غلط ہے یا کسی غلط فہمی پر مبنی ہے۔

میراث کے حوالے سے مردو عورت کے احوال مختلف ہیں

لہٰذا ہم یہاں چاہتے ہیں کہ اس مسئلے کی وضاحت پیش کر دیں؛ تاکہ عمومی طور پر پھیلی ہوئی یہ غلطی یا غلط فہمی دور اور کافور ہو جائے۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ میراث کے حوالے سے مردوں اور عورتوں کے احوال مختلف ہوتے ہیں، مثلاً یہ کہ میراث کے حق داروں میں عورت کے ساتھ اسی درجے کا کوئی مرد اس کے ساتھ ہے یا نہیں ہے، جیسے بہن کے ساتھ بھائی بھی موجود ہو، تو ایک حال اور بھائی موجود نہ ہو، تو دوسرا حال؛ اسی طرح اس کے ساتھ اس کی کوئی بہن موجود ہو، تو یہ ایک حال اور اگر اس کی کوئی بہن موجود نہ ہو؛ تو یہ دوسرا حال؛ لہٰذا مختلف حالات کے لحاظ سے عورت کو میراث میں الگ الگ انداز سے حصہ ملتا ہے۔

جب ہم میراث کے احکام و مسائل پر نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے بعض مواقع پر عورت کو مرد کے لحاظ سے آدھا حصہ دیا ہے اور ایسا چار مواقع پر ہوا ہے اور بعض صورتوں میں عورت کو مرد کے برابر حصہ ملتا ہے اور ایسی

صورتیں بھی متعدد ہیں اور بعض مواقع پر عورت کو مرد سے زیادہ ملتا ہے اور ایسے دس مواقع ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ بعض صورتوں میں مرد کو کچھ بھی نہیں ملتا، جب کہ اسی کے درجے کی عورت کو حصہ ملتا ہے۔ یہاں بہ طور نمونہ از خروارے چند ایک صورتوں کا ذکر کرکے اس اجمال کی توضیح کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

(الف) مرد کے مقابلے میں صرف چار صورتوں میں عورت کو آدھا ملتا ہے:

مرد کے مقابلے میں عورت کو آدھا صرف چار صورتوں میں ملتا ہے، جس کی تفصیل یہ ہے:

(۱) جب کسی کا انتقال ہوا اور اس کی اولاد میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں ہوں، اس صورت میں مرنے والے کی میراث سے لڑکی کو ایک حصہ تو لڑکے کو دو حصے ملتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن نے فرمایا:

﴿ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾ (لڑکے کو دو لڑکیوں کے برابر حصہ ہے۔)

(۲) جب کسی کا انتقال ہوا اور اس کے وارثین میں ماں اور باپ ہوں اور نہ اولاد ہو نہ بیوی یا شوہر، تو اس صورت میں باپ کو دو تہائی اور ماں کو ایک تہائی ملتا ہے۔

مثلاً زید کا انتقال ہوا اور وارثین میں ماں اور باپ ہیں، کوئی اولاد نہیں ہے اور نہ بیوی ہے، اسی طرح مثلاً خالدہ کا انتقال ہوا اور اس نے ماں، باپ چھوڑے؛ مگر نہ اولاد ہے اور نہ شوہر ہے۔ اس میں ماں کو ایک تہائی ملتا ہے اور باپ کو دو تہائی ملتا ہے۔

(۳) جب کوئی اپنے ورثہ میں صرف بھائی اور بہن چھوڑ جائے، تو اس صورت میں بھائی کو دو حصے اور بہن کو ایک حصہ ملتا ہے۔

﴿وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ﴾ (النساء: ۱۷۶)

(۴) جب کسی کی بیوی کا انتقال ہوا اور وہ شوہر چھوڑ کر مرے اور بچے نہ ہوں، تو

شوہر کو بیوی کے مال میں سے نصف ملے گا اور شوہر کے ساتھ بچے بھی چھوڑ جائے، تو اس صورت میں شوہر کو بیوی کے مال میں سے چوتھائی ملے گا۔

جب کہ اس کے بر خلاف شوہر مرے اور بیوی چھوڑ جائے ، بچے نہ ہوں؛ تو بیوی کو چوتھائی اور اگر بچے بھی ہوں؛ تو بیوی کو آٹھواں حصہ ملتا ہے۔

(ب) وہ مواقع جن میں عورت کو مرد کے برابر حصہ ملتا ہے:

اور وہ مواقع، جن میں عورت کو مرد کے برابر حصہ ملتا ہے، وہ یہ ہیں:

(۱) جب کسی کا انتقال ہو اور وہ اپنے پیچھے ایک لڑکا اور ماں باپ چھوڑ جائے۔ اس صورت میں ماں اور باپ دونوں کو مرحوم بیٹے یا بیٹی کی میراث سے چھٹا چھٹا حصہ ملتا ہے اور بقیہ مال مرحوم کے بیٹے کو ملتا ہے۔ اس صورت میں غور کیجیے کہ ماں اور باپ دونوں کو برابر حصہ مل رہا ہے اور یہ کہنے کی کیا ضرورت ہے کہ ان میں سے ایک عورت ہے اور دوسرا مرد ہے۔

(۲) جب کوئی انتقال کر جائے اور ماں، باپ اور دو بیٹیاں چھوڑ جائے۔ اس صورت میں دو بیٹیوں کو اپنے مرحوم باپ کی میراث سے دو تہائی (۲/۳) اور ماں کو چھٹا حصہ ملے گا اور باقی چھٹا باپ کو عصبہ ہونے کی وجہ سے ملے گا۔

یہاں بھی ماں کو جس قدر ملا، باپ کو بھی اسی قدر ملا، جب کہ سب جانتے ہیں کہ ماں عورت ہے اور باپ مرد ہے۔

(۳) ایک شخص کا انتقال ہوا اور اس نے ایک بیٹا، باپ اور نانی چھوڑی۔ اس صورت میں باپ کو چھٹا اور نانی کو چھٹا حصہ دیا جائے گا، جب کہ بیٹے کو مابقیہ دو تہائی ملے گا۔

یہاں بھی باپ کو جتنا مل رہا ہے، اتنا ہی نانی کو مل رہا ہے، حالاں کہ نانی رشتے میں باپ سے دور کی ہے، پھر بھی عورت ہوتے ہوئے اسی قدر پا رہی ہے، جس قدر

کہ مرحوم کا باپ مرد ہونے کے باوجود پا رہا ہے۔

(۴) اسی طرح ان تمام صورتوں میں مرد وعورت کو برابر حصہ ہے، جب کہ وہ وارث میت کے ماں شریک بھائی بہن ہوں۔

چناں چہ فرض کرو کہ ایک عورت کا انتقال ہوا اور اس نے وارثین میں شوہر، ماں اور ایک ماں شریک بھائی چھوڑا، تو اس صورت میں شوہر کو نصف، ماں کو تہائی اور ماں شریک بھائی کو چھٹا حصہ ملتا ہے اور اگر مرنے والی عورت ہو اور اس نے شوہر، ماں اور ماں شریک بہن چھوڑا، تو یہاں بھی شوہر کو نصف، ماں کو تہائی اور اس بہن کو چھٹا حصہ ملے گا۔ غور کیجیے کہ یہاں ماں شریک بھائی کو بھی چھٹا حصہ ملا اور ماں شریک بہن کو بھی اسی قدر ملے گا۔ یعنی بھائی بہن دونوں کو برابر حصہ ملے گا۔

(۵) اسی طرح اگر میت کے ماں اور شوہر اور ماں شریک بھائی و بہن دونوں وارث ہوں، تو یہاں بھی یہ بھائی و بہن دونوں ثلث (تہائی) میں برابر کے حق دار ہوں گے؛ لہٰذا اس صورت میں ماں کو چھٹا، شوہر کو نصف اور باقی ثلث میں ماں شریک بھائی و بہن برابر کا حصہ پائیں گے۔

(۶) جب کسی عورت کا انتقال ہوا اور اس کے وارثین میں شوہر اور حقیقی بھائی ہو، تو شوہر کو نصف اور باقی سب (نصف) بھائی کو ملے گا، اسی طرح اگر حقیقی بھائی کے بہ جائے حقیقی بہن ہو تو اس کو بھی اس صورت میں نصف ملے گا۔

(ج) جن صورتوں میں عورت کو مرد سے زیادہ ملتا ہے:

(۱) کسی عورت کے وارثین میں ماں، باپ، شوہر اور دو بیٹیاں ہوں تو شوہر کو چوتھائی اور ماں کو چھٹا اور باپ کو چھٹا ملے گا اور دو لڑکیوں کو دو ثلث (۲/۳) ملے گا، اس لحاظ سے کل ترکے کے ساٹھ حصے ہوں گے، پھر اس مسئلے میں عول ہونے کی وجہ

سے تقسیم اس طرح ہوگی کہ ان میں سے شوہر کو چوتھائی (بارہ حصے) باپ کو (آٹھ حصے) ماں کو بھی (آٹھ حصے) دو بیٹیوں کو دو ثلث (بتیس حصے) یعنی ہر لڑکی کو سولہ سولہ حصے دیے جائیں گے۔

مذکورہ مثال میں بتایا گیا کہ صورت مذکورہ میں دو لڑکیوں میں سے ہر ایک کو سولہ (۱۶) حصے ملیں گے؛ لیکن اگر اسی صورت میں دو لڑکیوں کی جگہ دو لڑکے ہوں، تو اب تقسیم اس طرح ہوگی کہ کل ترکہ ساٹھ حصوں کا ہوگا، اس میں سے شوہر کو پندرہ حصے، باپ کو دس، ماں کو دس، اور ہر ایک بیٹے کو ساڑھے بارہ، ساڑھے بارہ ملیں گے۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام نے اس صورت میں لڑکوں کا حصہ کم اور لڑکیوں کا حصہ زیادہ رکھا ہے۔

(۲) اس سلسلے کی ایک اور مثال لیجیے کہ اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اور اس کے وارثین میں شوہر، ماں، باپ اور ایک بیٹی ہو، تو اس میں کل ترکے کے لیے ایک سو چھپن (۱۵۶) حصے کیے جائیں گے اور یہاں بھی مسئلے میں عول ہے؛ اس لیے تقسیم اس طرح ہوگی کہ شوہر کو چھتیس (۳۶) حصے، باپ کو چوبیس (۲۴) اور ماں کو چوبیس (۲۴) حصے اور لڑکی کو بہتر (۷۲) حصے دیے جائیں گے؛ لیکن اگر اسی صورت میں لڑکی کی جگہ لڑکا ہو، تو پھر تقسیم کی صورت یہ ہوگی کہ شوہر کو ۳۹/ حصے، باپ کو ۲۶ اور ماں کو ۲۶/ حصے اور لڑکے کو ۶۵/ حصے ملیں گے۔

صرف لڑکی تھی تو اس کو ۷۲/ حصے اور صرف ایک لڑکا ہے، تو اس کو لڑکی سے کم صرف ۶۵/ حصے ملیں گے۔

(د) وہ صورتیں جن میں عورت کو حصہ ہے؛ مگر مرد کو کچھ بھی نہیں:

ایک عورت کا انتقال ہوا، اس کے وارثین میں شوہر، ماں، باپ، بیٹی اور پوتی

ہیں: اس صورت میں تقسیم اس طرح ہوگی کہ مرحومہ کے کل مال کو ۱۹۵/ حصوں میں کر کے، ان میں سے شوہر کو ۳۹، باپ کو ۲۶/ حصے، ماں کو ۲۶/ حصے اور بیٹی کو ۷۸/ حصے اور پوتی کو ۲۶/ حصے دیے جائیں گے؛ لیکن اسی میں اگر پوتی کی جگہ پوتا ہو، تو تقسیم اس طرح ہوگی کہ شوہر کو ۴۵/ حصے، باپ کو ۳۰/ حصے، ماں کو ۳۰/ حصے، بیٹی کو ۹۰/ حصے اور پوتے کو کچھ بھی نہیں؛ کیوں کہ یہ عصبہ ہے، جو بچا ہوا لیتا ہے اور یہاں کچھ نہیں بچا؛ لہٰذا کچھ نہ ملے گا۔

میراث کی بعض صورتوں میں عورت کا حصہ مرد سے کم کیوں ہے؟

اب ہم اس سوال کے جواب کی جانب متوجہ ہوتے ہیں، جو عام طور پر اٹھایا جاتا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر اسلام کو عورتوں کے حق میں ظالم ٹھہرانے کی ناپاک کوشش کی جاتی ہے۔ چناں چہ یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں عورتوں کے ساتھ ناانصافی کی گئی ہے؛ کیوں کہ میراث کی تقسیم میں لڑکے کو دو حصے دیے جاتے ہیں، تو لڑکی کو ایک حصہ دیا جاتا ہے۔

ہم نے اوپر یہ واضح کر دیا ہے کہ عورتوں کے لیے ایک حصہ اور اس کے مقابلے میں مرد کے لیے دو حصے دینے کا قانون تمام احوال اور صورتوں میں نہیں ہے؛ بل کہ بعض صورتوں میں ہے، جس کی تفصیل گزر گئی؛ لہٰذا جو لوگ اس کو علی الاطلاق بیان کرتے ہیں، وہ لوگوں کو گم راہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اسلام کے خلاف ذہن تیار کرنے کی سازش کے مرتکب ہیں، یا یہ کہ خود ہی کسی غلط فہمی یا لاعلمی کا شکار ہیں۔

اب رہا کہ سوال کہ بعض صورتوں میں اسلام نے عورت کو مرد کے مقابلے میں کم کیوں دیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ جن صورتوں میں اسلام نے عورت کو ایک حصہ اور مرد کو دو حصے دیے ہیں، وہ بھی عین حکمت و مصلحت اور عین عدل و انصاف پر مبنی ہے،

چناں چہ امام نووی رَحِمَهُ اللهُ لکھتے ہیں:

”وَحِكْمَته أَنَّ الرِّجَال تَلْحَقهُمْ مُؤَن كَثِيرَة بِالْقِيَامِ بِالْعِيَالِ وَالضِّيفَان ، وَالْأَرِقَّاء وَ الْقَاصِدِينَ ، وَ مُوَاسَاة السَّائِلِينَ وَ تَحَمُّل الْغَرَامَات وَ غَيْر ذَلِكَ “(۱)

(اس کی حکمت یہ ہے کہ مردوں پر اہل وعیال اور مہمان، غلام اور آنے جانے والوں کی ذمے داریاں اٹھانے اور مانگنے والوں کی دل جوئی اور بعض تاوان وغیرہ کا بوجھ اٹھانے کی ذمے داریوں کی وجہ سے بہت سے اخراجات آپڑتے ہیں۔)

اور علامہ ابن القیم رَحِمَهُ اللهُ نے ”إعلام الموقعین“ میں لکھا ہے:

”وأما الميراث فحكمة التفضيل فيه ظاهرة فإن الذكر أحوج إلى المال من الأنثى لأن الرجال قوامون على النساء والذكر أنفع للميت في حياته من الأنثى .“(۲)

(رہی میراث، تو اس میں مردوں کو دگنا دینے کی حکمت ظاہر ہے؛ کیوں کہ مرد مال کا زیادہ محتاج ہے؛ کیوں کہ وہی عورتوں پر نگراں ہے اور اس لیے بھی کہ مرد اولاد باپ کے حق میں دنیوی زندگی میں لڑکی سے زیادہ فائدہ مند ہوتا ہے۔)

اس اجمالی جواب کے بعد ہم اس کا تفصیلی جواب دینا چاہتے ہیں؛ لہٰذا عرض ہے کہ مرد کو عورت پر بعض صورتوں میں ترجیح دینے کی متعدد وجوہات ہیں:

(۱) ایک یہ کہ اسلام نے لڑکی کا نفقہ وخرچہ خود اس کے ذمے نہیں لگایا؛ بل کہ

---

(۱) شرح مسلم للنووي

(۲) إعلام الموقعين :۲/۱۶۹

پیدائش سے لے کر شادی کرنے تک اس کے کل اخراجات کی ذمے داری اس کے باپ پر ڈالی گئی اور شادی ہو جانے کے بعد اس کے شوہر پر اس کے تمام اخراجات کا بار ڈالا گیا اور شوہر کے انتقال کے بعد خود اس کے اپنے بچوں پر ماں ہونے کی حیثیت سے اس کے اخراجات کی ذمے داری عائد کی گئی۔

اس کے برخلاف لڑکا باپ کی ذمے داری میں بلوغ تک یا اور کچھ زمانے تک رہتا ہے؛ مگر اس کے بعد اسے خود اپنے اخراجات اٹھانے پڑتے ہیں؛ لہٰذا خود کمانا، جمع کرنا اور اپنے اخراجات کو برداشت کرنا اس کی اپنی ذمے داری میں آجاتے ہیں۔

(۲) دوسرے یہ کہ عورت پر کسی بھی مرحلے میں اپنے ماں باپ کا نان نفقہ عائد نہیں کیا گیا، خواہ کتنی بھی مال دار کیوں نہ ہو؛ لیکن اس کے برخلاف مرد پر یہ عائد کیا گیا کہ وہ جب خود کفیل بن جائے، تو اپنے ماں باپ کی بھی ذمے داری اٹھائے؛ لہٰذا مرد پر اپنی ذاتی ذمے داریوں کے ساتھ ساتھ اپنے والدین کے اخراجات بھی آجاتے ہیں۔

(۳) تیسرے یہ کہ عورت پر کسی بھی مرحلے میں اپنے بھائی بہنوں یا رشتے داروں میں سے کسی کا کوئی خرچہ چلانا واجب نہیں، اس کے برخلاف مرد پر جہاں خود اپنی ذمے داری عائد ہوتی ہے، وہیں اس کے چھوٹے بھائی بہنوں کی بھی ذمے داری آتی ہے، اسی طرح اس کے قریبی رشتے داروں کی ذمے داری بھی عائد ہوتی ہے۔

(۴) چوتھے یہ کہ جب عورت کی شادی ہوتی ہے، تو اس میں بھی اس پر کوئی مالی بوجھ نہیں آتا، نہ شادی کرنے کے سلسلے کا، نہ اس کے بعد کے اخراجات کا؛ بل کہ شادی کے اخراجات باپ یا بھائی وغیرہ برداشت کرتے ہیں اور شادی کے بعد اس کا ہونے والا شوہر اس کا مہر بھی ادا کرتا ہے اور اس کے نان نفقے اور رہائش وغیرہ کی ساری ذمے داری بھی اسی پر عائد ہوتی ہے؛ لیکن جب مرد شادی کرتا ہے، تو بسا

اوقات شادی کے بھی تمام اخراجات خود اس کو اٹھانے پڑتے ہیں اور شادی کے ساتھ آنے والے بیوی کا مہر اور نان ونفقہ بھی لڑکے کو ادا کرنا پڑتا ہے۔

(۵) پانچویں یہ کہ عورت اگر شادی کے بعد صاحبِ اولاد ہوئی، تو ان بچوں کے کھانے پینے اور رہائش وغیرہ امور کے متعلق اخراجات اور ان کی تعلیم وتربیت کے سلسلے کی مالی ذمے داریوں میں سے کوئی بھی عورت پر عائد نہیں ہوتی، ہاں عورت کے ذمے اپنے بچوں کی تربیت وتعلیم کے بارے میں غیر مالی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، اس کے برخلاف مرد کے ذمے اپنی اولاد کی تمام تر ضروریات کی کفالت ہوتی ہے، خواہ وہ نان ونفقے کا مسئلہ ہو یا رہائش ومکان کا مسئلہ ہو یا تعلیم وتربیت کی بات ہو، دوا دارو کا مسئلہ ہو یا دیگر ضروریات کا، سب کی ذمے داری مرد پر آتی ہے۔

یہ پانچ باتیں بہ طور مثال غور وفکر کے لیے دی گئی ہیں، ان میں غور کیجیے، تو معلوم ہوگا کہ اسلام نے عورت کے اوپر شروع سے لے کر اخیر تک کوئی مالی ذمے داری نہیں ڈالی ہے، نہ خود اس کی اپنی ضروریات کے حوالے سے، نہ اس کے ماں، باپ یا بھائی بہن کے حوالے سے، نہ اپنی اولاد کے حوالے سے؛ بل کہ ان سارے امور میں مرد ہی ذمے دار ہوا کرتا ہے اور ان میں مالی ذمے داری اسی پر عائد ہوتی ہے۔

ایک عمدہ مثال

یہاں ایک مثال کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا، جسے علامہ محمد علی الصابونی (سابق استاذ جامعہ ام القری، مکۃ المکرّمہ) نے وضاحت کی خاطر پیش کی ہے، وہ یہ کہ فرض کرو کہ ایک باپ کا انتقال ہوا اور اس کے وارثین میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی اور اس نے تین ہزار ریال ترکہ میں چھوڑے۔

اس صورت میں شریعت کے مطابق لڑکے کو باپ کے مال میں سے دو حصے

(یعنی تین ہزار ریال میں سے ۲۰۰۰/ ہزار ریال) ملیں گے اور لڑکی کو ایک حصہ (یعنی تین ہزار میں سے ایک ہزار ریال) ملیں گے۔ اس طرح یہ کل تین ہزار ریال کو تقسیم کر دیا جائے گا۔

اب فرض کرو کہ ان دونوں کی شادی طے ہوگئی اور لڑکے نے شادی کی اور بیوی کا مہر دو ہزار ریال طے ہوا، تو اس کو باپ کی میراث سے جو کچھ ملا تھا، وہ سب کا سب خرچ ہوگیا اور اس کے علاوہ اس پر بیوی کے نان ونفقہ اور رہائش وغیرہ کی ذمے داری بھی آ گئی۔

اسی طرح لڑکی کی شادی ہوئی، تو اس کا مہر فرض کرو کہ دو ہزار ریال طے ہوا اور اس کے شوہر نے اس کو دو ہزار ریال دیے، تو اس کے پاس پہلے سے باپ کی میراث سے ملے ہوئے ایک ہزار ریال تھے اور اب دو ہزار مہر میں ملے، تو کل تین ہزار ریال اس لڑکی کے پاس جمع ہوگئے؛ مگر اس کو ان میں سے کچھ خرچ کرنے کی کوئی ذمے داری نہیں۔

اس طرح لڑکا دو ہزار ریال میراث میں پایا؛ مگر اس کے اوپر اس سے زیادہ اخراجات آتے رہے اور کچھ نہ بچا اور لڑکی کو میراث میں صرف ایک ہزار ریال ملے؛ مگر اس پر خرچ کی کوئی ذمے داری نہیں؛ بل کہ مزید مہر کی رقم جمع ہوگئی اور ایک ہزار کے تین ہزار ریال ہوگئے۔

بتائیے کہ کیا شریعت کی تقسیم عقل وانصاف کے خلاف ہے یا عقل وانصاف کی منطق کے عین مطابق ہے؟ غور وفکر کرنے اور انصاف کا مفہوم سمجھنے والے یہی کہیں گے کہ بلاشبہ یہ منطق عقل کے بالکل مطابق ہے۔ (۱)

عورت کا حق میراث اس کے نفقے سے مربوط ہے

جب یہ واضح ہوگیا کہ عورت کو بعض صورتوں میں مرد کے مقابلے میں کم جو ملتا

---

(۱) المواريث الإسلامية : ۲۲

ہے، وہ بھی منطق عقل و انصاف کے خلاف نہیں ہے؛ بل کہ عین عدل و انصاف ہے، تو اب ہم آپ کی عنانِ توجہ ایک اہم بحث کی جانب موڑنا چاہتے ہیں، جس سے اللہ کے اس قانون کی دقت و گہرائی سمجھ میں آئے گی۔

بات یہ ہے کہ عورت کا حق میراث دراصل اس کے اوپر ہونے والی خرچ سے مربوط ایک نظام ہے، کہ جہاں اس کو کسی بھی جانب سے نفقہ اور خرچے کے ملنے کی راہ و سبیل موجود ہے، وہاں اس کو حصہ کم دیا گیا ہے اور جہاں ایسی کوئی سبیل نہیں ہے، وہاں اس کو زیادہ دیا گیا ہے۔ یہ ایک نہایت گہری اور دقیق حکمت ربانی ہے۔

اس کی توضیح کے لیے ہم یہاں چند مثالیں پیش کریں گے:

(۱) فرض کیجیے کہ ایک شخص کا انتقال ہوا اور اس نے اپنے وارث کے طور پر صرف ایک لڑکی چھوڑی، اس کے علاوہ اس کا کوئی اور وارث نہیں ہے، تو باپ کا پورا ترکہ اس لڑکی کو مل جائے گا اور وہ اس طرح کہ آدھا ترکہ اپنے فرض حصے کے طور پر اور باقی آدھا براہ رد؛ لہٰذا وہ پورے ہی ترکے کی حق دار ہو جائے گی۔ اسی طرح اگر لڑکی کے بہ جائے وارث صرف ایک لڑکا ہو، تو وہ بھی پورا ترکہ پالے گا، اس طرح کہ کسی اور وارث کے نہ ہونے کی صورت میں یہ عصبہ ہونے کی بنا پر سارا ترکہ پا جائے گا۔

اس مثال میں لڑکی اور لڑکے دونوں کو یکساں طور پر میراث مل رہی ہے، کیوں کہ یہاں اس لڑکی کا نفقہ و خرچہ چلانے والا کوئی خاندانی شخص موجود نہیں ہے؛ کیوں کہ باپ تو انتقال کر گیا اور بھائی یا چچا وغیرہ کوئی نہیں ہیں؛ لہٰذا اس صورت میں حکمتِ ربانی کا تقاضا ہوا کہ اس کو اتنا دیا جائے، جتنا لڑکے کو دیا جاتا ہے۔

پھر اگر یہ لڑکی شادی شدہ ہو یا بعد میں شادی کر لے، تو اس کو شوہر کی جانب سے نان نفقہ اور ساری ضرورتیں بھی فراہم ہو جاتی ہیں اور وہ لڑکے سے زیادہ نفع میں رہتی

ہے؛ کیوں کہ لڑکا اگر شادی کرے، تو وہ اپنی بیوی کے کل اخراجات پورے کرتا ہے، اس طرح اس پر مالی ذمے داری آ کر اس کا مال کم ہو جاتا ہے۔

(۲) ایک اور مثال لیجیے کہ اگر مرنے والے کے وارثین میں ایک بیٹی اور اس کا باپ موجود ہو، تو وراثت کی تقسیم اس طرح ہوگی کہ آدھا ترکہ بیٹی کو ملے گا؛ کیوں کہ ایک ہی بیٹی ہونے کی صورت میں اس کا مقررہ حصہ آدھا ہے اور باپ کو بھی آدھا ملے گا؛ کیوں کہ اس صورت میں اس کا مقررہ حصہ سدس (چھٹا) ہے اور چوں کہ وہ عصبہ ہے؛ اس لیے باقی بچا ہوا بھی اسی کو مل جائے گا، اس طرح آدھا اس کا ہو جائے گا۔

اور اگر اسی مثال میں فرض کیجیے کہ مرنے والے کے باپ کی جگہ دادی موجود ہو، تو بیٹی کو بہ طور فرض آدھا اور دادی کو سدس (چھٹا) ملے گا اور جو باقی ہے، وہ بھی بیٹی کو براہ رد مل جائے گا، اس طرح بیٹی کو یہاں آدھے سے زائد ملے گا اور کل مال کے یہاں تین حصے بنا کر دو بیٹی کو اور ایک دادی کو دیا جائے گا۔

اس تشریعِ ربانی میں غور کیجیے کہ مرنے والے کا باپ بھی بیٹی کے ساتھ اگر موجود ہو، تو بیٹی کو باپ کے ترکے سے صرف آدھا حصہ ملا اور اگر مرنے والے کے باپ کی جگہ دادی ہو، تو بیٹی کا حصہ آدھے سے بڑھ گیا، کیوں؟ یہاں بھی وہی نان و نفقے کی حکمت کارفرما ہے؛ کیوں کہ باپ جو کہ بیٹی کا دادا ہے، وہ اگر موجود ہے، تو ضرورت کے وقت پوتی کی کفالت اس کی ذمے داری ہوتی ہے؛ لہٰذا بیٹی کو صرف آدھا دیا گیا، اس کے برعکس مرنے والے کی دادی ہو موجود ہو، تو چوں کہ دادی کی ذمے داری نہیں کہ وہ اپنے پوتوں کا نان و نفقہ برداشت کرے؛ لہٰذا اس صورت میں بیٹی کا حق بڑھا دیا گیا۔

(۳) ماں باپ کا حصہ میراث میں بعض صورتوں میں برابر برابر ہوتا ہے اور بعض مواقع پر ماں کو باپ کا نصف ملتا ہے۔

مثلاً کسی کے وارثین میں صرف ماں اور باپ موجود ہوں، تو مرحوم کے ترکے سے ماں کو تہائی ملتا ہے اور باپ کو بقیہ دو تہائی بہ حیثیتِ عصبہ ہونے کے ملتا ہے، یعنی ماں کو ایک حصہ تو باپ کو دو حصے ملتے ہیں۔

یہاں مثال میں ماں اور باپ کے حصوں میں فرق ہے کہ باپ کو دو تہائی، تو ماں کو ایک تہائی، یہ کیوں؟ اس لیے کہ یہاں ماں کی ذمے داری اٹھانے والا باپ موجود ہے؛ لہٰذا باپ کو دوگنا دیا گیا اور ماں جس کو باپ کی کفالت حاصل ہے، اس کو ایک تہائی دیا گیا۔

(۴) ایک اور مثال ملاحظہ کیجیے کہ اگر کسی مرنے والے نے ماں اور ایک سگا بھائی چھوڑا ہو، تو ماں کو تہائی اور باقی سارا مال بھائی کو مل جائے گا اور اگر ایک بھائی کے بہ جائے دو یا زیادہ بھائی ہوں، تو ماں کو سدس (چھٹا) اور باقی سب بھائیوں کو ملے گا۔

مرحوم کے ایک بھائی ہونے کی صورت میں ماں کو تہائی مل رہا ہے، جب کہ دو یا زیادہ بھائی ہوں، تو ماں کو گھٹ کر صرف سدس یعنی چھٹا مل رہا ہے، ایسا کیوں؟ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ مرحوم کے بھائی، جو کہ اس کی ماں کے بیٹے ہیں، موجود ہیں، تو ان پر ماں کا نان نفقہ عائد ہے؛ ایک بھائی ہو، تو ساری ذمے داری اس ایک پر آتی ہے اور اگر کئی بھائی ہوں، تو ان سب پر ذمے داری تقسیم ہو جاتی ہے، لہٰذا ایک بھائی ہونے کی صورت میں ماں کو زیادہ دیا گیا؛ تاکہ بھائی پر زیادہ بوجھ نہ پڑے اور جب متعدد بھائی ہوں تو ماں کو کم کر دیا اور سارا بھائیوں کو دیا؛ تاکہ یہ سب مل کر ماں کا نان نفقہ برداشت کریں۔

(۵) اس سلسلے کی چند اور مثالوں پر غور کیجیے:

(الف) اگر کسی شخص نے اپنے وارثین میں باپ اور بہن کو چھوڑا، تو سارا مال باپ کو ملتا ہے اور بہن محروم ہوتی ہے؛ کیوں کہ اس مرحوم کی یہ بہن جو کہ باپ کی بیٹی

لگتی ہے، اس کا سارا نان ونفقہ باپ چلاتا ہے؛ لہٰذا اس کو یہاں محروم کر دیا گیا۔

(ب) اگر کسی نے وارثین میں بھائی بہن چھوڑے ہیں، تو بھائی کو دو گنا اور بہن کو اس کا نصف یعنی ایک حصہ ملے گا، جیسا کہ بیٹی کے مسئلے میں ہے؛ کیوں؟ اس وجہ سے کہ بھائی اپنی بہن کا ایک درجے میں ذمے دار ہوتا ہے اور اس کا نان ونفقہ بھائی پر عائد ہوتا ہے؛ لہٰذا یہاں بہن کا حصہ اس وجہ سے کم کر دیا کہ ایک درجے میں اس کی کفالت کے لیے بھائی موجود ہے۔

(ج) اگر کسی عورت کا انتقال ہوا اور اس نے اپنے وارثین میں شوہر اور ایک بہن چھوڑی ہو، تو شوہر کو کل مال کا آدھا اور بہن کو باقی آدھا ملے گا؛ کیوں؟ اس لیے کہ یہاں اس بہن کا کوئی کفیل نہیں ہے؛ لہٰذا اس کا حصہ بڑھا دیا گیا؛ تاکہ وہ خود کفیل ہو سکے۔

یہ چند مثالیں ہیں، جن سے یہ سمجھنا آسان ہے کہ اسلام کا یہ ''نظام وراثت'' کوئی الل ٹپ وضع نہیں ہو گیا ہے؛ بل کہ اس میں انتہائی گہرائی اور باریک بینی کا لحاظ رکھا گیا ہے اور یہ کہ یہ پورا نظام نہایت معقول بھی ہے اور کامل عدل پر مبنی بھی۔

میراث کے مقررہ حصے زیادہ تر عورتوں کے لیے ہیں

یہاں ایک اور خاص بات کی جانب توجہ دلانا چاہتا ہوں: وہ یہ کہ اسلام نے میراث کی تقسیم میں بعض لوگوں کا حصہ متعین ومقرر کر دیا ہے، کہ فلاں کو اتنا ملے گا اور فلاں کو اتنا اور ایسے لوگوں کو ''اصحاب الفروض'' کہا جاتا ہے اور بعض کا حصہ متعین ومقرر نہیں کیا گیا؛ بل کہ یہ کہہ دیا گیا کہ ان کو بہ طور تعصیب (عصبہ ہونے کی بنا پر) بقیہ مال مل جائے گا، ان کو ''عصبات'' کہا جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہونا چاہیے کہ تعصیب کی بنا پر بقیہ مال اُس وقت ملتا ہے، جب کہ فرض کردہ حصہ پانے والے اپنا حصہ پانے کے بعد کچھ مال اگر باقی ہو اور اگر جن کا حصہ متعین ہے، ان کو فرض دینے

کے بعد کچھ نہ بچا، تو عصبہ کو کچھ نہیں ملے گا۔

اب یہاں یہ بات سمجھیں کہ میراث میں بیش تر مقررہ حصے عورتوں کو دیے گئے ہیں اور اس میں مردوں کا حصہ کم ہے اور عصبہ ہونے کی بنا پر بچا ہوا مال لینے کے لیے اکثر مردوں کو مقرر کردیا گیا ہے۔ چناں چہ قرآن وسنت میں جو حصے مقرر ہیں، ان کو ملاحظہ کیجیے اور ساتھ ساتھ یہ بھی دیکھتے جایے کہ یہ حصے پانے والے مرد کتنے ہیں اور عورتیں کتنی؟ تو یہ بات سمجھ میں آجائے گی۔

قرآن وسنت میں مقرر حصے یہ ہیں:

(الف) ثلثان یعنی دو تہائی۔ یہ چار لوگوں کو ملتا ہے: (۱) دو یا زیادہ بیٹیاں (۳) دو یا زیادہ پوتیاں (۳) دو یا زیادہ سگی بہنیں (۴) دو یا زیادہ باپ شریک بہنیں۔

اس فرض میں صرف عورتوں کا حصہ ہے، اس میں مرد کا کوئی حصہ نہیں؛ لہٰذا چار کی چار عورتیں ہیں جو اس فرض کو پانے والی ہیں۔

(ب) نصف یعنی آدھا یہ پانچ لوگوں کو ملتا ہے:

(۱) ایک بیٹی (۲) ایک پوتی (۳) ایک سگی بہن (۴) ایک باپ شریک بہن (۵) شوہر۔

اس فرض میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ کل پانچ لوگوں کو ملتا ہے؛ مگر ان پانچ میں مرد صرف ایک ہے اور وہ شوہر ہے، باقی چار عورتیں ہیں۔

(ج) ثلث یعنی ایک تہائی یہ تین لوگوں کو دیا جاتا ہے:

(۱) ماں (۲) ماں شریک بہن (۳) ماں شریک بھائی۔

یہ فرض میں تین لوگ شریک ہیں، جن میں دو تو عورتیں ہیں اور مرد صرف ایک ہے۔

(د) سدس یعنی چھٹا۔ یہ فرض کل آٹھ لوگوں کو ملتا ہے:

(۱) ماں (۲) دادی (۳) پوتی (۴) باپ شریک بہن (۵) ماں شریک بہن (۵) ماں شریک بھائی (۷) باپ (۸) دادا۔

اس میں غور کیجیے کہ آٹھ میں سے پانچ عورتیں ہیں، جو یہ حصہ وفرض پاتی ہیں، باقی صرف تین مردوں کو اس فرض میں سے ملتا ہے۔

(ہ) ربع یعنی چوتھائی۔ یہ حصہ صرف دو افراد کو دیا جاتا ہے: (۱) بیوی (۲) شوہر۔ مطلب یہ ہوا کہ اس حصے میں اگر ایک مرد ہے، تو دوسری عورت بھی ہے، جو اس کی حق دار بنتی ہے۔

(و) ثمن یعنی آٹھواں۔ یہ حصہ صرف ایک کے لیے متعین ہے اور وہ ہے بیوی۔

خلاصہ یہ ہوا کہ اصحاب الفروض، جن کے حصے قرآن وسنت میں مقرر ہیں، وہ کل تیئیس (۲۳) افراد ہیں اور ان تیئیس میں سے صرف چھ مرد ہیں اور باقی سترہ سب کی سب عورتیں ہیں، جو میراث میں سے مقررہ حصے پاتی ہیں۔

اب یہ دیکھیے کہ علما نے قرآن وسنت کی روشنی میں ''عصبات''، جو اصحاب الفروض کو دینے کے بعد بقیہ مال سے اپنا حصہ پاتے ہیں، ان کی تعداد بیس بیان کی ہے اور وہ سب کے سب مرد ہیں، ان میں کوئی ایک بھی عورت نہیں، جس کا مطلب واضح طور پر یہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورتوں کو تو مقررہ حصہ دے دیا ہے؛ لیکن بہت سے مردوں کو میراث میں صرف بچا ہوا حصہ دیا جاتا ہے۔

کیا اس کے باوجود کسی کو یہ کہنے کی گنجائش ہے کہ اسلام نے عورتوں کے ساتھ ناانصافی کی ہے اور ان کو برابر کا حق نہیں دیا ہے؟!!

فقط

محمد شعیب اللہ خان
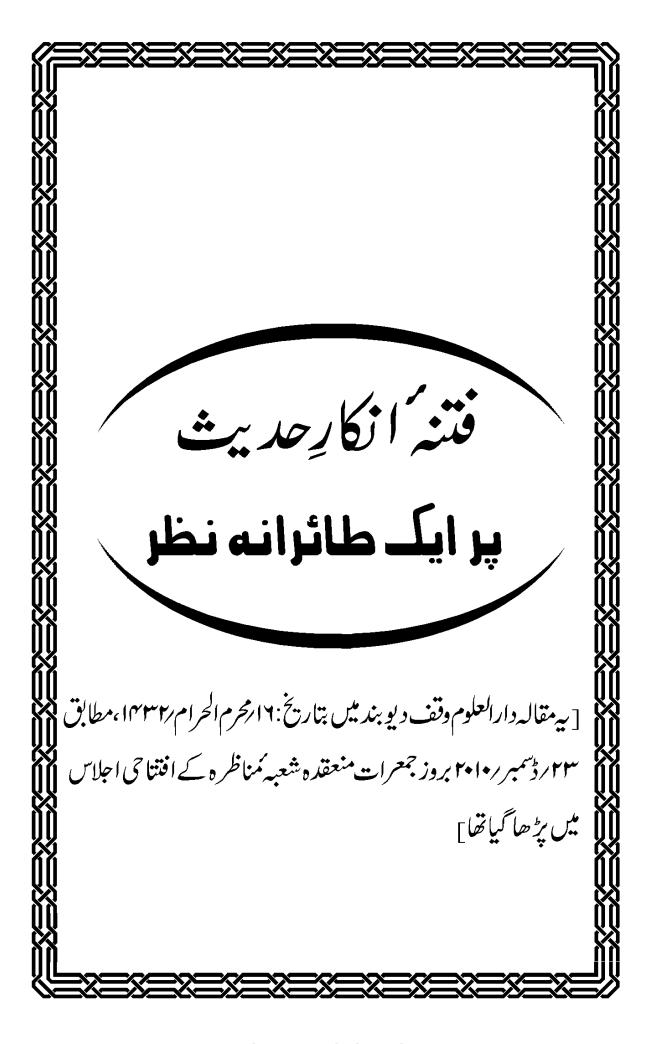
فتنۂ انکارِ حدیث
پر ایک طائرانہ نظر

[یہ مقالہ دار العلوم وقف دیوبند میں بتاریخ: ۱۶/محرم الحرام/۱۴۳۲، مطابق ۲۳/ڈسمبر/۲۰۱۰ بروز جمعرات منعقدہ شعبۂ مناظرہ کے افتتاحی اجلاس میں پڑھا گیا تھا]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فتنۂ انکار حدیث پر ایک طائرانہ نگاہ

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین،
اما بعد:

صدر عالی مقام، اساتذۂ عظام، طلبۂ کرام اور مہمانانِ ذی احترام!

سب سے پہلے میں خدائے ذوالجلال والاکرام کی بارگاہ لازوال و بے مثال میں شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے ہمیں یہاں ملت اسلامیہ کے اکابرین، علوم وثقافت کے ماہرین، اربابِ نظر وفکر اور اساطین علم وفن اور اصحاب فضل وعرفان کے مابین جمع فرما کر اپنی ''نعمت خاصہ'' سے مالا مال فرمایا، پھر میں اربابِ دارالعلوم وقف کی خدمات میں جذباتِ تشکر کا ہدیہ پیش کرتا ہوں جنھوں نے مجھ جیسے بے بضاعت ایک طالب علم کو دارالعلوم وقف جیسے باوقار و قابل رشک ادارے میں دعوت دے کر میری ہمت افزائی کے ساتھ ساتھ عزت افزائی کا بھی بھرپور سامان کیا اور اس ادارے میں منعقد اس پروقار اجلاس کے موقعہ پر مجھے ''فتنۂ انکار حدیث'' کے موضوع پر اظہار خیال کا موقعہ عطا کیا۔ بلا کسی تصنع وتکلف کے میرا خیال ہے کہ یہ بات میرے لیے انتہائی خوش بختی وسعادت مندی، فرحت ومسرت اور اعزاز وافتخار کا باعث ہے۔

کہاں میں اور کہاں یہ نکہت گل   نسیمِ صبح تیری مہربانی
اگر ہر موئے من باشد زبانم   کجا تا شکر ایں نعمت گزارم

حضرات گرامی قدر!

اس وقت کے لیے جس موضوع ''فتنۂ انکار حدیث'' کا انتخاب کیا گیا ہے، یہ درحقیقت حدیث وسنت کی حفاظت وحجیت کی بحث کا تکمیلی پہلو ہے اور اس لحاظ سے ہمارے لیے اور ہر مسلمان کے لیے یہ بڑا خوشگوار ودلچسپ موضوع ہے اور ہونا چاہیے؛ کیوں کہ یہ بات ہر شک وشبہ سے بالاتر ہے کہ اہل اسلام کے نزدیک دنیا کا کوئی فکر وفلسفہ ہو، کوئی مسلک و مذہب ہو، فکر وفن کا کوئی رنگ ہو، زندگی کا کوئی ڈھنگ ہو اور تہذیب وتمدن کا کوئی آہنگ ہو، سیرت نبوی وسنت محمدی کے سامنے ان کی کوئی حیثیت نہیں۔ وہ نجات کا مدار، کامیابی کا راستہ اور دنیا وآخرت کی صلاح وفلاح کا ضامن اگر کسی چیز کو سمجھتے ہیں تو قرآن کریم کے بعد سنت وسیرت نبوی کی اتباع کرنے، لوائے محمدی وخیمۂ مصطفوی کے زیر سایہ لمحات زندگی گزارنے اور فکری واعتقادی، عملی وانتظامی، انفرادی واجتماعی اور تمدنی وسیاسی زندگی کے ہر محاذ پر اسی کی رہبری وسرپرستی میں جینے ومرنے کو سمجھتے ہیں۔ اور اس سنت وسیرت کے راستے میں آڑے آنے والا ہر فتنہ لازمی طور پر ان کے نزدیک جہالت وضلالت کی پیداوار، کفر وارتداد کا زینہ، اور بے علمی ونفسانیت کی تیرہ بختیوں کا نتیجہ ہے۔ لہذا فتنۂ انکار حدیث بھی یقیناً اسی زمرے ودائرے میں آتا ہے؛ لہذا اس کے خلاف سینہ سپر ہونا اور اس سے پنجہ آزمائی کرنا ایک اہم فریضہ ومقدس کام ہے جس کے لیے یہاں ان طالبان علوم وحاملان فنون کو تیار کیا جارہا ہے اور وہ اس شعر کا مصداق ہیں:

ہو حلقۂ یاراں تو ریشم کی طرح نرم
رزم حق وباطل ہو تو فولاد ہے مومن

حضرات! تاریخ کے کسی بھی طالب علم سے یہ حقیقت پوشیدہ نہیں رہ سکتی کہ

اسلام کے منصبۂ شہود پر جلوہ گر ہونے کے ساتھ ہی اس ربانی دعوت کے خلاف طاغوتی طاقتوں نے یلغار شروع کر دی تھی، پھر اس کو ختم کرنے یا کمزور کرنے کی وہ کون سی تدبیر و حربہ تھا جس کو انھوں نے استعمال نہیں کیا اور وہ کون سا دقیقہ تھا جس کو فروگزاشت کرنا روا رکھا گیا؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فتنوں کا ایک سیلاب تھا جو اس کے خلاف اُمڈ آیا تھا۔ پھر یہ فتنے بہت سے تو خارجی تھے، جو غیر اقوام کی جانب سے کھڑے کیے گئے تھے، جن کی سرپرستی یہود بے بہبود اور نصاریٰ کر رہے تھے، ان کے علاوہ داخلی فتنے بھی کم نہیں تھے۔ اور یہ فتنے صورتوں وشکلوں میں اختلاف، طرز و انداز میں تغیر، ناموں اور لیبلوں میں جدت اور اپنے اپنے خاص ومخصوص امتیازات و تشخصات کے باوجود............ایسا لگتا ہے کہ............ایک متفقہ نصب العین پر پوری طرح متحد و کمربستہ تھے اور وہ نصب العین اسلام کی مخالفت وعداوت اور اسلام کی بیخ کنی و پامالی تھا۔ اور اس مقصد ونصب العین کی تکمیل وکامیابی کے لیے سب سے زیادہ وسیع پیمانے پر جس حربے کو کام میں لایا گیا وہ اسلام میں فرقہ ساز اور ناعاقبت اندیش علماءِ سوء کے ذریعہ فتنہ سامانی کا حربہ تھا۔ سبائیت، رفض وتشیع، خارجیت واعتزال، جبر وقدر، خلق القرآن، قدم وحدوث عالم، ارجاء وابتداع، مہدویت وقادیانیت وغیرہ بے شمار فتنے اسی منظّم منصوبے وایجنڈے کی پیداوار ہیں، جو بظاہر مختلف مگر مقصد ومنشأ اور نصب العین کے لحاظ سے ایک ہیں۔

ان میں سے وہ فتنے بڑے خطرناک وزہریلے اور ان کے اپنے مشن کے لحاظ سے بڑے کامیاب ثابت ہوئے جو اسلام دشمنی میں اسلام ہی کے نام پر اور عمل بالقرآن یا عمل بالحدیث کے نعروں اور دعوؤں کے ساتھ سامنے آئے۔ اسی قسم کا ایک فتنہ ''فتنۂ انکار حدیث وسنت'' بھی ہے، جس نے اپنا نام ''برعکس نہند نام زنگی کافور'' کے بہ مصداق اہل القرآن رکھ لیا ہے۔

فتنۂ انکارحدیث کی تخم ریزی

فتنۂ انکارحدیث کی ابتداء کب ہوئی ؟ تاریخی وثائق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس فتنہ کی ابتداء اسی وقت سے ہوگئی تھی جس وقت سے انکار رسالت کا فتنہ وجود میں آیا، کیوں کہ جولوگ انکار رسالت کے مرتکب ہوئے وہ لازمی طور پر انکار حدیث کی راہ پر بھی پڑ گئے اور کہا جاسکتا ہے کہ اس کے اصل بانی منافقین ہیں۔ اوراس کی دلیل وہ واقعہ ہے جس میں آتا کہ ایک منافق ومسلمان میں کسی مسئلہ پر جھگڑا تھا اور انھوں نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں فیصلہ چاہا اور آپ نے منافق کے خلاف فیصلہ کیا تو اس نے اس فیصلہ کو ماننے سے انکار کر دیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فیصلہ چاہا اور انھوں نے تحقیق کے بعد اس منافق کو قتل کر دیا اور فرمایا:

« هكذا أقضي بين من لم يرضَ بقضاء رسول الله صلى الله عليه وسلم . »

(جو اللہ کے رسول کا فیصلہ نہ ماننے میں اس کا یہی فیصلہ کرتا ہوں۔)(۱)

یہ اکے دکے واقعات اگر چہ اس فتنہ کی مستقل تاریخ کا جز قرار نہیں دئے جاسکتے، تاہم اس میں کیا شک ہے کہ اس سے اس فتنے کی ابتداء کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ بھی کہ اس کی ابتدائی تخم ریزی ''کفر ونفاق'' کی سرزمین میں ہوئی ہے۔

انکارحدیث کا تاریخی پس منظر

اس کے بعد یہ فتنہ ایک مستقل حیثیت اس وقت اختیار کر گیا جب خوارج، شیعہ اور معتزلہ کے بعض فرقوں وطبقوں نے انکار حدیث وسنت کو اپنا شعار بنالیا، شیعہ نے اس وجہ سے کہ وہ سوائے چند کے تمام صحابہ کو نعوذ باللہ کافر ومرتد قرار دیتے تھے اور ان

(۱) الدر المنثور: ۴/۴۲۵

کی عدالت وثقاہت میں طعن وقدح کر کے ان کی روایات کو ناقابل اعتبار ٹھہراتے تھے اور احادیث میں سے صرف ان احادیث کو قابل اعتبار سمجھتے تھے جن کا سلسلۂ سند ان کے ائمہ (جن کو وہ لوگ معصوم مانتے اور ان کے مقام کو مقام نبوت سے بھی برتر سمجھتے ہیں) تک جا پہنچے۔

اور خوارج نے حضرت علی وحضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے مابین ہونے والی جنگ میں پیش آنے والے واقعۂ تحکیم کو بنیاد بنا کر حضرت علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کو کافر اور کم از کم فاسق قرار دیا اور اسی بنیاد پر ان کی احادیث کو ناقابل احتجاج ٹھہرایا اور یہ دعوی کیا کہ قرآن میں سب کچھ ہے اور وہی ہمارے لیے کافی ہے۔ اور زنا کی سزا میں رجم کا انکار کیا، مسح علی الخفین کا انکار کیا، کم بیش ہر قسم کی چوری پر سزا کو روا رکھا، آخرت میں دیدارِ خداوندی کا انکار کیا، عذابِ قبر کا انکار کیا؛ کیوں کہ یہ سب امور قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔

اور معتزلہ اپنے باطل نظریات کے ساتھ آیات قرآنیہ میں بے جا تاویل اور بعض جگہ تحریف کے ساتھ ساتھ احادیث نبویہ میں سے اخبار آحاد کا انکار کیا کرتے تھے؛ لیکن تاریخ و اصول کی کتابوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تمام معتزلین کا مسلک نہیں تھا؛ بل کہ ان میں سے بعض سے صراحت کے ساتھ اخبار آحاد کا حجت ہونا بھی منقول ہے، جیسے ابوالحسین بصری معتزلی کے بارے میں نقل کیا گیا ہے۔ اور بعض معتزلہ سے اس کا انکار نقل کیا گیا ہے اور اس کی بنیاد دراصل یہ تھی کہ وہ عقل کو دین کا معیار قرار دیتے تھے اور جو بات عقل کی کسوٹی پر نہ اترے اس کو یا تو بے جا تاویل سے رد کرتے یا سرے سے اس کو درخورِ اعتناء ہی نہ سمجھتے تھے؛ لہٰذا احادیث میں سے بہت سی احادیث کا انھوں نے اسی بنیاد پر رد کر دیا، جیسے آخرت میں رویت

باری کی احادیث، عذاب قبر کی احادیث، میزان ووزن اعمال کی احادیث وغیرہ۔

ان فرقوں کے عقائد باطلہ وانحرافات زائغہ کے ساتھ ساتھ احادیث کے انکار کی یہ صورت فرق اسلامیہ پر لکھنے والے متعدد مؤرخین نے اپنی اپنی کتب میں تفصیل وتحقیق کے ساتھ سپرد قلم کی ہیں۔ جیسے ابن حزم ظاہری، محمد بن عبدالکریم شہرستانی، عبد القاہر البغدادی، اور ابوزہرہ رحمہم اللہ وغیرہ۔

الغرض ان تین فرقوں کی جانب سے انکار حدیث کے فتنے کو تقویت وتحریک ملی اور وہ پروان چڑھتا گیا اور ان فرقوں میں سے خوارج ومعتزلہ اگرچہ اپنی موت آپ مرگئے اور ان میں سے خوارج کے ایک فرقے اباضیہ کے سوا دوسرے فرقے اپنا کوئی خاص وجود نہیں رکھتے، تاہم ان کے نظریات میں سے کسی کسی کو بعض بعض افراد واشخاص نے اختیار کیا اور ان کو اپنی تحریرات وکتابوں، مقالات ومباحث میں زندہ رکھنے کی کوشش کی۔ اور شیعہ نے اپنے دائرۂ اثر ورسوخ میں اپنے دیگر باطل مزعومات کے ساتھ اس نظریے کو بھی باقی وجاری رکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ فتنۂ انکار حدیث نے خوارج، شیعہ ومعتزلہ کی گود میں جنم لیا اور پروان چڑھا ہے۔

فتنۂ انکارِ حدیث کا نیا روپ

یہاں تک کہ اس باطل فتنے کے جراثیم زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ بڑھتے وپھیلتے گئے اور ان کے اگلوں سے ان کے پچھلوں میں موروثی بیماریوں کی طرح منتقل ہوتے ہوتے انیسویں صدی عیسوی کے اواخر وبیسویں صدی عیسوی کے اوائل۔ یعنی چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں۔ ہندوستان کی طرف چلے آئے اور یہاں اس فتنے نے ایک کروٹ لی اور نیا روپ اختیار کرلیا اور باطل کی سربلندی وحق سے برگشتگی کے ناپاک ومجرمانہ جذبات کے ساتھ وہ سرے سے حجیت حدیث کے

انکار اور رسول کی ذات سے بے اعتنائی و بے نیازی؛ بل کہ اس سے استہزاء و مذاق اور صرف قرآن پر مدار دین ہونے کے بودے نعرے و دعوے؛ بل کہ اس سے آگے خود قرآن کو مشکوک بنانے کی ناکام فکر و سعی کو اپنی تمام تر مساعی خبیثہ کا محور بنالیا۔ الغرض اس فتنہ نے مختلف باطل و ناپاک نظریات وخیالات، بے ہودہ افکار و انظار اور بے سروپا عقائد و مراسم کو اسلام و قرآن کے نام پر رواج دینے کی سعی و کوشش کی اور کذب و افتراء اور دھوکہ و فریب کے کند ہتھیار سے لیس ہو کر اسلام کا مقابلہ کرتا رہا ہے۔

اس سے پہلے اس قدر کھل کر کسی نے احادیث کی حجیت کا انکار نہیں کیا تھا اور نہ علی الاطلاق انکار حدیث کا نعرہ لگایا تھا اور نہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی ذات کو سرے سے ناقابل اعتناء ٹھہرایا تھا؛ بل کہ صرف جزوی طور پر احادیث سے انکار اور اپنے باطل مزعومات کے تحت بعض بعض احادیث سے انکار تک بات محدود تھی، مثلا شیعہ نے اپنے ائمہ کی سند سے آنے والی حدیث کے سوا دیگر طرق کی احادیث کا انکار کیا، خوارج نے بھی واقعہ تحکیم میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ساتھ دینے والوں کی احادیث کو ناقابل اعتبار کہا؛ مگر دوسری احادیث کے قبول کرنے میں اس کو تأمل نہ تھا، معتزلہ نے ان کے اپنے معیار عقل پر نہ اترنے والی احادیث کا انکار کیا اور دوسری احادیث سے بے اعتنائی و بے نیازی نہیں برتی۔ مگر اس نئے فتنے نے سب سے پہلی دفعہ یک لخت تمام احادیث کا سرے سے انکار کر دیا اور اسلام میں ان کے حجت ہونے کی بالکلیہ نفی کر دی۔ اس طرح یہ فتنہ اس سے ماقبل اس فتنے کا ایک نیا انداز اور کامل روپ کہا جاسکتا ہے۔

حدیث میں فتنۂ انکار حدیث کی پیش گوئی

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس فتنے کے بارے میں خود حدیث رسول میں پیش

گوئی موجود ہے۔ چناں چہ حضرت مقدام بن معدیکرب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«أَلاَ إِنِّي أُوتِيتُ الْكِتَابَ وَ مِثْلَهُ مَعَهُ، أَلاَ يُوشِكُ رَجُلٌ شَبْعَانُ عَلٰى أَرِيكَتِهِ يَقُولُ: عَلَيْكُمْ بِهٰذَا الْقُرْآنِ، فَمَا وَجَدْتُّمْ فِيهِ مِنْ حَلاَلٍ فَأَحِلُّوهُ وَمَا وَجَدتُّمْ فِيهِ مِنْ حَرَامٍ فَحَرِّمُوهُ ، الخ.» (۱)

(خبر دار کہ مجھے کتاب کے ساتھ اسی جیسی ایک اور چیز عطا کی گئی ہے، خبر دار رہو کہ ایک پیٹ بھرا شخص اپنے آراستہ و مزین تخت پر بیٹھے کہے گا کہ "تم پر صرف یہ قرآن لازم ہے؛ لہٰذا جو اس میں تم کو حلال ملے اس کو حلال سمجھو اور جو اس میں تم کو حرام ملے اس کو حرام سمجھو۔)

ایک اور حدیث میں حضرت ابو رافع رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

«لَا أُلْفِيَنَّ أَحَدَكُمْ مُتَّكِئًا عَلٰى أَرِيكَتِهِ يَأْتِيهِ الْأَمْرُ مِنْ أَمْرِي مِمَّا أَمَرْتُ بِهِ أَوْ نَهَيْتُ عَنْهُ فَيَقُولُ: لَا نَدْرِي ، مَا وَجَدْنَا فِي كِتَابِ اللّٰهِ اتَّبَعْنَا.» (۲)

(میں تم میں سے کسی کو اس حال میں نہ پاؤں کہ وہ اپنے تخت پر ٹیک لگائے ہوئے ہو، اس کے پاس میرے حکموں میں سے کوئی حکم آئے جس کا میں نے حکم دیا ہو یا اس سے میں نے منع کیا ہو اور وہ کہے کہ ہم اس

(۱) ابو داود: ۴۶۰۶، ابن ماجہ: ۱۲، ترمذی: ۲۶۶۴

(۲) ابو داود: ۴۶۰۷، ابن ماجہ: ۱۳، ترمذی: ۲۶۶۳، سنن کبری بیھقی: ۷/۷۶

کونہیں جانتے، جو ہم نے کتاب اللہ میں پایا ہم نے اس کی اتباع کی ۔)

یہ حدیث صاف الفاظ میں اس فتنے کی نشان دہی کر رہی ہے اور چودہ سو سال قبل اس فتنے کی پیش گوئی کر کے یہ بھی ثابت کر رہی ہے کہ حدیث سچی ہے، گویا یہ حدیث خود حدیث کے سچا ہونے اور حجت ہونے کی دلیل ہے۔

نیز اس حدیث میں اس فتنے کے بانی مبانی لوگوں کے بارے میں چند حقائق سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور اس فتنے کے اسباب و بواعث کی بھی نشان دہی کی گئی ہے۔

چناں چہ اس حدیث میں ایک بات یہ فرمائی گئی ہے کہ: ''رجل شبعان'' (پیٹ بھرا آدمی) یعنی یہ فتنہ پیٹ بھرے شخص سے ظاہر ہوگا۔ اور یہ بدفہمی و غباوت ذہنی سے کنایہ ہے جو عام طور پر خوب کھا جانے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے قاضی عیاض رحمہ اللہ سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے:

''انما وصفه بالشبع لأن الحامل له على هذا القول اما البلادة و سوء الفهم ومن اسبابه الشبع و كثرة الاكل، واما الحماقة والبطر ومن موجباته التنعم والغرور بالمال والجاه''.

(حضور نے اس کو پیٹ بھرا ہونے سے اس لیے تعبیر کیا کہ اس کو یہ بات کہنے پر یا تو بلادت و بدفہمی ابھارتی ہے اور اس کے اسباب میں سے پیٹ بھرا ہونا اور زیادہ کھانا ہے، یا اس پر ابھارنے والی چیز حماقت و اکڑ ہے اور اس کے اسباب میں سے تن پروری اور مال و جاہ پر غرور ہے۔)(۱)

---

(۱) مرقاۃ المفاتیح: ۳۴/۲

لہٰذا اس میں اشارہ ہے کہ منکرین حدیث کا یہ فتنہ ان کی بدفہمی و بلادت ذہنی یا ان کی حماقت و تکبر کا نتیجہ ہوگی، اگرچہ وہ خود اپنے کو بڑے عقل مند و دانشور سمجھتے ہوں۔

دوسرے اس حدیث میں ہے ''متکئاً علی أریکته'' کہ وہ شخص اپنے تخت پر ٹیک لگائے ہوگا اور اریکہ اس تخت کا نام ہے جو انواع و اقسام کے مزین کپڑوں سے آراستہ کیا گیا ہو جیسے دلہن کے لیے پلنگ سجایا جاتا ہے۔ علامہ بغوی رحمہ اللہ شرح السنہ میں لکھتے ہیں کہ اس سے اصحاب عیش و ترفہ مراد ہیں جو مال دولت کی فراوانی کی وجہ سے گھروں میں پڑے رہتے ہیں اور طلب علم میں نہیں لگتے۔ (۱)

اس کے مطابق اس میں اشارہ ہے کہ انکار حدیث اصحاب عیش و عشرت، اور علم و طلب علم سے دور رہنے والوں میں جنم لے گا اور انہی سے پروان چڑھے گا۔ الغرض یہ فتنہ ایک تو مال و دولت کی فراوانی اور عیش کوشی و خواہش پرستی کا نتیجہ ہوگی اور دوسرے بے علمی و جہالت، علم و علما سے بعد و دوری اس کا باعث ہوگی۔

سر سید احمد خان

اب یہ بھی سنتے چلیں کہ ہندوستان میں اس فتنے کو پروان چڑھانے والے متعدد لوگ ہیں۔ تاریخ کی شہادت یہ ہے کہ ہندوستان میں اس فتنے کی ابتداء سر سید احمد خان رحمہ اللہ سے ہوئی جنھوں نے برطانوی سامراج و انگریزی اقتدار سے مرعوبیت، مغربی تہذیب و تمدن سے بے پناہ عقیدت و محبت کے نتیجہ میں دین کے بہت سے عقائد و احکام کو تاویل و تحریف سے رد کیا اور جنت و دوزخ، جن و ملائک، معجزات و کرامات وغیرہ حقائق کا انکار کیا، بہت سے احکام اسلامیہ کی بے جا تاویل کی، قرآن مجید کی تفسیر میں تفسیر بالرائے کا مبینہ ارتکاب کیا، یہاں تک کہ احادیث

---

(۱) شرح السنة: ۱/۲۰۱

رسول کو نا قابل اعتبار قرار دیا اور احادیث سے ثابت شدہ احکام ومسائل کو علماء وائمہ کے استنباطات واجتہادات کا درجہ دیا، اور اپنے ذہن سے حدیث کے رد وقبول کا ایک معیار ایسا وضع کیا جس کا حاصل سوائے انکار حدیث کے کچھ نہیں نکلتا۔ ظاہر ہے کہ اس تمام تر مساعی وکاوش کا مقصد وحید انکار حدیث وتردید سنت کی راہیں وسبیلیں ہموار کرنا تھا اور اس کی پشت پر جو جذبہ کارفرما تھا وہ یہ کہ قرآن کی من مانی تفسیر وتشریح کے ذریعہ حسب منشأ رنگ آمیزی کی جائے اور مطلب براری کے لیے اس کو حسب موقعہ توڑا مروڑا جا سکے۔

مولوی عبداللہ چکڑالوی

اس فتنے کے بانیین میں دوسری اہم شخصیت مولوی عبداللہ چکڑالوی کی ہے، جو بمقام چکڑالہ ۱۸۳۰ عیسوی کے آس پاس پیدا ہوا اور عام طریقہ پر مدارس میں تعلیم پائی اور دہلی میں حدیث کے اسباق حاصل کئے اور پھر درس وتدریس کی خدمات میں لگ گیا اور تالیف وتصنیف کا شغف اختیار کیا اور اسی زمانے میں حدیث کے متشابہ ومشکل مقامات پر پہنچ کر اپنی ایک الگ فکر قائم کی اور اس کا اعلان کیا کہ قرآن ہی در اصل اللہ کا کلام ووحی ہے۔ اور سنت وحدیث اللہ کی جانب سے نہیں، پھر اس نے ایک فرقے کی بنیاد ڈالی جس کا نام۔''اهل الذكر والقرآن'' رکھا، جو بعد میں اختصاراً صرف ''اہل قرآن'' رہ گیا۔

اس نے اس سلسلے میں متعدد کتابیں ورسائل لکھے اور اپنی فکر کی جانب دعوت دی، اس کا مرکز لاہور تھا، اس نے شریعت اسلامیہ کی متعدد باتوں میں تحریف کی، اذان ونماز کا نیا طریقہ ایجاد کیا۔ اس کے عقائد کی تفصیل اس کی کتاب ''برهان الفرقان علی صلاۃ القرآن'' اور ''الصلاۃ للّٰہ'' میں مذکور ہے۔

خواجہ احمد الدین

اس فتنے کے علمبرداروں میں سے ایک خواجہ احمد الدین ابن خواجہ محمد امرتسری ہے، جو ۱۸٦۱عیسوی میں بہ مقام امرتسر پیدا ہوا اور علوم دینیہ کے بعد عیسائی اسکول سے منسلک ہوا اور علوم عصریہ کی تحصیل کی پھر اس میں خوب محنت کر کے تاریخ، جغرافیہ، فلکیات، منطق وریاضی میں مہارت پیدا کی اور اردو، عربی، فارسی کے ساتھ انگریزی زبان پر بھی قابو پایا۔ پھر سر سید احمد خان کے افکار سے متأثر ہوا اور عبد اللہ چکڑالوی و غلام احمد قادیانی سے رابطہ پیدا کیا اور عبد اللہ چکڑالوی کے خیالات ونظریات سے نہ صرف متأثر ہوا؛ بل کہ ان کو قبول کر کے اس کا علمبردار بن گیا۔ پھر دروس کے ذریعہ لوگوں کو اس فتنے کی دعوت دینا شروع کیا اور ایک جماعت ''امت مسلمہ'' کے نام سے قائم کی اور اس کا ایک آرگن جاری کیا جس کا نام ''جماعت'' رکھا۔ خواجہ احمد الدین کی زبان نرم وشیریں تھی اور مزاج میں نرمی وملاطفت تھی، اس لیے لوگ اس کی باتوں سے بہت جلد متأثر ہو جاتے تھے۔ اور سب سے بڑی بات اس میں یہ تھی کہ توریہ وتقیہ سے کام لیتا تھا جس سے لوگ اصل حقیقت سے ناواقف رہتے اور اس کی باتوں میں آجاتے تھے۔ لہٰذا اسکولوں اور کالجوں کے پڑھے لکھے لوگ اس کے حلقے میں داخل ہونے لگے۔ اس نے متعدد کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے معجزۂ قرآن اور ''تفسیر بیان للناس'' معروف ہیں۔

حافظ محمد اسلم جیراجپوری

اس فتنے کو پروان چڑھانے میں جن لوگوں نے نمایاں کام کیا ان میں ایک حافظ محمد اسلم جیراجپوری ہے۔ جو ۱۸۸۰عیسوی میں پیدا ہوا اور اس نے اس فتنے کو بھڑکایا اور اہل اسلام کے دلوں کے زخموں پر نمک پاشی کا کام کیا، یہ شخص ''جامعہ ملیہ''

اور ''علی گڑھ'' یونیورسٹی میں محاضر بھی رہا، پھر تقسیم ہند کے بعد پاکستان چلا گیا؛ مگر فضا کو نا ہموار پا کر دوبارہ ہندستان لوٹ آیا اور مرتے دم تک اس فتنے کی اشاعت و ترویج میں لگا رہا۔ اس کی تالیفات میں'' اسلام میں وراثت''، ''حیات عمرو بن العاص''، ''تاریخ نجد''، ''تاریخ القرآن''، ''تاریخ ملت اسلامیہ''، ''عقائدالاسلام'' اور ''تعلیمات قرآن'' ہیں۔

غلام احمد پرویز

اس سلسلے کی ایک بہت اہم ومعروف شخصیت غلام احمد پرویز کی ہے جس کی جانب منسوب کر کے اس فتنہ کو'' پرویزی فتنہ'' کہا جاتا ہے۔ یہ شخص پنجاب میں بمقام بٹالہ ۱۹۰۳عیسوی میں پیدا ہوا اور اپنے دادا رحیم بخش سے علوم دینیہ کی تحصیل کی، پھر اسکول میں عصری علوم کے لیے داخل ہوا اور تکمیل نہیں کر سکا۔ پھر منکرین حدیث کی کتابیں پڑھنے کے نتیجہ میں ان سے متأثر ہوا اور احادیث کی حجیت کے انکار میں اپنے پیشرو قائدین سے بھی آگے بڑھ گیا اور اسلام ورسول دشمنی میں سب سے آگے نکل گیا۔

اس نے اولاً مساجد میں اپنے دروس اور خطبات کے ذریعے اپنے نظریات و افکار کو پھیلانا شروع کیا، پھر ۱۹۳۸ء میں ایک رسولہ'' طلوع اسلام'' کے نام سے جاری کیا اور اس سے ان خیالات کی ترویج کی، پھر مقالات وکتابوں کے ذریعہ اپنے زیغ وضلال کی اشاعت میں لگ گیا اور تقسیم ہند کے بعد پاکستان منتقل ہوکر کراچی کو اپنا مرکز بنایا جب کہ پاکستان کی کرسیٔ صدارت پر محمد علی جناح متمکن تھے۔ اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ اس وقت حکومت پاکستان نے اس فتنے کی آبیاری وترقی کے لیے اس کے حق میں گرانٹ بھی منظور کیا۔ اس کی کتابوں میں ''تبویب القرآن''،

''معارف القرآن''، ''ابلیس وآدم''، ''اسلامی معاشرہ''، ''قادیانی تحریک''، ''قرآن اور ڈاکٹر اقبال'' وغیرہ ہیں۔

اسی طرح اس فتنے کے علمبرداروں میں جعفر شاہ پھلواری، محمد رمضان، چراغ علی، اور عنایت اللہ مشرقی بھی ایک خاص مقام رکھتے ہیں اور اس فتنے کی ترقی وترویج میں ان کی محنت وجد وجہد کو بڑا دخل رہا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینا بھی مناسب ہے کہ جس طرح سنت وحدیث سے بغاوت وعداوت کی یہ تحریک ''اہل قرآن'' کے نام سے ہندوستان میں جاری ہوئی، اس کے اثرات دوسرے ممالک پر بھی پڑے اور مصر وشام ودیگر عربی ممالک میں بھی کچھ لوگ اس تحریک کے حامی ہوئے ہیں۔ ان میں سے چند اہم لوگوں کا اجمالی ذکر کرتا ہوں: ۱- احمد صبحی منصور: ۲- امین یوسف: علی ۳- جمال الدین افغانی: ۴- مفتی محمد عبدہ: ۵- رشید رضا مصری ۶- صالح ابو بکر ۷- محمود ابوریہ مصری ۸- احمد زکی ابوشادی ۹- احمد امین۔ ان سب نے کسی نہ کسی حیثیت سے حدیث وسنت کا انکار کیا اور اس کو اپنا شیوہ بنایا ہے۔

منکرین حدیث کے غیر اسلامی نظریات

منکرین حدیث اسلام، اہل اسلام اور اسلامی تعلیمات کے خلاف بہت سے نظریات رکھتے ہیں، ان میں سے یہاں بعض اہم اہم نظریات کا ذکر کرتا ہوں:

۱- ان لوگوں کا ایک عقیدہ ونظریہ یہ ہے کہ وحی الٰہی صرف قرآن کی شکل میں آئی ہے، اس کے علاوہ کسی اور شکل میں نہیں۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی نے اپنی کتاب ''برہان الفرقان'' میں لکھا ہے کہ: سنو کہ وہ شیء جو محض قرآن مجید ہی ہے جو رسول اللہ کی طرف وحی کی گئی، اس کے سوا اور کوئی چیز ہرگز ہرگز خاتم النبیین پر وحی نہیں ہوئی۔ (۱)

(۱) بحوالہ جواھر الفقہ: ۱/ ۳۹-۴۳

۲- یہ لوگ کہتے ہیں کہ حدیث وسنت کی کوئی ضرورت نہیں، کیوں کہ قرآن خود مشرح ومفصل ہے۔عبداللہ چکڑالوی ''کتاب مناظرہ'' میں کہتا ہے کہ: قرآن مجید میں دین اسلام کی ہر ایک چیز من کل الوجوہ مفصل ومشرح بیان ہوگئی ہے تو اب وحی خفی یا حدیث کی کیا حاجت رہی؟ بلکہ اس کا ماننا اور دین اسلام میں اس پر عمل درآمد کرنا سراسر کفر، شرک، ظلم، فسق ہے۔(۱)

اور جب قرآن کے لیے سنت وحدیث کی عدم ضرورت کا دعوی کیا تو حدیث کو مشکوک قرار دینے کی ان لوگوں نے ان تھک کوشش شروع کردی اور کہا:

''حدیث کا پورا سلسلہ ایک عجمی سازش تھی اور جس کو شریعت کہا جاتا ہے وہ بادشاہوں کی پیدا کردہ ہے''۔(۲)

اور کہتے ہیں کہ حدیثیں ظنی ہیں اور قرآن کی رو سے ظن کی پیروی منع ہے۔(۳)

اورعبداللہ چکڑالوی کہتا ہے کہ: آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کی وفات سے سیکڑوں برس پیچھے بعض خودغرض لوگوں نے ازخود یہ ہزلیات گھڑلیں اور کمال سیاہ دلی سے ان کوناحق محمد رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے ذمہ لگادیا ہے۔(۴)

الغرض ان لوگوں نے جب قرآن پر کفایت کا دعوی کیا تو حدیث رسول کی عدم ضرورت ثابت کرنا بھی ان کے لیے ضروری ہوگیا اور اس کے لیے حدیث کو مشکوک بنانے کی فکر شروع کردی اور دعوی کرنے لگے کہ حدیثیں حضور کے زمانے میں مدون نہیں ہوئیں اور تیسری صدی تک سماع وروایت کے ذریعہ نقل کی جاتی رہی اور جب

---

(۱) کتاب مناظرہ: ۱۱۹ از مقام حدیث

(۲) طلوع اسلام: اکتوبر ۱۹۵۲ء

(۳) طلوع اسلام: جولائی ۱۹۵۰ء

(۴) الزکاۃ والصدقات ازمقام حدیث: ۱۱۰

لوگ ایک جمعہ پہلے کی بات یاد نہیں رکھتے تو سوسواحادیث کو یاد رکھنا کیسے ممکن ہے؟(۱)

۳-منکرین حدیث کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صرف پیغام قرآنی پہنچانے کے لئے آئے تھے، اس کے سوا آپ کا کوئی اور کام بھی نہیں، مقام بھی نہیں۔ چنانچہ محمد اسلم جیراجپوری اپنی کتاب ''تعلیمات قرآن'' میں کہتا ہے:

''رسول کی اطاعت بحکم الٰہی اور بحیثیت منصب رسالت فرض ہے، اور بحیثیت منصب رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس......اس لیے رسول کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا پیغام جو وہ لایا ہے اس پر عمل کیا جائے؛ لہٰذا رسول کی اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت ہوئی،...... ہمارے رسول صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے۔''(۲)

اور اس سے آگے ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت شرک ہے۔ مولوی عبد اللہ چکڑالوی کہتا ہے کہ: سوائے اللہ تعالے اور کسی کا حکم ماننا شرک فی الحکم ہے۔(۳)

۴-قرآن میں اللہ و رسول کی اطاعت سے مراد مرکز ملت یعنی وقت کی حکومت کی اطاعت ہے۔ غلام احمد پرویز آیت کریمہ: ''یا ایھا الذین اٰمنوا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم'' کے متعلق لکھتا ہے:

''اس آیت مقدسہ کا مفہوم بالکل واضح ہے، اس میں اللہ و رسول

(۱) دیکھو: اشاعۃ السنۃ: ۱۵۲/۱۹، ۱۹۰۲ء

(۲) تعلیمات قرآن: ۱۵۵

(۳) بحوالہ جواھر الفقہ: ۱/۳۹-۴۳

سے مراد ہی مرکز ملت ہے اور ”اولو الامر“ سے مفہوم افسران ماتحت، اس سے مطلب یہ ہے کہ اگر کسی مقامی افسر سے کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو بجائے اس کے کہ وہیں مناقشات شروع کر دو، امر متنازع فیہ کو مرکزی حکومت کے سامنے پیش کر دو، اسے مرکزی حکومت کی طرف (REFER) کر دو، مرکز کا فیصلہ سب کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔“(۱)

جب ان لوگوں نے حکومت کو خدا اور رسول کا درجہ دے دیا تو لازمی بات ہے کہ اس کو خدائی اختیارات بھی حاصل ہونا چاہئے؛ لہٰذا ارشاد ہوتا ہے کہ مرکز ملت کو نماز کی جزئیات میں تغیر و تبدل کا حق ہے۔(۲)

اور اس کا ایک لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت صرف آپ کے زمانے تک محدود ہو اور وہ بھی صرف اس حیثیت سے کہ آپ حاکم ہیں، باقی رسول کی حیثیت سے آپ کی کوئی اطاعت نہیں۔ لہٰذا یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضور ﷺ نے جو احکام بیان فرمائے ہیں وہ صرف حضور ﷺ کے زمانے کے ساتھ مخصوص تھے، ہر زمانے کے لحاظ سے ان میں تغیر و تبدل کیا جا سکتا ہے۔(۳)

ان عقائد سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ فرقہ اہل القرآن (جو درحقیقت منکر حدیث و منکر قرآن ہے) کس قدر اسلام سے بعید اور بدترین قسم کے کفر کا مرتکب ہے۔

---

(۱) اسلامی نظام: ۱۱۰-۱۱۱

(۲) طلوع اسلام: جون ۱۹۵۰ء

(۳) معارف القرآن: ۴/۲۹۲، طلوع اسلام: جون ۱۹۵۰ء

انکارِ حدیث اور مستشرقین

یہاں یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ اس فتنۂ انکارِ حدیث میں معاندین اسلام میں سے مستشرقین کو بھی بڑا دخل رہا ہے، مستشرقین نے وقفہ وقفہ سے اسلام اور اہل اسلام کو جو نشان ملامت بنایا اور اسلام و اہل اسلام کے خلاف جو زہر اگلا ہے، اس میں ایک یہ بھی ہے کہ سنت رسول نا قابل احتجاج ہے اور یہ کہ اس میں شک و شبہ ہے۔ اس سلسلہ میں مشہور مستشرق "Gold Ziher" نے اپنے ناپاک قلم سے سنت کو مخدوش قرار دیتے ہوئے لکھا ہے: حدیث کی ایک بڑی تعداد صرف قرن اول وثانی میں اسلام کی دینی وسیاسی واجتماعی ترقی کا نتیجہ ہے اور یہ بات صحیح نہیں ہے جو کہی جاتی ہے کہ حدیث اسلام کے عہد اول یعنی اس کے ابتدائی دور میں اسلام کا وثیقہ رہا ہے؛ بل کہ یہ ترقی کے دور میں اسلام کی کوششوں کا ایک اثر ہے۔ (۱)

یہی مستشرق اپنی کتاب "العقيدة والشريعة في الاسلام" میں کہتا ہے کہ: وہاں یعنی اسلام میں کچھ باتیں عہد قدیم (تورات) اور عہد جدید (یعنی اناجیل) اور ربانیوں کے اقوال سے لی گئی ہیں اور کچھ باتیں من گھڑت اناجیل سے اور یونانی فلاسفروں کی تعلیمات اور پارسی و ہندو لوگوں کی حکیمانہ باتوں سے لی گئی ہیں اور ان سب نے حدیث کے نام سے اسلام میں اپنی جگہ لے لی۔ (۲)

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کے خیالات مستشرقین سے اور ان کے علاوہ کسی بھی کافر سے نہ حیرت انگیز ہیں نہ کوئی بعید از قیاس؛ کیوں کہ یہ لوگ جب آنحضرت

---

(۱) دراسات اسلامیہ: بحوالہ: دفاع عن الحديث النبوی دکتور احمد عمر هاشم، رئیس جامعه الازهر: ۳۶

(۲) العقيدة والشريعة فی الاسلام مترجم :۵۱

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اللہ کا نبی ہی نہیں مانتے تو ان کا یہ کہنا کہ حدیث حجت نہیں، کیوں کر قابلِ حیرت و تعجب ہو سکتا ہے؟ یہ لوگ نہ صرف سنتِ رسول کو؛ بل کہ خود قرآن کریم کو بھی اللہ کا کلام نہیں مانتے؛ لہٰذا ان لوگوں کی جانب سے ان آراء کا اظہار چنداں حیرت افزا نہیں۔

علماءِ اسلام کا منکرین حدیث کے بارے میں موقف

حضرات علمائے اسلام نے جہاں اور جب بھی اور جس شکل وصورت میں بھی یہ فتنہ پیدا ہوا، اس کا مقابلہ کیا اور انکارِ حدیث کو اسلام و رسول کی مخالفت وعداوت کا نتیجہ قرار دیا۔ سب سے پہلے اس سلسلے میں امام شافعی رَحِمَہُ اللّٰہُ کا نام تاریخ نے محفوظ کیا ہے، جنھوں نے انکارِ حدیث کے خلاف "الرسالۃ" لکھ کر آواز بلند کی اور احادیث کی حجیت پر دلائل کا انبار لگا دیا اور اخبارِ آحاد سے احتجاج کے درست ہونے کو مدلل کیا۔ نیز آپ نے اپنی کتاب "الام" میں ایک فصل قائم کر کے اس میں منکرین حدیث کے ساتھ اپنا مناظرہ نقل کیا ہے۔ اور اس میں ثابت کیا ہے کہ منکرِ حدیث کا دعوی باطل و مردود ہے۔

نیز علامہ ابن حزم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اپنی کتاب "الاحکام" میں منکرین حجیتِ سنت کا بھرپور رد لکھا اور اس میں سنتِ رسول کی حجیت کے انکار اور قرآن پر اکتفاء کے نظریے کو کفر قرار دیا ہے، وہ کہتے ہیں:

"ولو أن امرءاً قال: لا نأخذ الا ما وجدنا في القرآن لكان كافراً باجماع الأمة."

(اور اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ ہم نہیں لیتے مگر صرف وہ بات جو ہم قرآن میں پاتے ہیں تو وہ باجماعِ امت کافر ہوگا۔)(۱)

---

(۱) الاحکام: ۸۰/۲

علامہ خطیب بغدادی رحمہ اللہ نے حدیث وسنت کا انکار کرنے اور حاملین وقائلین حدیث کا مذاق اڑانے والوں کے رد میں ''شرف اصحاب الحدیث'' لکھی اوران لوگوں کا بھرپور رد کیا۔

امام سیوطی رحمہ اللہ نے منکرین حدیث کے رد میں ایک مستقل رسالہ لکھا جس کا نام ''مفتاح الجنة فی الاحتجاج بالسنة'' ہے۔اس میں انھوں نے فرمایا:

''اعلموا اَن من أنكر كون حديث النبي صلی اللہ علیہ وسلم قولًا كان أو فعلاً بشرطه المعروف في الأصول حجةً كَفُرَ و خَرَجَ عن دائرة الاسلام و حُشِرَ مع اليهود والنصارى أو مع من شاء الله من فِرَقِ الكفرة.''

(جان لو کہ جو شخص نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ،خواہ وہ حدیث قولی ہو یا فعلی اس کی شرط کے مطابق جو اصول میں معروف ہے، اس کے حجت ہونے کا انکار کرے، وہ کافر اور دائرۂ اسلام سے خارج ہے اور وہ یہود ونصاریٰ اور ان کافر لوگوں کے ساتھ محشور ہوگا جن کے ساتھ اللہ چاہیں گے۔)(۱)

نیز متعدد حضرات علما نے اپنی اصولی کتابوں اور بحثوں کے ضمن میں اس فتنے کے خلاف لکھا اور اس کا رد کیا اور انکار حدیث کو گمراہی وضلالت قرار دیا۔نیز عالم اسلام کے مشہور اہل افتاء علماء نے اس فتنے پر سخت ترین الفاظ میں رد کیا ہے اور انکار سنت کو صاف الفاظ میں کفر وارتداد قرار دیا ہے۔

علامہ شیخ عبداللہ بن باز رحمہ اللہ نے ایک مصری رشاد خلیفہ جس نے اہل قرآن

---

(۱) مفتاح الجنة: ۵

کا نقطۂ نظر اختیار کیا تھا اور سنت کی حجیت کا منکر تھا، اس کے بارے میں لکھا:

''ان ما تفوّه به رشاد خليفة من انكار السنة والقول بعدم الحاجة اليها كفر و ردة عن الاسلام لأن من أنكر السنة فقد أنكر الكتاب و من أنكر هما أو أحدهما فهو كافر بالاجماع.''

(رشاد خلیفہ نے انکار حدیث اور اس کی حاجت نہ ہونے کی جو بکواس کی ہے یہ کفر اور اسلام سے ارتداد ہے، کیوں کہ جو شخص سنت کا انکار کرتا ہے وہ کتاب اللہ کا انکار کرتا ہے اور جو ان دونوں کا یا ان میں سے ایک کا انکار کرے وہ بالاجماع کافر ہے۔)(۱)

اور خاص اس جماعت اہل القرآن اور غلام احمد پرویز اور اس کے حواریوں کے بارے میں جب حضرت علامہ شیخ محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ نے ایک سوال مرتب کیا اور اس میں ان لوگوں کے کلام کے نمونے پیش کیے اور وہ مجلّہ: ''الحج'' میں شائع ہوا اور شیخ ابن باز رحمہ اللہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تو آپ نے اس کے جواب میں لکھا:

'' كل من تأمل تلک النماذج التي ذكرها المستفتي في استفتاء ه من عقائد غلام أحمد برويز وهي عشرون نماذجاً موضحة في الاستفتاء المنشور في المجلة المذكورة، كل من تأمل هذه النماذج من ذوى العلم والبصيرة يعلم علماً قطعياً لا يحتمل الشک بوجهٍ أن

(۱) فتاوى الشيخ ابن باز: ۶/۳۷۶

معتنقها و معتقدها والداعي اليها كافرٌ كفراً أكبرَ مرتدٌ عن الاسلام الخ."

(جو بھی شخص اس غلام احمد پرویز کے عقائد کے ان نمونوں پر غور کرے گا جن کو سائل نے ذکر کیا ہے اور وہ بیس نمونے ہیں جو مجلّہ مذکورہ میں استفتاء میں واضح انداز میں بیان کئے گئے ہیں، ان پر اہل علم و بصیرت حضرات میں سے جو بھی ان میں غور کریں گے وہ بلا کسی شک کے یقیناً جان لیں گے کہ ان عقائد کا ماننے ولا، ان کو قبول کرنے والا اور ان کی جانب لوگوں کو بلانے والا بہت بڑا کافر، اسلام سے مرتد ہے۔)(۱)

نیز سعودی عرب کے دارالافتاء "اللجنة الدائمة" سے منکر حدیث غلام احمد پرویز اور اس کے فرقے کے بارے میں تفصیلی سوال کیا گیا، تو وہاں سے شیخ بکر ابو زید، شیخ عبداللہ بن غیان، شیخ صالح الفوزان اور عبدالعزیز بن عبداللہ رحمہم اللہ آل الشیخ کے دستخطوں کے ساتھ ایک تفصیلی فتوی صادر کیا گیا، جس میں لکھا ہے:

"ان لوگوں کے عقائد پر اطلاع پانے کے بعد یہ بات واضح ہوئی کہ ان لوگوں نے متعدد گمراہیوں کو جمع کر لیا ہے جس میں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت سے انکار، حجیت سنت کا انکار اور یہ عقیدہ کہ شریعت کی بنیاد صرف قرآن ہے۔ اور ارکان اسلام میں قرآن وسنت و اجماع کے خلاف تحریف، جنت و دوزخ کا انکار، وجود آدم کا انکار، وغیرہ گمراہ کن عقائد و آرا جن کو اس جماعت نے اختیار کیا ہے اور لوگوں کو ان کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ اور ان عقائد میں سے ایک

(۱) فتاوی الشیخ ابن باز: ۳/۲۶۸

عقیدہ بھی اس جماعت کو اسلام سے نکل جانے اور مرتدوں سے مل جانے کے لیے کافی ہے تو ان سارے کفریات کو جمع کر لینے کا کیا حال ہوگا۔ لہٰذا جو شخص اس جماعت کی اتباع کرے گا یا اس کی جانب دعوت دیگا یا لوگوں کے لیے ذرائع ابلاغ میں سے کسی بھی طریقہ پر اس کو مزین کر کے پیش کرے گا وہ کافر، اسلام سے مرتد ہے۔''(۱)

نیز شیخ عبدالرزاق عفیفی رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ ''شبهات حول السنة'' میں لکھا ہے:

'' الحكم فيمن ردّ السنة جملةً أي كلها فهو كافر، فمن لم يقبل منها الا ما كان في القرآن فهو كافر؛ لأنه معارض للقرآن فهو كافر مناقض لآيات القرآن. فدعواه أنه يعمل بالقرآن عقيدةً وعملاً خلقاً ويرد السنة جملة – هذه الطائفة التي تسمي نفسها (القرآنية) دعوى باطلة''.

(جو شخص کلی طور پر سنت کا رد کرے وہ کافر ہے، پس جو شخص احادیث میں سے صرف ان احادیث کو قبول کرے جو قرآن میں موافق ہیں تو وہ کافر ہے؛ کیوں کہ وہ قرآن کا مخالف ہے؛ لہٰذا وہ کافر ہے؛ کیوں کہ وہ آیات قرآن کا مخالف ہے۔...... پس اس فرقے کا جو خود کو اہل قرآن کہتا ہے یہ دعوے کہ وہ قرآن پر عقیدہ، عمل و اخلاق کے لحاظ سے عمل کرتا ہے اور سنت کا رد کرتا ہے، اس کا یہ دعوے باطل ہے۔)(۲)

---

(۱) فتاوی اللجنة الدائمة مجموعه اولی: ۲۷/۱۱۷، مجموعه ثانیه: ۲/۱۱۸

(۲) شبهات حول السنة: ۴۱-۴۲

اور شیخ محمد صالح المنجد رَحِمَہُ اللہُ ایک فتوے میں منکرین حدیث جو اپنے کو اہل قرآن کہتے ہیں ان کے رد میں متعدد دلائل سے حجیت حدیث ثابت کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

" حكم من أنكر حجية السنة أنه كافر لانكاره ما هو معلوم من الدين بالضرورة."

(جو حجیت سنت کا انکار کرے اس کا حکم یہ ہے کہ وہ کافر ہے، کیونکہ وہ ضروریات دین کا انکار کرنے والا ہے۔)(۱)

اسی طرح حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رَحِمَہُ اللہُ نے ان کو خارج از اسلام و کافر قرار دیا ہے، وہ فرقۂ چکڑالویہ کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں لکھتے ہیں کہ جو شخص وہ عقائد رکھے جو فرقۂ چکڑالویہ کی کتابوں سے سوال میں ظاہر کیے گئے ہیں وہ بلا شبہ ملحد، زندیق اور کافر خارج از اسلام ہے؛ کیوں کہ وہ بہت سی ضروریات دین کا منکر ہے۔(۲)

قدیم و جدید منکرین حدیث کے مابین فرق

ایک بات یہاں یہ بھی ملاحظہ فرمائیں کہ قدیم زمانے میں جن جن لوگوں نے انکار حدیث کا نظریہ اختیار کیا تھا ان میں اور ان جدید منکرین حدیث جو خود کو اہل قرآن کہتے ہیں، ان میں ایک بہت بڑا فرق ہے، وہ یہ کہ قدیم منکرین حدیث نے احادیث کا انکار اس بنا پر کیا تھا کہ وہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم تک ان کی سند کو قابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے، خواہ اس لیے کہ سند کے راوی میں ان کو کلام تھا یا اس لیے

(۱) فتاوى الاسلام: ۱/۵۲۸۸

(۲) جواهر الفقه: ۱/۴۷

کہ ان کے خیال کے مطابق احادیث کی جمع وتدوین رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کے زمانے کے دوسو سال بعد ہوئی، یا اس وجہ سے کہ حدیث میں بیان کردہ بات ان کے نزدیک عقل کے معیار پر نہ اترنے کی وجہ سے وہ اس کو قول رسول نہیں سمجھتے تھے۔

الغرض ان میں سے کسی وجہ کی بنا پر وہ احادیث کو ناقابل اعتبار قرار دیتے تھے مگر ان میں سے سوائے غالی شیعہ کے کسی کے نزدیک رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی ذات اور فی ذاتہ آپ کے اقوال وافعال ناقابل حجت نہیں سمجھے جاتے تھے۔ بل کہ سب کے نزدیک آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم کی ذات تقدس مآب ومعصوم ومطاع سمجھی جاتی تھی۔ ہاں شیعہ کا ایک غالی فرقہ ایسا گزرا ہے جس کا عقیدہ یہ تھا کہ نعوذ باللہ حضرت محمد رسول اللہ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم اللہ کے نبی نہیں؛ بل کہ اصل رسول تو حضرت علی رَضِيَ اللهُ عَنْهُ تھے، اس فرقے نے البتہ آپ کو ناقابل حجت قرار دیا ہے اور اس میں کوئی بعد وتعجب بھی نہیں، کیوں کہ جب وہ آپ کو رسول نہیں مانتے تو حجت ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

علامہ سیوطی رَحِمَهُ اللهُ نے اپنے رسالہ "مفتاح الجنہ" کے ابتدائیہ میں لکھا ہے:

"وأصل هذا الرأي الفاسد أن الزنادقة و طائفة من غلاة الرافضة ذهبوا الى انكار الاحتجاج بالسنة والاقتصار على القرآن وهم في ذلک مختلفوا المقاصد فمنهم من يعتقد أن النبوة لعلي و أن جبريل أخطأ في نزوله الى سيد المرسلين، ومنهم من أقرّ للنبي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم بالنبوة ولكن قال: ان الخلافة كانت حقاً لعلي فلما عدل بها

الصحابة عنه الى أبي بكر ﷺ قال هؤلاء المخذولون لعنهم اللّٰه: كفروا حيث جاروا وعدلوا بالحق عن مستحقه وكفروا لعنهم اللّٰه علياً ﷺ أيضاً لعدم طلبه حقه فبنوا على ذلک رد الاحاديث كلها لأنها عندهم من رواية قوم كفار.''

(اس فاسد رائے کی اصل یہ ہے کہ زندیق لوگ اور روافض کا ایک غالی فرقہ حجیتِ سنت کے انکار اور قرآن پر اکتفاء کرنے کی طرف گئے ہیں اور وہ لوگ اس میں مقصد کے لحاظ سے آپس میں اختلاف رکھتے ہیں، بعض یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نبوت حضرت علی ﷺ کا حق ہے اور جبریل نے سید المرسلین کی جانب اس کو لانے میں غلطی کردی اور بعض حضور کے لیے نبوت کا اقرار تو کرتے ہیں کہ؛ لیکن یہ کہتے ہیں کہ خلافت حضرت علی ﷺ کا حق تھا، پس جب صحابہ نے خلافت حضرت علی ﷺ کے بجائے حضرت ابوبکر ﷺ کو دے دی تو یہ رسوا لوگ (اللہ ان پر لعنت کرے) یہ کہتے ہیں کہ: صحابہ سب کافر ہوگئے؛ کیوں کہ انھوں ظلم کیا اور حقدار کے حق سے اعراض کیا اور حضرت علی ﷺ کو بھی انھوں نے کافر قرار دیا؛ کیوں کہ انھوں نے اپنا حق طلب نہیں کیا اور اسی بنیاد پر وہ احادیث کا رد کرتے ہیں کہ یہ ان کے نزدیک کافر قوم (یعنی صحابہ) کی روایات سے ہیں۔)(۱)

الغرض سوائے اس غالی شیعہ فرقے کے کسی نے بھی مطلقا حجیت حدیث کا انکار

(۱) مفتاح الجنة: ٦

نہیں کیا؛ لیکن منکرین حدیث کے اس جدید فرقہ ''اہل قرآن'' نے ایک طرف یہ بھی ماننے کا دعوی کیا کہ آپ ﷺ اللہ کے رسول ہیں اور دوسری جانب اس نے یکسر آپ کی ذات ہی کو نا قابل حجت اور آپ کی احادیث وسنن کو عام لوگوں کی باتوں کی طرح قرار دیا ہے۔ بالفاظ دگر اگر احادیث معتبر سند سے بھی ثابت ہوں اور روز اول سے محفوظ بھی ہونا ثابت ہو اور اس کی تدوین کا رسول ہی کے زمانے سے ہونا ثابت کر دیا جائے تب بھی ان کے نزدیک اس لیے سنت وحدیث نا قابل اعتبار و احتجاج ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات کوئی حجت نہیں، نہ آپ کے اقوال وافعال حجت شرعیہ ہیں؛ بل کہ جیسا کہ اوپر نقل کر چکا ہوں ان کے نزدیک رسول کی بات کا ماننا شرک فی الحکم ہے اور یہ کہ اللہ نے صرف قرآن ہی نبی پر اتارا ہے، اس کے علاوہ کوئی چیز نہیں اتاری۔

یہاں ایک ایک مثال اس سلسلے میں نقل کرتا ہوں۔ عبد اللہ چکڑ الوی اور حافظ اسلم جیراجپوری کہتے ہیں:

> ہمیں صرف وحی کے ذریعے جو اللہ نے نازل کیا، اس کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے اور اگر بالفرض رسول اللہ ﷺ تک بعض احادیث کی نسبت قطعی طور پر بھی ثابت ہو جائے تو وہ صحیح ہونے کے باوجود واجب الاتباع نہیں؛ کیوں کہ وہ اللہ کی وحی سے نہیں ہیں۔ (۱)
>
> اور عبد اللہ چکڑ الوی کہتا ہے کہ: کتاب اللہ کے موجود ہوتے ہوئے رسولوں کے اقوال وافعال وتقریرات پر لوگوں کو ابھارنا ایک قدیم بیماری ہے اللہ نے اپنے رسولوں وانبیاء کو ان حدیثوں سے بری کیا ہے بلکہ ان

---

(۱) خلاصہ: از اشاعة السنة: بابت ۱۹۰۲، و مقام حدیث: ۱۳۹

احادیث کو کفر و شرک قرار دیا ہے۔ (۱)

اور خواجہ احمد الدین رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر ''بیان للناس'' میں لکھا ہے جس کا خلاصہ یہ کہ: لوگوں نے شرک کو زندہ کرنے کے مختلف طریقے ایجاد کر لئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ ہم ایمان رکھتے ہیں کہ اصل مطاع تو اللہ ہی ہے مگر اللہ ہی نے رسول کی اتباع کا حکم دیا ہے، لہٰذا اس کی اطاعت بھی اصل کی اطاعت ہے، اس فاسد دلیل سے وہ لوگ شرک کی تمام قسموں کو صحیح کہتے ہیں۔ (۲)

اس سے قدیم و جدید منکرین حدیث کے نقطۂ نظر میں فرق روز روشن کی طرح عیاں ہے، جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس فرقے سے کلام و بحث کے موضوعات وہ نہیں ہیں جو قدیم منکرین حدیث سے کلام کے موضوعات ہیں، مثلاً تدوین حدیث کب ہوئی؟ حدیث میں صحیح و غلط احادیث کے مختلط ہونے یا ہونے کے بحث وغیرہ، بلکہ ان لوگوں سے صرف دو موضوعات پر کلام ہونا چاہئے: ایک تو مقام رسالت کے بارے میں اور دوسرے حدیث کے وحی ہونے کے بارے میں؛ کیونکہ ان لوگوں نے اصل نشانہ انہی دو امور کو بنایا ہے، باقی امور تو محض وقت گزاری اور اپنے مخاطب کو الجھانے کے لئے چھیڑے جاتے ہیں۔

انکار حدیث سے تشکیک فی القرآن تک

اور اس پوری کارروائی و جانفشانی سے اصل مقصد یہ نہیں ہے کہ قرآن کی عظمت و برتری ثابت کی جائے، اس کی صداقت و سچائی کو آشکارا کیا جائے اور اس کے احکامات و تعلیمات کی تعمیل کی جائے، بلکہ اس سے ان لوگوں کا اصل ہدف یہ تھا اور ہے کہ رسول سے حق تفسیر و تشریح چھین کر خود اس پر قبضہ جمالیں، پھر آیات قرآنیہ میں

(۱) خلاصہ: مباحثہ: ۴۲

(۲) تفسیر بیان للناس: ۲/۳۹۵

حسب موقعہ و مرضی رنگ آمیزی جائے ، من مانی تفسیر وتشریح کے ذریعے جو جی میں آئے اس کو ''مراد ربانی'' کے عنوان سے پیش کر دیا جائے ،قرآنی احکامات وتعلیمات کو نفس و مرضی کے تابع کر دیا جائے اور اس طرح قرآن کو بھی مشکوک بنا دیا جائے۔

سر سید احمد خان نے جن و ملائک کی تفسیر اچھی بری قوتوں سے کر دی اور جن و ملائک کے حقیقی وجود سے انکار کر دیا، جبریل کی تفسیر ملکۂ نبوت سے کر دیا، آسمان کی تفسیر دخان سے کر دی ، وغیرہ ۔اسی طرح ان منکرین حدیث کا کہنا ہے کہ نمازیں صرف دو ہیں، باقی سب نوافل ۔(۱)

غلام احمد پرویز کہتا ہے کہ قربانی کا کوئی ثبوت نہیں ، حج میں قربانی کا مقصد حج میں شرکت کرنے والوں کے خورد ونوش کا انتظام ہے ۔اور اس کے علاوہ جو قربانی ہوتی ہے اس میں عید کے دن دس کروڑ روپے کا قومی سرمایہ ضائع ہوتا ہے۔(۲)

بعض کہتے ہیں کہ صرف مردار، بہتا خون ،خنزیر اور غیر اللہ کے نام کی طرف منسوب چیزیں حرام ہیں ،ان کے علاوہ کچھ حرام نہیں ۔ بلکہ محمد صبیح اڈوکیٹ لکھتا ہے کہ مذکورہ چار چیزوں کے علاوہ باقی چیزوں کا کھانا فرض ہے۔(۳)

نیز یہ لوگ معجزات وکرامات کا انکار کرتے ہیں ،عذاب قبر کا انکار کرتے ہیں اور جنت و دوزخ کے بارے میں مختلف الخیال ہیں ۔کوئی ان کو موجود کہتا ہے اور کوئی یہ کہتا ہے کہ فی الحال یہ موجود نہیں ،اور کوئی کہتا ہے کہ یہ تمثیلی چیزیں ہیں ،اور کوئی ان کو روحانی چیزیں کہتا ہے۔

یہ سب دراصل اسی لئے ہے کہ قرآن کے معانی ومفاہیم کو اپنے نفس وخیال کے

---

(۱) طلوع اسلام: جون ۱۹۵۰ء

(۲) قرآنی فیصلے

(۳) طلوع اسلام: جون ۱۹۵۲ء

تابع کردیا جائے، اور اسلام کی وہ تشریح وتفسیر پیش کی جائے جو سامراجی طاقتوں اور اپنے مغربی ویورپی آقاؤں کی خواہش کی مطابق ہو اور یہ کام اس وقت ممکن نہ تھا جب حدیث پیش نظر ہوتی، لہٰذا حدیث ہی کو غیر معتبر ومشکوک قرار دیدیا۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کا مسلک نہ قرآن ہے، نہ حدیث، بلکہ ان کا مسلک وہ ہے جو اس شعر میں پیش کیا گیا ہے:

سدا ایک ہی رخ نہیں ناؤ چلتی
چلو تم ادھر کو، ہوا ہو جدھر کی

اور اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ اس فتنہ کی پشت پر مادی فوائد ومصالح، دنیوی اغراض ومنافع اور اس عالم ناپائیدار کی دلفریبیاں اور رنگینیاں پوری طرح کام کررہی تھیں۔

ان لوگوں نے قرآن کی من گھڑت تفسیر وتوضیح کی، خود کو بدلنے کے بجائے قرآن ہی کو بدل ڈالنے کی ناکام کوشش کی اور اس فتنے کے علمبرداروں سے اس سلسلہ میں انتہائی مضحکہ خیز باتیں صادر ہوئیں، یہاں بطور نمونہ ایک دو امور نقل کرتا ہوں:

۱- قرآن پاک میں حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کے واقعات میں فرمایا گیا ہے:

﴿وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ﴾ (البقرۃ: ٦٠)

(اور جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا تو ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی پتھر پر مارو، پس اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے، ہر ایک نے اپنا مشرب پہچان لیا، اللہ کے رزق میں سے کھاؤ اور پیو اور زمین میں فساد مچاتے نہ پھرو۔)

اس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ایک معجزے کا ذکر ہے کہ جب اللہ کے حکم سے انھوں نے پتھر پر لاٹھی ماری تو اس سے بارہ چشمے جاری ہو گئے، اب سنئے اس کی وہ تفسیر جس میں محض اپنی عقل و سمجھ کا من مانے طور پر استعمال کیا گیا ہے، سر سید نے لکھا ہے کہ:

''اس مقام (مرہ) کے پاس پہاڑیاں ہیں، جن کی نسبت خدا نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ **''فاضرب بعصاک الحجر''** یعنی اپنی لاٹھی کے سہارے چڑھ چل، اس پہاڑی کے پرے ایک مقام ہے جس کو توریت میں ایلم لکھا ہے وہاں بارہ چشمے پانی کے جاری تھے، جس طرح پہاڑی ملک میں پہاڑیوں کی جڑ یا چٹانوں کی دراروں میں سے جاری ہوتے ہیں، جن کی نسبت خدا نے فرمایا کہ **''فانفجرت منی اثنتا عشرۃ عینا''** یعنی اس سے پھوٹ نکلے ہیں بارہ چشمے۔''(۱)

یعنی یہ معجزہ نہیں تھا اور نہ پتھر پر مارنے کا حکم تھا، نہ مارا گیا تھا، نہ اس مارنے سے چشمے نکلے تھے؛ بل کہ ''اِضْرِبْ'' کے معنے چڑھنے و چلنے کے ہیں اور پہاڑوں پر چڑھنے کا حکم تھا جہاں پہاڑوں پر پہلے سے چشمے موجود تھے۔ یہ سب دراصل معجزات کے انکار کا راستہ ہے۔

۲-قرآن کریم میں آیت آئی ہے:

---

(۱) تفسیر القرآن سر سید

﴿ قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ ، مَنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ، اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ﴾

(اے نبی! کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ تمہاری سماعت اور بصارت کو سلب کرلے اور تمہارے دلوں پر مہر لگادے تو اللہ کے سوا کون معبود ہے جو تمہیں یہ قوتیں لادے گا، دیکھئے ہم کس طرح بار بار نشانیاں بیان کرتے ہیں، پھر بھی یہ لوگ ان سے آنکھیں چراتے ہیں۔)

اس آیت کا مضمون ومفہوم بالکل واضح ہے؛ مگر جب ان لوگوں نے ایک خاص ذہنیت سے احادیث کے انکار پر اپنے مسائل وافکار کی بنیاد رکھی اور خود ساختہ مطالب قرآن سے اخذ کرنا چاہا تو انتہائی مضحکہ خیز باتیں ان کے قلم وزبان سے صادر ہونے لگیں، لیجیے ایک نمونہ ملاحظہ کیجئے:

عبداللہ چکڑالوی نے ''برہان الفرقان'' میں اسی آیت قرآنی سے خود ساختہ نماز میں تکبیر تحریمہ کے وقت کان پکڑنے کا حکم اسی آیت سے اخذ کیا اور آیت کا مطلب اس طرح بیان کیا ہے:

''اے پیغمبر! (جو لوگ کانوں، آنکھوں اور دلوں کو نماز میں حقیر وذلیل نہیں کرتے یعنی کانوں کو نہیں پکڑتے، آنکھوں کو ادھر ادھر دیکھنے سے نہیں روکتے اور دل میں خوف ربی نہیں رکھتے ان سے) کہہ دو کہ سوچ سمجھ کر بتاؤ کہ اگر اللہ تمہارے کان پکڑے (بڑے کردے) اور تمہاری آنکھیں (مٹادے) اور تمہارے دلوں پر بندش کردے تو سوائے خدا کے تمہارا کوئی بزرگ ہے جو تم کو یہ چیزیں لادے (پس

جب کوئی ایسا نہیں تو بہتر ہے کہ تم خود ہی نماز میں اپنے کان پکڑا کرو، آنکھوں کو ادھر ادھر دیکھنے سے روکا کرو، دل میں خدا کا خوف رکھوتا کہ خدا تمہارے کان نہ پکڑے، آنکھیں نہ مٹادے، دلوں پر بندش نہ کردے۔)(۱)

۳- اس سلسلے کا ایک اور نمونہ دیکھتے چلیے: آیت قرآنی ہے:

﴿ اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ جَاعِلِ الۡمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا اُولِيۡۤ اَجۡنِحَةٍ مَّثۡنٰى وَ ثُلٰثَ وَ رُبٰعَ يَزِيۡدُ فِي الۡخَلۡقِ مَا يَشَآءُ ﴾

(تمام تعریفیں اللہ کے لیے سزاوار ہیں جو آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے اور جو دو دو، تین تین چار چار پروں والے فرشتوں کو اپنا پیغام بر بنانے والا ہے، وہ مخلوق میں جو چاہتا ہے زیادہ کرتا ہے۔)

اس کی تفسیر عبداللہ چکڑالوی کی زبانی سنئے:

''پڑھا کرا ے ہر ایک اہل زمین و آسمان) الحمد (یعنی پانچوں نمازوں میں) واسطے راضی کرنے اللہ کے، کیوں کہ وہ فطرت پاک پیدا کرنے والا ہے، تم تمام آسمان والوں (فرشتوں) کی اور تم تمام روئے زمین والوں (جن وانس) کی (چوں کہ تم فطرت اللہ میں تغیر وتبدل کرتے رہتے ہو اس لیے نمازیں پڑھتے رہا کرو تا کہ جبر نقصان ہوتا رہے اور اللہ وہ ہے) جو کرنے والا ہے اپنے فرشتوں کو رسول تمہاری طرف جو لانے والے تمہاری صلوٰتوں یعنی رکعتوں کے ہیں جن کا حق

(۱) برهان الفرقان: ۲۹۲

یہ ہے کہ وہ دو دو بار ادا کی جائیں اور تین تین بار اور چار چار بار مطابق تعلیم کتاب اللہ (یعنی جس وقت کی اللہ نے دو رکعتیں مقرر کردی ہیں اس کی دو پڑھو، جس کی تین فرمائی ہیں اس کی تین ادا کرو، جس کی چار معین کی ہیں اس کی چار پڑھو) اس سے اللہ جبر و نقصان کرنا چاہتا ہے تمہاری تبدیل شدہ فطرت کا جس قدر انسان چاہتا ہے (یعنی جس قدر نماز میں توجہ و خشوع کرتا ہے۔''(۱)

ظاہر ہے کہ یہ سب من مانی تفاسیر اس وقت متصور نہیں تھیں، جب بیان رسول و سنت رسول سامنے ہوتے اور قرآن کے معانی و مفاہیم کے تشریح کو اس کے تابع کیا جاتا۔ لہٰذا جب ان لوگوں نے قرآن پاک کو تختۂ مشق بنایا اور اپنی عقل و رائے اور نفس و خیال کی ہزلیات کو قرآن کے معانی و مفاہیم کی حیثیت سے پیش کرنا چاہا تو اس کے لیے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں تھا کہ حدیث رسول و بیان نبوت کو بیچ سے ہٹا دیا جائے۔

مقام رسالت قرآن کی نظر میں

اب میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ منکرین حدیث سے اصل بحث اس پر ہونا چاہئے کہ مقام نبوت و رسالت کیا ہے اور یہ کہ وحی الٰہی قرآن میں منحصر نہیں ہے۔ انہی دو امور پر ان کے تمام دعاوی و شبہات کی تردید کا دار و مدار ہے۔ پہلے یہ دیکھئے کہ منکرین حدیث کے نزدیک رسالت کا مقام کیا ہے؟ ان کے نزدیک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت محض ایک ایلچی و پیغام رساں کی ہے، اس سے زائد آپ کو کوئی حیثیت حاصل نہیں حتی کہ تشریح و بیان قرآن بھی ان کے نزدیک آپ کے مناصب میں سے نہیں ہے۔

---

(۱) برھان الفرقان: ۳۴۱

چنانچہ محمد اسلم جیراجپوری کی یہ عبارت نقل کر چکا ہوں:

''رسول کی اطاعت بحکم الٰہی اور بحیثیت منصب رسالت فرض ہے ......اور بحیثیت منصب رسالت رسول کا فریضہ صرف پیغام الٰہی کی تبلیغ ہے اور بس۔ ......اس لیے رسول کی اطاعت کا مفہوم یہ ہوا کہ اللہ کا پیغام جو وہ لایا ہے اس پر عمل کیا جائے؛ لہٰذا رسول کی اطاعت بعینہ اللہ کی اطاعت ہوئی، ...... ہمارے رسول صرف اللہ کی کتاب یعنی قرآن کے مبلغ تھے۔ (۱)

اور اس کی وجہ ان لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو لوگوں سے الگ کوئی خاص بات حاصل نہیں تھی، جس کی وجہ سے آپ کی بات مانی جائے اور آپ کے بیان و تفسیر کو کوئی مقام دیا جائے اور آپ کے ارشادات کی کوئی حیثیت قرار دی جائے۔

چناں چہ منکر حدیث مولوی احمد الدین امرتسری رَحِمَہُ اللّٰہُ لکھتا ہے:

''اگر رسول خدا میں فطرت الناس سے کوئی جدا فطرت تھی یا حضور میں کوئی خاص قوت یا سمجھ یا باریک بینی ایسی تھی جو قیامت تک دوسرے بشروں کو نہیں مل سکتی تو حضور کا یہ فرمایا کہ- میں تمہارے جیسا بشر ہوں، اگر میں نے قرآن مجید کو خود بنا لیا ہے تو تم بھی اس کی مثل بنا سکتے ہو''- بالکل غلط ہو جاتا ہے۔''(۲)

نیز کہتا ہے کہ: پس سورج کی طرح روشن ہے کہ رسول خدا کی وہی فطرت تھی

---

(۱) تعلیمات قرآن: ۱۵۵

(۲) برھان القرآن: ۱۴۵

جس پر خدا تعالیٰ نے تمام آدمیوں کو پیدا کیا ہے اور آپ کی وہی عقل تھی جو دوسرے بشروں کو مل سکتی تھی۔ (۱)

لیکن یہ نظریہ حقیقت سے اس قدر دور ہے کہ کوئی عقل کا دشمن ہی اس کو قبول کرے گا۔ کیوں کہ اگر رسول میں کوئی خوبی وکمال عام لوگوں کی فطرت سے زائد نہیں ہوتا اور وہ محض ایک عام آدمی کی طرح ہوتا ہے تو قرآن کریم و پیغام الٰہی کے اس پر اتارنے کی کیا وجہ ہے؟ پھر خود قرآن کریم نے آپ کے لیے جن مناصب ومقامات کا ذکر کیا ہے اس کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟

یہاں میں علامہ سید سلیمان ندوی کا ایک اقتباس نقل کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''اس سلسلہ میں ہمیں ایک اور غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو بعضوں کو حضور کی صفت تبلیغ کے سمجھنے میں پیش آئی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیتیں اس معنی کی آئی ہیں کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچا دینا (ابلاغ) ہے، اس سے آج کل کے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا کہ رسول کا فرض صرف وحی الٰہی کی تبلیغ ہے یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو بعینہٖ انسانوں تک پہنچا دیا اس کا کام ہے...... اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے نہ اس کا اس کو حق ہے، ان کے نزدیک مبلغ رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے جو ایک جگہ سے دوسری جگہ خط تو پہنچا دیتا ہے؛ مگر اس خط کے مفہوم ومعنی کی تشریح کا اس کو حق نہیں ہوتا؛ بل کہ اس کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ اس بند

---

(۱) برھان القرآن: ۱۴۶

لفافہ میں کیا ہے۔شاید ان کو یہ دھوکا اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے بھی ہوا ہے جس کے لفظی معنی پیغمبر اور قاصد کے ہیں؛ لیکن وہ لوگ یہ خیال نہیں کرتے کہ جہاں اس کو رسول کہا گیا ہے، نبی (خبر دینے والا) بھی کہا گیا ہے، مبشر (خوش خبری سنانے والا) نذیر (ڈرانے والا) سراج منیر (روشن کرنے والا چراغ) صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، مجتبیٰ (مقبول) مصطفیٰ (برگزیدہ) مبین (شرح کرنے والا) معلم (سکھانے والا) مزکی (پاک وصاف کرنے والا) داعی الی اللہ (اللہ کی طرف بلانے والا) حاکم (فیصلہ کرنے والا) مطاع (واجب الاطاعت) آمر (حکم دینے والا) اور ناہی (روکنے والا) بھی تو کہا گیا ہے۔کیا یہ اوصاف و القاب اس کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ صرف ایک پیغام پہنچانے والا قاصد ہے جس کو اصل پیغام کے مفہوم ومعنی سے ایک معمولی قاصد اور نامہ بر کی طرح کوئی سروکار نہیں۔"(۱)

اس اجمال کے بعد میں مقام رسول کے سلسلہ میں ایجاز کے ساتھ ذرا سی تفصیل پیش کر دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں۔ قرآن میں ایک جگہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ:

﴿ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکَ الذِّکْرَ لِتُبَیِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَیْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ یَتَفَکَّرُوْنَ﴾ (النحل: ۴۴)

(اور ہم نے آپ کی جانب ذکر یعنی قرآن نازل کیا تا کہ آپ

---

(۱) سیرت النبی: ۴/ ۱۰۸

لوگوں کے لیے واضح طور پر بیان کریں وہ جو ان کی جانب نازل کیا گیا ہے اور اس لیے تاکہ وہ غور وفکر کریں۔)

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی تفسیر وتشریح، تبیین وتوضیح آپ کی ذمہ داری تھی، اور اس منصب پر آپ کو متمکن کیا گیا تھا، لہٰذا آپ کا یہ حق نہ ماننا قرآن کا انکار وتردید ہے۔

اور اس سے آگے بڑھ کر قرآن نے کہا کہ:

﴿لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ (آل عمران: ۱۶۴)

(تحقیق کہ اللہ نے مسلمانوں پر احسان کیا کہ انہی میں سے ایک رسول برپا کیا جو ان کو اس کی آیات پڑھ کر سناتا ہے اور ان کی نفوس کی اصلاح کرتا ہے اور کتاب اللہ وحکمت کی تعلیم دیتا ہے اگر چہ کہ وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔)

اسی طرح کا مضمون قرآن میں اور جگہ بھی آیا ہے، ان آیات میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چار مناصب بتائے گئے ہیں: تلاوت آیات، تزکیہ، تعلیم کتاب، اور تعلیم حکمت، منکرین حدیث ان میں سے صرف ایک مانتے ہیں اور وہ ہے تلاوت آیات، باقی تین مناصب کو نہیں مانتے، کیا یہ انکارِ قرآن نہیں؟ اور یہ کہنا کہ تعلیم کتاب وحکمت سے بھی یہی ابلاغ آیات مراد ہے، عقل وفہم کی رسوائی کا سامان ہے، پھر یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اس میں تعلیم کتاب کے ساتھ تعلیم حکمت کا بھی ذکر ہے جو یقیناً تعلیم کتاب سے الگ دوسرا کام ہے، اور وہ یہی سنت وسیرت کی تعلیم ہے اس سلسلے میں ایک اور آیت اس سے بھی واضح المراد ہے اور وہ ہے:

﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا﴾ (الأحزاب: ۳۴)

(اور (اے نبی کی عورتوں!) یاد کرنا وہ چیز جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات وحکمت میں سے تلاوت کی جاتی ہے، بلا شبہ اللہ تعالی بڑے رحیم وباخبر ہیں۔)

اس میں ازواج مطہرات کو اللہ کی آیات کے ساتھ حکمت کے یاد کرنے کے لیے حکم دیا گیا ہے اور اس میں حکمت کو بھی پڑھی جانے والی چیز قرار دیا ہے۔ اور یہ بات واضح ومسلم ہے کہ ازواج کے گھروں میں جو چیز پڑھی جاتی تھی وہ قرآن و حدیث ہی تھی؛ لہٰذا اس سے معلوم ہوا کہ وہ حکمت دراصل اللہ کے رسول کی حدیث وسنت ہے۔ لہٰذا رسول اللہ ﷺ کا منصب صرف ابلاغ وتبلیغ نہیں ؛ بلکہ مذکورہ دیگر امور بھی آپ کے مناصب ہیں اور اس میں حدیث وسنت کی تعلیم بھی داخل ہے۔

اسی کے ساتھ یہ بھی ملاحظہ کیجیے کہ ایک آیت میں ارشاد ربانی ہے کہ:

﴿اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰةِ وَالْاِنْجِيْلِ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الأعراف: ۱۵۷)

(وہ لوگ جو اس رسول نبیء امی کا اتباع کرتے ہیں، جس کو وہ

(یہود و نصاری) تورات و انجیل میں لکھا پاتے ہیں، وہ رسول ان کو بھلائی کا حکم دیتا اور برائی سے منع کرتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال کرتا اور خبیث چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان سے بوجھ کو ہٹاتا اور بیڑیوں کو نکالتا ہے جو ان پر ہیں، پس جو لوگ اس پر ایمان لائے اور اس کی مدد و نصرت کی اور اس نور یعنی قرآن کا اتباع کیا جو اس کے ساتھ نازل کیا گیا ہے وہی لوگ کامیاب ہیں۔)

اس میں آپ کو حکم دینے والا اور منع کرنے والا، حلال کرنے والا اور حرام کرنے والا کہا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب صرف ابلاغ نہیں تھا؛ بل کہ من جانب اللہ امر و نہی، تحلیل و تحریم بھی آپ کا منصب تھا؛ لہٰذا اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے سوا کسی اور چیز کو حرام یا حلال قرار دیں تو یہ دراصل اللہ کے حکم و اذن کی وجہ سے کرتے ہیں اور یہ بات قرآن کے خلاف نہیں؛ بل کہ عین قرآن کے مطابق ہے۔

ان آیات قرآنیہ نے بالکل دوٹوک انداز میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام و مرتبہ اور آپ کی حیثیت و منزلت اور آپ کے عہدے و مناصب پر روشنی ڈال دی ہے، جس سے کسی غلط فہمی یا بدفہمی کا اندیشہ نہیں، الا یہ کہ کوئی خود کو عقل و فہم سے دور کرلے اور مجرمانہ حماقت کا از خود مرتکب ہو جائے۔

حدیث بھی وحی الٰہی ہے

اس کے بعد اب ان کا دوسرا دعوی لیجئے، کہ قرآن ہی وحی الٰہی ہے۔ یہ بھی ایک ایسا دعوی ہے جو خود قرآن سے ٹکراتا ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا

یَنۡطِقُ عَنِ الۡهَوٰى اِنۡ هُوَ اِلَّا وَحۡىٌ یُّوۡحٰى﴿ (النجم: ۱-۴)

(قسم ہے ستارے کی جب وہ غائب ہو جائے کہ تمہارے ساتھی یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ تو گمراہ ہوئے اور نہ بھٹکے اور نہ کوئی بات اپنی مرضی سے کہی، وہ تو بس وہی ہے جو وحی کی گئی۔)

یہ آیات پوری صفائی کے ساتھ اس بات کا اعلان کر رہی ہیں کہ اللہ کا نبی اپنی جانب سے کچھ نہیں کہتا، وہ جو بھی کچھ کہتا ہے وہ دراصل اللہ کی جانب سے کی جانے والی وحی ہوتی ہے۔ اس میں "ما ینطق" عام ہے جو آپ کے ہر قول پر صادق آتا ہے۔

اس کے علاوہ حدیث کے وحی الٰہی ہونے پر اور بھی متعدد دلائل ہیں، ان میں سے چند یہ ہیں:

۱- قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿ سَیَقُوۡلُ الۡمُخَلَّفُوۡنَ اِذَا انۡطَلَقۡتُمۡ اِلٰى مَغَانِمَ لِتَاۡخُذُوۡهَا ذَرُوۡنَا نَتَّبِعۡكُمۡ یُرِیۡدُوۡنَ اَنۡ یُّبَدِّلُوۡا كَلٰمَ اللّٰهِ قُلۡ لَّنۡ تَتَّبِعُوۡنَا كَذٰلِكُمۡ قَالَ اللّٰهُ مِنۡ قَبۡلُ فَسَیَقُوۡلُوۡنَ بَلۡ تَحۡسُدُوۡنَنَا بَلۡ كَانُوۡا لَا یَفۡقَهُوۡنَ اِلَّا قَلِیۡلًا﴾ (الفتح: ۱۵)

(جب تم لوگ غنیمتیں لینے چلو گے تو کہیں گے پیچھے رہ جانے والے کہ ہم کو بھی تمہارے ساتھ چلنے دو، یہ لوگ اللہ کے کلام کو بدل دینا چاہتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ہمارے ساتھ نہیں چل سکو گے، اللہ نے اسی طرح پہلے سے کہہ دیا ہے، پس یہ لوگ کہیں گے کہ: بل کہ تم ہم سے حسد کر رہے ہو، بات یہ ہے کہ یہ لوگ سمجھتے ہی نہیں؛ مگر بہت کم۔)

حسبِ مفسرین کرام اس آیت میں سفر حدیبیہ میں نہ چلنے والوں کا ذکر ہے، اور

یہ بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ حدیبیہ میں تو شریک نہیں ہوئے ؛ مگر مالِ غنیمت کی طمع وحرص میں غزوۂ خیبر میں شریک ہونے کی درخواست کریں گے ؛ مگر یہ ان کے لیے ممکن نہیں ہوگا ؛ کیوں کہ اللہ نے پہلے ہی بتا دیا ہے کہ خیبر کی غنیمتیں اہل حدیبیہ ہی کے ساتھ خاص ہیں، دوسرے لوگ اس میں شریک نہیں ہو سکتے ؛ لہٰذا ان کا غزوۂ خیبر میں شریک ہونا گویا اللہ کے مذکورہ کلام میں ردو بدل کرنا ہے۔اب یہاں قابل غور امر یہ ہے کہ یہ بات کہ غزوۂ خیبر کے غنائم اہل حدیبیہ کے لیے مخصوص ہیں، یہ کس جگہ قرآن میں آیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ کہیں بھی قرآن میں اس کا ذکر نہیں ہے کہ خیبر کے غنائم اہل حدیبیہ کے لئے مخصوص ہیں ؛ مگر اس کے باوجود اس بات کو قرآن نے قال اللہ وکلام اللہ سے تعبیر کیا ہے، کیوں؟ اس لئے کہ یہ بات اللہ کے نبی نے اللہ کے حکم سے لوگوں کو بتائی تھی، لہٰذا اللہ کے حکم سے نبی کا بتانا بھی قال اللہ ہی کی ایک صورت ہے، معلوم ہوا کہ قرآن کے سوا بھی وحی الٰہی ہوتی ہے۔

۲- حدیث کے وحی الٰہی ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِيْ كُنْتَ عَلَيْهَآ اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَّتَّبِعُ الرَّسُوْلَ مِمَّنْ يَّنْقَلِبُ عَلٰى عَقِبَيْهِ﴾ (البقرۃ : ۱۴۳)

(اور نہیں مقرر کیا ہم نے اس قبلہ کو جس پر تم اب تک تھے مگر اس لئے تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون الٹے پاؤں لوٹ جاتا ہے۔)

اس میں مسلمانوں کے قبلۂ اول بیت المقدس کو بھی اللہ نے اپنی جانب سے مقرر کرنے کا ذکر کیا ہے ؛ مگر قرآن میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ بیت المقدس کو

اللہ نے قبلہ مقرر کیا؛ بل کہ یہ اللہ کے نبی نے مقرر کیا تھا، اس کے باوجود اس کو اللہ تعالیٰ نے یوں تعبیر کیا کہ ''ہم نے اس قبلہ کو مقرر کیا''۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حدیث رسول بھی خدا کی وحی سے ہی ہوتی ہے۔

۳- اس کی تیسری دلیل یہ ہے کہ قرآن کہتا ہے:

﴿مَا قَطَعْتُمْ مِّنْ لِّيْنَةٍ اَوْ تَرَكْتُمُوْهَا قَائِمَةً عَلٰى اُصُوْلِهَا فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيُخْزِيَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (الحشر: ۴)

(جو کھجور کے درخت تم نے کاٹ ڈالے یا جوان کی جڑوں پر رہنے دیا وہ اللہ کے حکم سے تھا، اور تا کہ فاسقوں کو رسوا کرے۔)

اس آیت میں یہودیوں کے قبیلہ بنو نضیر کی جلاوطنی کے موقعہ پر پیش آنے والے ایک واقعہ کو اللہ تعالیٰ نے اپنی جانب منسوب کیا ہے اور اس کا بہ حکم خدا واقع ہونا بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ بعض حضرات صحابہ نے اس موقعہ پر بنو نضیر کے باغات و کھیتیوں کو جلا دیا تھا اور بعض نے اس کو چھوڑ دیا تھا، اس آیت میں ان دونوں باتوں کو ''باذن اللہ'' ہونا قرار دیا ہے۔ حالاں کہ کہیں بھی قرآن میں بنو نضیر کے باغات و کھیتیوں کو جلانے یا نہ جلانے کا کوئی حکم نہیں ہے اور ظاہر یہی ہے کہ یہ کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم و اجازت سے ہوا تھا، اس کو اللہ تعالیٰ نے جب اپنی جانب منسوب کیا ہے تو اس سے صاف و صریح یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ حکم رسول بھی دراصل اللہ ہی کا حکم ہے اور حدیث رسول بھی وحی الٰہی ہے۔

۴- ایک اور دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَائِكُمْ﴾

(البقرۃ: ۱۸۶)

(حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے روزے کی راتوں میں اپنی عورتوں سے ملنا۔)

اسلام میں پہلے یہ حکم تھا کہ روزے کی راتوں میں بھی اپنی بیوی سے جماع حرام ومفسد صوم ہے، بعد میں اس حرام کو حلال قرار دے دیا گیا، اسی حکم حلت کا اس آیت میں ذکر ہے اور کہا گیا کہ تمہارے لیے روزے کی راتوں میں اپنی بیویوں سے ملنا حلال کر دیا گیا۔ اب امر غور طلب یہ ہے کہ کس آیت قرآن نے اولا اس جماع کو حرام قرار دیا تھا؟ حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی کسی آیت میں اس حرمت کا ذکر نہیں ہے؛ بل کہ یہ نبی کریم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے کہنے سے حرام ہوا تھا، اس کو اب قرآن میں حلال قرار دیا جا رہا ہے۔ اگر یہ حکم حرمت جو رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے دیا، اللہ کا حکم نہیں تھا تو اب حلال کرنے کا کیا مطلب؟ معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے نبی کے اس حکم حرمت کو تسلیم کیا اور پھر اس کو منسوخ کر کے حلت کا حکم دیا ہے۔

۵- اس سلسلے کی ایک اہم دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کے واقعہ قربانی میں نقل کیا ہے:

﴿فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ قَالَ يٰبُنَيَّ اِنِّيْ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْ أَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (الصافات: ۱۰۲)

(پس جب وہ (اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام) ان کے ساتھ یعنی ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کے ساتھ چلنے پھرنے کی عمر کو پہنچے تو انھوں نے کہا کہ اے بیٹا! میں خواب میں تجھ کو ذبح کر رہا تھا دیکھو کہ تمہاری کیا رائے ہے؟ کہا کہ اے ابا! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس کو کر گزریے، آپ مجھے ان شاء

اللہ صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔)

اس میں ہے کہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام کو یہ خبر دی کہ میں نے خواب میں دیکھا کہ میں تجھے ذبح کررہا ہوں تو بیٹے نے جواب میں کہا: "افعل ما تؤمر" کہ جو حکم آپ کو دیا گیا ہے اس پر عمل کیجیے۔ حالاں کہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے اپنے کلام میں کسی حکم کا ذکر نہیں کیا تھا؛ بل کہ ایک خواب کا ذکر کیا تھا۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ حضرت اسماعیل عَلَیْہِ السَّلَام نے نبی کے خواب کو بھی وحی الٰہی قرار دیا اور اس کو قرآن نے بلا نکیر ذکر کر کے اس کی تصدیق کردی۔ معلوم ہوا کہ وحی کی ایک صورت اگر کتاب خداوندی ہے تو دوسری صورت بلا کتاب کی وحی بھی ہے۔ اسی کو علماء اسلام نے وحی غیر متلو کا نام دیا ہے۔ معلوم ہوا کہ وحی الٰہی کی ایک قسم حدیث بھی ہے اس کا انکار دراصل قرآن کا انکار ہے۔

فتنۂ انکار حدیث کے سلسلے میں یہ چند باتیں تھیں جو پیش کی گئیں اور طلبائے عزیز نے بھی اس سلسلہ میں بڑی عرق ریزی کے ساتھ اس موضوع پر تیاری کی اور ہمارے سامنے متعدد حقائق کو کھولا۔ اب میں اس عرض پر اپنی بات کو اختتام تک پہنچاتا ہوں کہ ؂

اندکے بتو گفتم و بہ دل ترسیدم   کہ تو آزردہ شوی، ورنہ سخن بسیار است

مولانا مودودی
اور جماعتِ اسلامی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مولانا مودودی اور جماعت اسلامی

تمھید: کئی سال پیشتر ایک سائل نے مولانا ابوالاعلی مودودی صاحب اور ان کے جماعت ''جماعت اسلامی'' کے متعلق ایک سوال بھیجا تھا، جس کا جواب احقر نے کچھ تفصیل کے ساتھ دیا تھا۔

سوال: احقر کے بعض دوست احباب جماعت اسلامی سے تعلق رکھتے ہیں اور مجھے بھی اپنے ساتھ جوڑنے کی کوشش کرتے ہیں، ان کی مجالس میں شرکت کی ترغیب بھی دیتے ہیں، بعض اوقات ان حضرات نے مجھے ترغیب دی تو میں نے کہا کہ علما نے اس جماعت کو حق سے دور قرار دیا ہے تو ان لوگوں نے کہا کہ علما نے بے وجہ اور محض تعصب کی وجہ سے مولانا مودودی اور ان کی جماعت کو بدنام کیا ہے، جس طرح بریلوی لوگ علمائے دیوبند کو بدنام کرتے ہیں۔

یہ سن کر میں سوچتا ہوں کہ یہ جماعت کیسی ہے؟ ان کے کیا عقائد ہیں؟ اور علما نے اس کی کیوں مخالفت کی ہے؟ ان کے پاس اس کی کیا دلیل ہے، کیا محض تعصب سے ایسا ہوا ہے یا کسی بنیاد پر ہوا ہے؟

اسی تجسس کی وجہ سے مولانا مودودی صاحب اور ان کی قائم کردہ ''جماعت اسلامی'' کے سلسلے میں چند سوالات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، امید ہے کہ جواب باصواب سے ممنون فرمائیں گے:

(۱) مولانا مودودی صاحب کے وہ کیا نظریات ہیں جو قرآن وحدیث کے خلاف ہیں؟ جس کی وجہ سے علمانے ان کو غلط وگمراہی قرار دیا ہے؟

(۲) کیا مولانا مودودی نے پوری امت اور سلف صالحین کو گمراہ قرار دیا ہے اور کیا ان کا یہ دعوی ہے کہ دین کو صرف انہوں نے ہی سمجھا ہے؟ اگر یہ حقیقت ہے تو اس کی کیا دلیل ہے؟

(۳) آپ کے نزدیک اقامت دین کا اعلی تصور کیا ہے؟

(۴) کیا مودودی صاحب کا اتباع کرنے والے گمراہ ہیں؟

(۵) ہیں تو کیوں؟

(۶) کونسی جماعت صحیح وحق پر ہے، اور اہل حق ہونے کا کیا معیار ہے؟ بینوا توجروا۔

الجواب: ومنه الصدق الصواب:

مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت ''جماعت اسلامی'' کے متعلق حضرات علمانے بہت کچھ لکھا ہے اور ایک حق پسند وانصاف پسند کے لیے کافی وشافی ہے؛ اس لیے اگرچہ آپ کو مجھ سے دریافت کرنے کی ضرورت نہ تھی اور مجھے بھی اس پر خامہ فرسائی کی حاجت نہ تھی؛ مگر اس خیال سے کہ اس افہام وتفہیم سے راہ حق کی تلاش میں آپ کو کوئی سہولت مل جائے اور مجھ کو اس تعاون کے لیے ثواب مل جائے، یہ سطور لکھ رہا ہوں اور ان دعائیہ کلمات کے ساتھ پیش کر رہا ہوں کہ: اللهم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعه وأرنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابه. (اللہ ہمیں حق کو حق دکھا اور اس کی اتباع کی توفیق عطا فرما اور باطل کو باطل ہی دکھا اور اس سے بچنے کی توفیق عطا فرما۔)

(۱) قرآن وحدیث کے خلاف مولانا مودودی کے نظریات تو بہت سارے ہیں یہاں چند باتوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں:

(الف) یہ بات کون نہیں جانتا کہ حضرت انبیاء علیہم الصلاۃ والسلام ہر قسم کے گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں یہ عقیدہ پوری امت کا اجماعی عقیدہ ہے اور خصوصا کار نبوت وتبلیغ ورسالت میں تو ان کا معصوم ہونا سبھی کو مسلم ہے۔ جمہور نے صرف صغائر کے بارے میں جواز کا قول کیا ہے؛ مگر یہ بھی سب کا قول نہیں؛ بل کہ اشاعرہ اور بعض دیگر علما تو صغائر کو بھی جائز نہیں رکھے۔ (۱)

غرض یہ کہ انبیائے کرام کوئی کبیرہ گناہ کا ارتکاب کر ہی نہیں سکتے اور بہت سے علما کے نزدیک صغیرہ گناہ بھی نہیں کر سکتے اور امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"الانبیاء علیہم الصلاۃ والسلام کلهم منزهون عن الصغائر والكبائر والكفر القبائح." (۲)

ملا علی قاری رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"ثم هذه العصمة ثابتته الانبياء قبل النبوت وبعدها." (۳)

اس کے بعد مولانا مودودی کے نظریات پر نظر ڈالیں:

(۱) قرآن مجید میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تذکرہ میں آیا ہے کہ وہ ایک رات میں تارہ دیکھ کر کہنے لگے کہ یہ میرا رب ہے جب وہ غروب ہو گیا تو فرمایا کہ میں ڈوب جانے والے کو پسند نہیں کرتا پھر اسی طرح چاند اور سورج کو دیکھ کر بھی

---

(۱) تفصیل کے لئے دیکھئے: نبراس: ص ۲۸۳

(۲) شرح فقه اکبر: ۶۸

(۳) شرح فقه اکبر: ۶۹

کیا تمام علما اس واقعہ کو افہام وتفہیم قوم کی ایک شکل قرار دیتے ہیں یہ کسی نے نہیں کہا کہ نعوذ باللہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان ستاروں اور چاند وسورج کو دیکھ کر ان کو خدا سمجھا پھر ان کے نقص کو دیکھ کر ان سے برأت کی یا یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خدا کی تلاش میں سرگرداں تھے اور یہ واقعہ ان کے ابتدائی تفکر کے نتیجہ میں پیش آیا ؛مگر مولانا مودودی اس واقعہ کی تعبیر اس طرح کرتے ہیں۔ چناں چہ ملاحظہ کیجئے وہ تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں حضرت ابراھیم علیہ السلام کے اس ابتدائی تفکر کی کیفیت بیان کی گئی ہے.

جو منصب نبوت پر سرفراز ہونے سے پہلے ان کے لیے حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ بنا (آگے چل کر کہتے ہیں اس لیے قدرتی طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کی جستجوئے حقیقت کا آغاز اسی سوال سے ہونا چاہیے تھا کہ کیا فی الواقع ان (تارا چاند وسورج) میں سے کوئی رب ہوسکتا ہے؟ اسی مرکزی سوال پر انہوں نے غور وفکر کیا اور اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ ان میں کسی کے اندر بھی ربوبیت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ (۱)

عبارت کو پڑھ کر ہر کوئی یہی سمجھے گا کہ نعوذ باللہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے کفر وشرک کا ایک عبوری دور پار کر کے تدریجا واستدلا توحید کی حقیقت کو پایا ہے کیا یہ صحیح طور پر حضرت ابراھیم علیہ السلام کو شرک وکفر مرتکب ماننا نہیں ہے مودودی صاحب نے دوسرے صفحہ پر سوال کو اٹھا کر جواب دیا ہے مگر وہ جواب یہی ہے کہ ہاں انہوں نے کفر وشرک کا ارتکاب کیا ہے مگر اس کو اس لئے درخور اعتناء نہ سمجھا جائے گا کہ ایک جایائے حق کیلے یہ منزل لازم ہے۔ (نعوذ باللہ)

(ب) حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں جو

(۱) تفہیم القرآن: ۱/ ۵۵۷سورۃ انعام حاشیہ: ۵۳

فعل ان سے (داؤد علیہ السلام) سے صادر ہوا تھا ان کے اندر خواہش نفس کا کچھ دخل تھا اس کے حاکمانہ اقتدار کے نامناسب استعمال سے بھی کوئی تعلق تھا اور کوئی ایسا فعل تھا کہ حق کے ساتھ حکومت کرنے والے کسی فرماروا کو زیب نہ دیتا تھا۔ (۱)

غور فرمائے کہ خواہش نفس کا اتباع اور حاکمانہ اقتدار کا نامناسب استعمال کس قسم کے گناہ ہیں؟ اور یہ الفاظ اگر مودودی صاحب کے بارے میں بھی استعمال کئے جائے تو بہت سے ان کے عقیدت کیشوں کو گستاخی معلوم ہوا جب کہ مولانا مودودی معصوم نہیں اور یہ الفاظ مولانا مودودی نے معصوم نبی کے بارے میں لکھے ہیں.

حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرہ میں حضرات انبیا کے بارے میں رقم طراز ہیں اصل بات یہ ہے کہ انبیا بھی انسان ہی ہوتے ہیں اور کوئی بھی انسان اس پر قادر نہیں ہوسکتا کہ ہر وقت اس بلند ترین معیار کمال پر قائم رہے جو مومن کیلئے مقرر کیا گیا ہے بسا اوقات کسی نازک نفسیاتی موقعہ پر نبی جیسا اعلی واشراف انسان بھی تھوڑی دیر کے لیے بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ (۲)

غور فرمائیے کہ نبی بھی بشری کمزوری سے مغلوب ہو جاتا ہے اور یہاں تک گر جاتا ہے کہ مومن کیلئے جو معیار کمال ہے اس پر بھی وہ ہر وقت قائم نہیں رہ سکتا تو پھر اس پر اعتماد ہی کیا اور کیوں کیا جائے؟

(د) حضرت آدم علیہ السلام کے بارے میں مودودی صاحب گل افشانی فرماتے ہیں جب شیطان نے ان کو ناصح مشفق اور خیر خواہ دوست کے بھیس میں آکر ایک بہتر حالت کا لالچ دیا تو وہ اس کی تحریص کے مقابلہ میں نا جم سکے اور پھسل گئے

(۱) تفہیم القرآن: ۳۲/۴، سورہ ص: حاشیہ ۲۸
(۲) تفہیم القرآن: ۲/۳۴۳ تا ۲/۳۴۴

آ گئے لکھتے ہیں پھر ایک فوری جذبہ نے جو شیطانی تحریص کے زیر اثر ابھر آیا تھا ان پر ذہول طاری کر دیا اور ضبط نفس کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی وہ طاعت کے مقام بلند سے معصیت کی پستی میں جا گرے۔(۱)

آخری الفاظ تو خصوصیت کے ساتھ غور کرنے کے ہیں کہ کیا کسی نبی کے شایان شان ہے؟

(ھ) نبی کریم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لکھتے ہیں یہ پانچویں آیت (سورۃ اذا جاء نصر اللہ الخ) میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقعہ پر خطاب کیا گیا ہے کہ جب کہ ۲۳ سال کی مسلسل جد جہد سے عرب میں انقلاب کی تکمیل ہو چکی ہے اس طرح جب وہ کام تکمیل کو پہنچ گیا جس پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو معمور کیا گیا تھا تو آپ سے ارشاد ہوتا ہے کہ اس ذات (اللہ سے درخواست کرو کہ مالک اس ۲۳ سال کے زمانہ خدمت میں اپنے فرائض ادا کرنے میں جو خامیاں اور کوتاہیاں مجھ سے سرزد ہوگئیں ہوانہیں معاف فرمادے (قرآن کی چار بنیادی اصطلاح میں ص ۱۱۱) میں ان آیات کی یہ تشریح جو مودودی صاحب نے کی ہے من گھڑت ہونے کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی ان کی گمراہی یہ ہے کہ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اپنے فرائض منصبی میں کوتاہی اور خوامی کے سرزد ہونے کو ممکن بتا رہے ہیں حالاں کہ کسی بھی نبی سے ان کے فرائض منصبی میں غفلت و کوتاہی نہیں ہوسکتی یہی جمہور اہل سنت کا عقیدہ ہے یہ مثالیں اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہیں کہ پوری امت کے متفقہ عقیدہ اس عصمت انبیا سے مولانا مودودی نے کھلے طور پر مخالفت کی ہے اور یہ عقیدہ قرآن وحدیث ہی سے مستنبط ہے آیت ﴿وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا

(۱) تفہیم القرآن: ۱۳۳/۳، سورہ طہ حاشیہ ۱۰۲

لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ﴾ الخ سورۃ ص ﴿مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى﴾ سورۃ نجم وغیرہ سے یہ مضمون وعقیدہ ثابت ہے پھر امت کا اجماع ہے جوخود مستقل دلیل شرعی ہے.

(و) ایک جگہ مودودی صاحب لکھتے ہیں پس یہ حقیقت ہے کہ محض ان چار بنیادی اصطلاحوں کے مفہوم پر پردہ پڑ جانے کی وجہ سے قرآن کی تین چوتھائی سے زائدہ تعلیم بلکہ اس کی حقیقی روح نگاہوں سے مستور ہوگئی۔(۱)

مولانا مودودی کی یہ بات اور یہ نظریہ صریح قرآن مجید کے خلاف ہے قرآن تو کہتا ہے کہ:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾ (الحجر)

کہ ہم ہی نے قرآن کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں ظاہر ہے کہ یہاں صرف الفاظ کی حفاظت مراد نہیں ہے بلکہ اس کی تعلیم مضامین ومعانی ومفاہیم کی حفاظت بھی مراد ہے؛ بل کہ الفاظ کی حفاظت بھی معانی اور مفاہیم کی حفاطت ہی کے لیے مقصود ہے۔

(۲) مولانا مودودی نے پوری امت کو گمراہ اور سلف صالحین کو بے راہ قرار دیا ہے اوران کا دعوی ہے کہ قرآن وحدیث کوٹھیک ٹھیک اگر کسی نے سمجھا ہے تو وہ خود مولانا ہیں ذیل کی عبارات اس دعوی کی دلیل ہے

(۱) وہ لکھتے ہیں: بعد کی صدیوں میں رفتہ رفتہ ان سب الفاظ (الہ، رب دین وعبادت) کہ وہ اصلی معنے جونزول قرآن کے وقت سمجھے جاتے تھے بدلتے چلے گئے یہاں تک کہ ہر ایک پوری وسعتوں سے ہٹ کر نہایت محدود؛ بل کہ مبہم مفہومات کے لیے

(۱) قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں: ص۱۰

خاص ہو گیا اس کی ایک وجہ تو خالص عربیت کے ذوق کی کمی تھی اور دوسری وجہ یہ تھی کہ اسلام کی سوسائٹی میں جو لوگ پیدا ہوئے ان کے لیے الہ رب اور دین وعبادت کے وہ معانی باقی نہ رہے تھے جو نزول قرآن کے وقت غیر مسلم سوسائٹی میں رائج تھے الخ۔ (۱)

نوٹ: جب امت کے پاس ان بنیادی قرآنی اصطلاحات کے معانی ہی نہ رہے تو امت کی گمراہی میں کون عاقل شک کرسکتا ہے؟ غور فرمائیے۔

(۲) علمائے اسلام کے بارے میں مولانا مودودی لکھتے ہیں افسوس کہ علما (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے تھے ان میں اجتہاد کی قوت نہ تھی ان میں تفقہ تھا ان پر تو اسلاف کی اندھی جامد تقلید کا مرض پوری طرح مسلط ہو چکا تھا جس کی وجہ سے وہ ہر چیز کو ان کتاب میں تلاش کرتے تھے جو خدا کی کتاب نہ تھی وہ ہر معاملے میں ان انسانوں کی طرف رجوع کرتے تھے جو خدا کے نبی نہ تھے بدقسمتی یہ ہے کہ علمائے اسلام کو اب تک غلطی کا احساس نہیں ہوا ہے قرب قریب ہر اسلامی ملک میں علما کی جماعت اب بھی اسی روشن پر قائم ہے۔ (۲)

نوٹ: جب انسانوں کی کتابیں مضر ہیں اور اسلاف کی کتابیں بھی قابل استفادہ نہیں تو آخر مولانا مودودی نے تفسیر کیوں لکھی؟ اور دیگر کتابیں کیوں تالیف کیں اور آج جماعت اسلامی کے ارکان وافراد ان کو کیوں اہمیت دیتے ہیں پھر ان کی تقلید کیوں کرتے ہیں؟ اگر اجتہاد وتفقہ اسی کا نام ہے کہ ہر آدمی قرآن پڑھ کر ایک نیا مطلب نکال لیا کرے تو پھر مولانا مودودی کے بعد جماعت اسلامی والوں نے اجتہاد کا دروازہ کیوں بند کردیا؟ اور مولانا کی ہر تفسیر پر کیوں اکتفاء کرلیا؟

---

(۱) قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں ص ۸۔۹

(۲) تنقیحات ص: ۳۴

(۳) دور صحابہ کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں دوسری طرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جن پر اس کار عظیم کا بار رکھا گیا تھا ان تمام خصوصیات کے حامل نہ تھے جو ان سے پیش رووں کو عطا ہوئی تھی اس لیے ان کے زمانہ خلافت میں جاہلیت کو اسلامی نظام اجتماعی میں گھس آنے کا موقعہ مل گیا آگے چل حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کا ذکر کیا ہے پھر لکھا کہ اس طرح حکومت کی اساس اسلام کے بجائے پھر جاہلیت پر قائم ہوگئی۔ (۱)

نوٹ: یہ دور صحابہ کے بارے میں فرمایا جارہا ہے بعد ادوار کا تو خدا محافظ۔

(۴) اپنے دور کے مسلمانوں کا حال؛ لکھتے ہیں انہی ذات کے حد تک میں کہہ سکتا ہوں کہ اسلام کو جس صورت میں نے اپنے گرد و پیش کی مسلم سوسائیٹی میں پایا میرے لیے اس میں کوئی کشش نہ تھی تنقید و تحقیق کی صلاحیت پیدا کرنے کے بعد پہلا کام جو میں نے کیا وہ یہی تھا کہ اس بے روح مذہبیت کا قلادہ اپنے گردن سے اتار پھینکا جو مجھے میراث میں ملی تھی اگر اسلام صرف اسی مذہب کا نام ہوتا جو اس وقت مسلمانوں میں پایا جاتا ہے شاید میں بھی آج ملحدوں اور لا مذہبوں میں جا ملا ہوتا آگے چل کر کہتے ہیں پس در حقیقت میں ایک نو مسلم ہوں خوب جانچ کر اور پرکھ کر اس مسلک پر ایمان لایا ہوں میں صرف غیر مسلموں کو نہیں؛ بل کہ خود مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف دعوت دیتا ہوں الخ۔ (۲)

مولانا مودودی جو مسلم سوسائیٹی کو دیکھ کر بے روح مذہبیت کا قلادہ اتارنا پڑا یہ صرف جاہل و دین سے غافل مسلم سوسائٹی نہیں تھی؛ بل کہ مدارس اسلامیہ کے جلیل القدر

(۱) تجدید و احیاء دین ص: ۳۴

(۲) مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش سوم ص ۱۹-۲۰

علما فقہا خانقاہوں کے صوفیا ومشائخ مساجد کے ائمہ وخطبا غرض پورا دین دار طبقہ بھی اس میں داخل وشامل ہے کیوں کہ دوسری تحریرات اس پر روشنی ڈالتی ہیں لیجئے ملاحظہ فرمایئے:

(۵) تنقیحات میں مولانا مودودی کہتے ہیں:

''اسلام ہے کہاں؟ مسلمانوں میں نہ اسلامی سیرت ہے نہ اسلامی اخلاق نہ اسلامی افکار ہیں نہ اسلامی اسپرٹ، حقیقی اسلامی روح نہ ان کی مساجدوں میں ہے نہ مدرسوں میں ہے نہ خانقاہوں میں، علمی زندگی سے اسلام کا ربط باقی نہیں رہا۔''(۱)

(۶) افسوس کہ علما (الا ماشاء اللہ) خود اسلام کی حقیقی روح سے خالی ہو چکے ہوں الخ۔ (یہ اقتباس اوپر گزر چکا دوبارہ پڑھ لیجئے۔)

(۷) ترکی کے علما کا رونا روتے ہوئے مودودی نے لکھا ہے:

''وہ علما اب بھی اپنے وعظوں میں قرآن کی وہی تفسیریں اور وہی ضعیف حدیثیں سنا رہے تھے جس کو سن کر سو برس پہلے تک سر دھنتے تھے کہ لوگ تو سر دھنتے تھے؛ مگر آج کل کے دماغ ان کو سن کر صرف ان مفسرین ومحدثین ہی سے نہیں؛ بل کہ خود قرآن وحدیث سے بھی منحرف ہو جاتے ہیں۔''(۲)

نوٹ: مودودی صاحب کی اس بات میں کہاں تک صداقت ہے اس کو تو ایک طرف رکھئے اولا اس پر غور کیجئے کہ کیا قرآن کی وہ پرانی تفسیر واقعی ایسی ہیں کہ

---

(۱) تنقیحات ص: ۳۳

(۲) تنقیحات: ۸۹

ان کو پڑھ کر یا سن کر آج کا دماغ قرآن وحدیث سے منحرف ہو جائے؟ اور کیا کیا ہے؟ الحمدللہ آج بھی لاکھوں نہیں کروڑوں مسلمان اپنی پرانی تفاسیر کے ذخیروں سے ایمان وعمل کی روشنی حاصل کر رہے ہیں اور تمام دنیا کے علماء مدارس میں ان سے ہی استفادہ کر رہے ہیں.

(۸) ایک جگہ کہتے ہیں:

''حیرت اور ہزار حیرت ہے ان علمائے کرام پر جن کا دن رات کا مشغلہ ہی قال اللہ وقال الرسول ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان کو کیا ہو گیا ہے یہ قرآن کو کس نظر سے پڑھتے ہیں کہ ہزار بار پڑھنے کے بعد بھی انہیں اس قطعی اور دائمی پالیسی کی طرف ہدایت نہیں ملتی کہ جو مسلمان کے لیے اصولی طور پر مقرر کر دی گئی ہے۔''(۱)

(۹) جاہلیت راہبانہ نے علما ومشائخ زہاد و پاکباز لوگوں پر حملہ کیا اور ان میں وہ خرابیاں پھیلانی شروع کیں جن کی طرف میں پہلے اشارہ کر آیا ہوں۔(۲)

(۱۰) ایک جگہ کہتے ہیں.

''باستثناء چند اس طبقے (یعنی علما) کے سواد اعظم کا جو حال ہے اس کو بیان کرنا گویا اپنی ٹانگ کھولنا ہے اور آپ ہی لاجوں مرنا ہے ان حضرات کو اگر آپ نے عام فہم زبان میں من مانے خطبے دینے کا موقع دیا تو یقین جانیے کہ آئے دن مسجدوں میں سر بھٹول ہوگی...... آگے چل کر کہتے ہیں ...... (وہ علما کا طبقہ) جس ماحول سے تعلیم وتربیت

(۱) مسلمان اور موجودہ کشمکش جلد سوم ۹۹

(۲) تجدید واحیاء دین ۳۸

پا کر آتا اور جس ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے وہاں دین کے مہمات اور قوم کے مصالح کے لیے کوئی جگہ نہیں۔''(۱)

نوٹ: غور کر لیجیے کہ علما کا یہ سوادِ اعظم کہاں سے تربیت وتعلیم پا کر آتا ہے اور کہاں زندگی بسر کرتا ہے ان کے خیال میں ان مدارس میں مہمات دین کے لیے کوئی جگہ نہیں تو ان علمائے مدارس کے گمراہ ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟ یہ دس حوالے آپ کے سوال پر سرسری نظر میں دیکھ کر پیش کئے گئے ہیں ورنہ ان کا پورا لٹریچر اس قسم کی صدہا عبارتوں سے پر ہے جن کا خلاصہ یہ ہے کہ پوری امت اور خصوصا ان کے علمائے اسلام سے ناواقف ونا آشنا اور اس کی روح سے خالی ہیں۔

بل کہ اسلاف نے جو فقہی کتب مرتب کر کے اسلامی قوانین کا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا جس پر ہر زمانے میں امت کو فخر وناز رہا اس کے بارے میں مولانا مودودی کا ارشاد ہے کہ اس پر عمل کرنے والوں سے قیامت میں باز پرس ہوگی کہ:

''ہم نے تم کو قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا تھا تم پر یہ کس نے فرض کیا تھا کہ ان دونوں سے بڑھ کر اپنے اسلاف کی پیروی کرو؟ ہم نے ہر مشکل کا علاج قرآن میں رکھا تھا تم سے یہ کس نے کہا کہ قرآن کو ہاتھ نہ لگاؤ اور اپنے لیے انسانوں کی لکھی ہوئی کتابوں کو کافی سمجھو؟

اس باز پرس کے جواب میں امید نہیں کہ کسی عالم دین کو کنز الدقائق، ہدایہ اور عالمگیری کے مصنفین کے دامنوں میں پناہ مل سکے گی۔(۲)

---

(۱) تفہیمات جلد دوم: ۴۲۱

(۲) حقوق الزوجین ۵۷

اس عبارت میں جو جھول ہیں ان پر تبصرہ کا یہ موقعہ نہیں البتہ اس پر غور کرنے کی دعوت دیتا ہوں کہ آج مودودی صاحب کی جو کتابیں آب وتاب سے چھاپی جارہی ہیں اوران کو پڑھنے کی دعوت دی جارہی ہے یہ کیا خدائی کتابیں ہیں؟ اور کیا ان کو پڑھنے اور پڑھانے ان کو چھاپنے اور پھیلانے والوں سے یہ باز پرس نہ ہوگی کہ تم نے ان کو کیوں کافی سمجھا؟ اور کیا اس کے جواب میں جماعت اسلامی والوں کو مولانا مودودی کے دامن میں پناہ مل سکے گی؟

اگر اس کے جواب میں کوئی یہ کہے کہ ان کتابوں سے ہم قرآن وحدیث اور دین سیکھتے ہیں تو ہمارا بھی یہی جواب یہ کہ کنز وہدایہ وعالمگیر بھی ہم اسی غرض سے پڑھتے ہیں اور کون بے ایمان ایسا ہے جس نے قرآن کو ہاتھ لگائے بغیر صرف ان کتابوں کو کافی سمجھا؟ یہ ایک سفید جھوٹ ہے جو مولانا مودودی نے علماء دشمنی کی وجہ سے ان کے سرتھوپا ہے۔

غرض یہ کہ مولانا مودودی کے نزدیک قرآن کی وہ تفسیر جو قدیم مفسرین نے بیان کی اور فقہی احکام جن کو فقہا نے مرتب ومدون کیا ہے اور حدیث کے پرانے ذخیرے جن کو محدثین نے جمع کیا ہے یہ سب بے کار و بے فائدہ؛ بل کہ مضرونقصاندہ ہیں اورانہی کی وجہ سے علما اور پوری امت گمراہ ہوئی مولانا مودودی نے اگر چہ کفر کا لفظ تو استعمال نہیں کیا ہے؛ مگر اس مضمون کفر کو مختلف پیرایوں میں بیان کر دیا ہے جیسا کہ اوپر درج کردہ عبارات میں سے ۴/۵ سے واضح ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ایک طرف پوری دنیا کے ائمہ وفقہا وعلما ہیں اور دوسری طرف مولانا مودودی اور بعض ان کے ہم خیال سارے علمائے قدیم سے لے کر جدید تک دین اور اقامت دین کی ایک تشریح وتفسیر کرتے ہیں؛ مگر مولانا مودودی

اب ان سب کو غلط اور باطل ٹھہراتے ہیں اور دوسری طرف مودودی صاحب کی جو تعبیر دین ہے اس کو جمہور علماء غلط اور گمراہی ٹھہراتے ہیں اب اس صورت میں عقل وشرع دونوں کا کیا تقاضا ہونا چاہیے اس کا فیصلہ آپ خود کیجئے۔

(۳) رہا آپ کا تیسرا سوال کہ اقامت دین کا اعلیٰ تصور میرے نزدیک کیا ہے؟ اس سوال کو پڑھ کر تعجب ہوا کہ کیوں کہ اس وقت آپ کو میرے خیالات ونظریات سے کوئی سروکار تو ہے نہیں، پھر سوال کی کیا غرض؟ اصل میں آپ کو یہ پوچھنا چاہیے تھا کہ مولانا مودودی کا جو تصور دین ہے اس پر جمہور علما کی کیا رائے ہے؟ کیوں کہ آپ کے یہ سوالات مولانا مودودی اور ان کی جماعت سے متعلق ہیں اس لیے جواب میں میں مولانا مودودی کے تصور دین سے قصداو مستقلا تعرض کروں گا۔

تمام علما کے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ ''دین اسلام'' ایک مکمل وجامع دین ہے جس میں انفرادی وذاتی زندگی سے متعلق احکامات وتعلیمات بھی ہیں اور اجتماعی زندگی سے متعلق بھی احکامات وتعلیمات ہیں اور دین اسلام ان زندگیوں کے تمام شعبوں اور زبانوں میں انسان کی رہنمائی کرتا ہے عقائد، عبادات معاملات، معاشرت اخلاق وسیاست کے جملہ ابواب وشعبے دین میں داخل ہیں ان میں سے کسی کو بھی دین سے خارج کرنا دراصل دین کو ناقص قرار دینا ہے جو صریح طور پر قرآن کی نص کے خلاف ہے۔

آخر میں اپنی ایک تحریر مسمی بہ ''اسلام میں حسن معاشرت کی تعلیم'' میں تمہیدا جو لکھا تھا وہ نقل کرتا ہوں جس سے ہمارا ''تصور دین کیا ہے'' واضح ہوگا۔

''اسلام ایک کامل ومکمل دین ہے جس میں انسانی ضروریات کا پورا پورا سامان موجود ہے اور انسانی زندگی کے تمام اسباب وشعبوں میں

رہنمائی کے مکمل اسباب پائے جاتے ہیں اسلام صرف پوجا پاٹ کا مذہب نہیں وہ صرف عبادت گاہوں میں محصور نہیں، وہ خانقاہوں میں مقید نہیں وہ صرف انسان کا نجی مسئلہ نہیں اور وہ صرف راہبوں کا دین نہیں؛ بل کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اس کے مخاطب بادشاہ بھی ہیں، وزراء بھی ہیں مال دار بھی ہیں اور غریب بھی ہیں وہ (دین اسلام) جس طرح انسان کی نجی و ذاتی زندگی میں اس کا رہنما ہے اسی طرح اس کو بازار و کاروبار کی دنیا میں بھی ملازمت کے میدان میں بھی صنعت وحرفت کے میدان میں بھی سیاست کے میدان میں بھی ہر جگہ رہنمائی کرتا ہے۔"(۱)

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللہُ نے "تعلیم الدین" میں صراحت کے ساتھ تمام ابواب کو بشمول سیاست کے دین کے اجزا قرار دیا ہے اور ان پر نکیر کی ہے جو چند ابواب کو دین سمجھتے اور باقی کو خارج کرتے ہیں۔

ماضی قریب کے عظیم مفسر اور مستند فقیہ مولانا مفتی محمد شفیع دیوبندی رَحِمَہُ اللہُ نے معارف القرآن میں اعزاز قرآن کی مختلف وجوہات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"دسویں وجہ وہ علوم و معارف ہیں جن کا احاطہ نہ آج تک کسی کتاب نے کیا ہے نہ آئندہ امکان ہے کہ اتنی مختصر حجم اور محدود کلمات میں اتنے علوم وفنون جمع کیے جاسکیں جو تمام کائنات کی دائمی ضروریات کو حاوی اور انسان کی زندگی کے ہر شعبہ اور ہر حال سے متعلق پورا مرتب اور بہترین نظام پیش کر سکے۔ شخصی پھر آئلی زندگی سے قبائلی اور شہری زندگی

(۱) اسلام میں حسن معاشرت: ۳۰

تک اور پھر عمرانیات اور اجتماعیات اور سیاسیات ملک کے ہر پہلو پر حاوی نظام پیش کردے پھر صرف نظری اور علمی طور پر نہیں عملی طور پر اس کا رواج پانا اور تمام نظامہائے دنیا پر غالب آکر قوموں کے مزاج، اخلاق، اعمال، معاشرت اور تمدن میں وہ انقلاب عظیم پیدا کرنا جن کی نظیر نہ قرون اولیٰ میں مل سکتی ہے نہ قرون مابعد میں۔ الخ (۱)

اس عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن اور اس کی تعلیمات کو ہمارے علما واکابر ہمہ گیر و عالمگیر اور تمام ابواب وشعبہ جات پر حاوی سمجھتے ہیں یہ دین کا تصور ان حضرات نے پیش کیا ہے ہاں چند جہلاء یا ضمیر فروش چند علما نے ایسا نہ سمجھا یا نہ بتایا ہو تو وہ ساروں کے سر تھوپا نہیں جا سکتا؟

اس کے بعد اب سوال یہ ہے کہ مولانا مودودی کے نزدیک جو تصور دین ہے اس میں اور جمہور علما کا جو تصور دین ہے اس میں بنیادی فرق کیا ہے۔ یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ جمہور امت کے نزدیک عقائد و تصدیقات، اعمال و عبادات، اخلاق و معاشرت، معاملات و سیاست سب کے سب اجزا ہیں؛ مگر مولانا مودودی کے نزدیک ان تمام اجزا میں سے صرف ایک جز یعنی سیاست و حکومت کل پورا دین ہے اور باقی سب چیزیں اسی واسطے بطور ذرائع اور واسطہ کے ہیں۔ مولانا مودودی کہتے ہیں:

”دراصل دین کا لفظ قریب قریب وہی معنی رکھتا ہے جو زمانہ حال میں اسٹیٹ کے معنی ہیں لوگوں کا کسی بالاتر اقتدار کو تسلیم کر کے اس کی

---

(۱) معارف القرآن: ۱/ ۱۴۶

اطاعت کرنا یہ اسٹیٹ ہے یہی دین کا مفہوم۔"(۱)

غور کیجیے کہ اسٹیٹ محض ایک سیاسی اصطلاح ہے دین کو اس کا ہم معنی قرار دینا دین کی تحریف ہے کیوں کہ ظاہر ہے کہ دین اسلام کو ان تمام شعبوں اور بابوں کا جامع ہے اور سیاست وحکومت اس کے اجزا میں سے ایک جز ہے اسی جز کو کل دین قرار دینا اور زمانہ حال کے اسٹیٹ سے اس کو تعبیر کرنا تحریف دین ہے اور مولانا مودودی نے حکومت وسیاست کو اصل دین قرار دے دیا تو اس کے بعد ان پر لازم ہو گیا کہ وہ دیگر اجزا کے حثییت کو بھی واضح کریں تو انہوں نے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج وغیرہ عبادات کو حکومت الٰہیہ کے اقامت کے لیے ٹریننگ کورس اور اس سلسلے کی جد وجہد کے وسائل وذرائع قرار دیا۔ وہ خطبات میں کہتے ہیں:

"یہ نماز اور روزہ اور یہ زکوٰۃ اور حج دراصل اسی تیاری اور تربیت کے لیے ہے جس طرح تمام دنیا کی سلطنتیں اپنی فوج، پولس اور سول سروس کے لیے آدمیوں کو پہلے خاص قسم کی ٹریننگ دیتی ہے پھر ان سے کام لیتی ہے اسی طرح اللہ کا دین اسلام بھی ان تمام آدمیوں کو جو اس کی ملازمت میں بھرتی ہوں پہلے خاص طریقہ سے تربیت دیتا ہے پھر ان سے جہاد اور حکومت الٰہی کی خدمت لینا چاہتا ہے۔"(۲)

اس سے واضح ہوا کہ مولانا مودودی کے نزدیک عبادات مقاصد دین میں سے نہیں؛ بل کہ وسائل دین میں سے ہیں اور محض ایک ٹریننگ کورس کی حیثیت رکھتے ہیں اور اصل مقصود حکومت الٰہی کا قیام ہے؛ مگر آپ قرآن کی روشنی میں اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی روشنی میں اس پر غور کریں گے تو معاملہ برعکس نظر آئے گا۔

(۱) مسلمان اور سیاسی کشمکش: ۳/ ۱۱۷

(۲) خطبات: ۲۱۵

قرآن میں ہے:

﴿وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِم الخ﴾

(نور: ۵۵)

اس آیت میں ایمان وعمل صالح پر اللہ تعالیٰ نے خلافت فی الارض کا وعدہ فرمایا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت وخلافت ارضی اللہ کی طرف سے ایمان وعمل پر ملنے والا ایک انعام ہے اور یہ کون نہیں جانتا کہ انعام کام اور ڈیوٹی پورا کرنے پر ملتا ہے تو ایمان وعمل مقصود ومطلوب ہوا اور اس پر حکومت وخلافت عطیہ خداوندی ہوا مگر مولانا مودودی تو بغیر حکومت وخلافت ارض کے ایمان وعمل کو بھی درخور اعتنا نہیں سمجھتے اور اسی حکومت کو کل دین اور مقصود قرار دیتے ہیں اور اعمال وعبادات کو محض ایک ذریعہ ووسیلہ ٹھہراتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ تصور قرآنی تصور کے بالکل برعکس ہے۔

قرآن میں ایک اور جگہ فرمایا گیا ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ (الحج: ۴۱)

اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ یہ لوگ (مراد صحابہ اور بعد کے اہل ایمان ہیں) ایسے ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں حکومت دے دیں تو نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں اور نیک باتوں کا حکم دیں اور بری باتوں سے روکیں گے ہر موٹی عقل والا سمجھ سکتا ہے کہ اگر نماز، زکوۃ وعبادات حکومت قائم کرنے کا ذریعہ ہوتے تو حکومت کے قائم ہونے کے بعد ان کے اہتمام کی کوئی ضرورت نہ ہوتی؛ مگر دیکھئے قرآن نے بتایا کہ اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ حکومت پانے کے بعد وہ سب سے اول یہی نماز وزکوۃ کا نظام

قائم کریں گے معلوم ہوا کہ عبادات مقصود و مطلوب ہیں حکومت ہو تب بھی اور نہ ہو تب بھی مگر مولانا مودودی اس کے برخلاف عبادات کو ایک ٹریننگ کورس قرار دیتے ہیں۔

اس تعبیر کے نتیجے میں دین کا پورا نقشہ الٹ گیا جو چیز سر کے مقام پر ہونی چاہیے تھی وہ پیر کے پاس آ گئی اور جو پیر کے پاس ہونی چاہیے تھی وہ سر کے پاس آ گئی۔ مقاصد ذرائع کا درجہ پا گئے اور ذرائع و وسائل مقصود کی کرسی پر بیٹھ گئے۔

پھر سیرت رسول پر نظر ڈالیے تو کہیں سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ آپ نے صحابہ کو یہ بتایا ہوتا کہ آپ نے نماز، روزہ، اور زکوۃ و حج وغیرہ عبادات تمہارے لیے ٹریننگ کورس کے طور پر ہیں اور ان سے اصل مقصود حکومت الٰہی کا قیام ہے۔ بلکہ اس کے برعکس یہ معلوم ہوتا ہے کہ حکومت و خلافت قائم کرنے کے بعد بعض عبادات مشروع ہوئے ہیں جیسے حج کے سن آٹھ ہجری میں فرض ہوا جب کہ خلافت کا قیام اس سے کئی برس قبل قیام کے ساتھ ہو گیا تھا۔ سوچئے کہ یہ کیسا ٹریننگ کورس ہے کہ پہلے تو جہاد بھی ہو گیا اور خلافت کا قیام بھی ہو گیا ہے اس کے بعد اب ٹریننگ دی جا رہی ہے۔

اس کے بعد پھر اس پر بھی غور کر لیجیے کہ عبادت جو کہ اللہ اور بندہ میں ایک تعلق کا نام تھا اور جس کا اصل مقصود خدا سے وابستگی تھا اس کو جہاد کا ٹریننگ کورس قرار دے کر کس طرح اس کے درجہ اور مقصد سے اس کو ہٹا دیا گیا ہے۔

نیز حدیث میں ہے کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ جس نے اللہ اور رسول پر ایمان قبول کیا اور نماز قائم کی اور رمضان کے روزے رکھا تو اللہ پر حق ہو گیا کہ اس کو جنت میں داخل کریں خواہ وہ فی سبیل اللہ جہاد کیا ہو یا اس زمین پر بیٹھا رہا ہو جس میں اللہ نے اس میں پیدا کیا ہو۔ (۱)

(۱) بخاري: ۷۴۲۳

نماز و روزہ پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم جنت کی بشارت سنا رہے ہیں خواہ جہاد نہ کیا ہو۔سوال یہ ہے کہ بغیر اصل کام کیے صرف ٹرینگ کورس پر جنت کے وعدے کا کیا مطلب ہے۔

معلوم ہوا کہ مولانا مودودی کا تصور دین غلط اور گمراہ کن ہے پھر غور فرمایئے دنیا میں کتنے انبیا نے خلافت الٰہی وحکومت الٰہی قائم کی اور جنہوں نے قائم نہیں کی وہ کامیاب تھے یا ناکام؟ اس کے جواب میں عموماً جماعت اسلامی کے لوگ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہمارا کام کوشش کرنا ہے قائم ہونا یا نہ ہونا یہ ہمارے ذمہ نہیں۔مگر یہ جواب صحیح نہیں کیوں کہ اللہ تعالیٰ نبی کو جس مقصد کے لیے بھیجتا ہے وہ اگر پورا نہ ہو تو وہ نعوذ باللہ نبی کا ناکام ہونا لازم آتا ہے۔اگر آپ یہ فرض کرتے ہیں کہ انبیا کا اصل کام یہی حکومت الٰہی قائم کرنا تھا تو آپ کو لازماً یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جن انبیا نے کوشش کر کے بھی حکومت قائم نہ کی وہ سب نعوذ باللہ ناکام ہوئے۔یہ جواب دے کر پیچھا نہیں چھڑا سکتے۔کہ انہوں نے کوشش تو کی ہاں اگر آپ یہ کہیں کہ انبیاء پر صرف قیام حکومت کی کوشش تھی تو جواب تو صحیح ہو جائے گا؛ مگر یہ بات خود محتاج دلیل ہوگی۔ولا دلیل علیہ۔

اس پر بعض لوگ الزامی طور پر یہ جواب دیتے ہیں جیسے انبیاء کو اس مقصد سے بھیجا جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو ہدایت کی روشنی دیں پھر بھی بعض انبیا ایسے گزرے ہیں کہ سوائے چند نفوس کے ان پر کوئی ایمان نہ لایا تو جس سے ہم ان کو ناکام نہیں کہہ سکتے ایسے ہی وہ حضرات اگرچہ حکومت الٰہی قائم نہ کر سکے؛ مگر ناکام نہیں کہے جائیں گے۔

مگر یہ جواب غلط فہمی پر مبنی ہے کیوں کہ انبیاء کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ہدایت کی روشنی لوگوں کو دین اور دعوت حق ان کے سامنے پیش کریں قرآنی نصوص سے یہ بات واضح ہے جیسے: ﴿وما علینا الا البلاغ﴾ اور ﴿لست علیهم بمصیطر﴾ وغیرہ آیات

پرنظر ڈالنے سے سمجھ میں آتا ہے اوراس مقصود میں انبیاء کرام بلا شبہ کامیاب ہیں۔

(۴)و(۵) ہمارے نزدیک ہروہ شخص راہ حق سے ہٹا ہوا ہے جومودودی صاحب کے نظریات وخیالات اوران کی تعبیر دین وتصوردین سے اتفاق رکھتااوران کوحق وصواب سمجھتا ہواور یہ یقینی ہے جوبھی مولانا مودودی کے نظریات کوحق وصواب مانتا ہے وہ لازما اسلاف وجمہورعلماءوائمہ دین کوگمراہ سمجھتا ہےاور یہ بات خودکسی کے گمراہ ہونے کے لیے کافی ہے کہ وہ تمام اسلاف وعلما کوگمراہ سمجھے ہاں جولوگ جماعت اسلامی میں ایسے ہیں کہ ان کومولانا مودودی کے غلط اور باطل نظریات کاعلم نہیں اوروہ بھولے بھالے لوگ اس جماعت کودین کی ایک تحریک سمجھ کرشامل ہوگئے ہیں ان کوہم معذور سمجھتے ہیں۔

(٦)اس کافیصلہ توحدیث نے کردیاماانا علیه و أصحابی لہٰذا جواس اصول پرقائم ہوں وہ جماعت صحیح اورحق پرقائم ہیں اور یہ جماعت دنیا بھرمیں پھیلی ہوئی ہے انہی کو اہل سنت کہاجاتا ہے انہیں میں سے علمائے دیوبند بھی ہیں؛ مگرانہیں میں منحصرنہیں؛ بل کہ اسی نقطہ نظر کے حامل اورلوگ اور جماعتیں بھی ہیں جودنیا کے مختلف خطوں اورعلاقوں میں پھیلی ہوئی ہیں؛ مگریادرکھیے کہ علمائے دیوبند سے مراددیوبند کے مدرسے پڑھے ہوئے نہیں؛ بل کہ علمائے دیوبند کے نظریات کے حامی ہیں ورنہ بعض دیوبند کے پڑھے ہوئے لوگ بھی گمراہی میں پھنسے ہوئے ہیں اس موضوع پر حضرت مولانا قاری طیب صاحب رحمہ اللہ کی کتاب ’’علمائے دیوبند کامسلکی مزاج‘‘ میں سیرحاصل کلام ہے۔

فقط

محمد شعیب اللہ عفی عنہ

مدرسہ مسیح العلوم، بنگلور

١٦/شوال ١٤١٩ھ

قصہ نگاری
میں قرآنی اسلوب

بسم اللہ الرحمن الرحیم
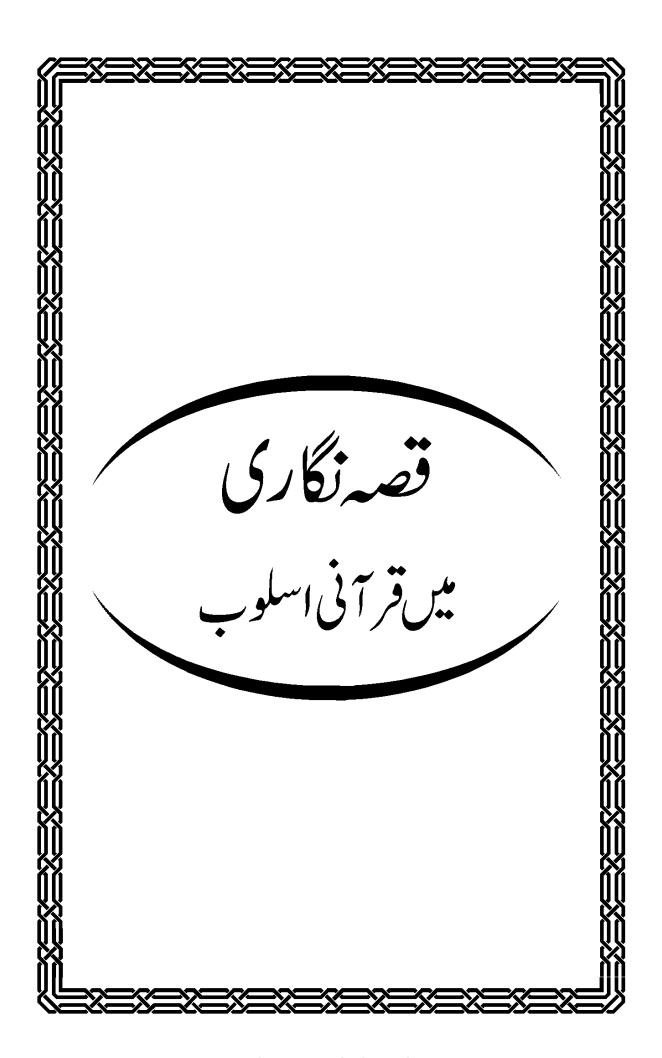
قصہ نگاری میں قرآنی اسلوب

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ علی سید المرسلین اما بعد:

ادبِ اسلامی میں قصہ نگاری کے مرکزی عنوان کے تحت قرآن کریم کے قصے کے ذیلی عنوان پر ذیل کے سطور پیش کرنے کی سعادت حاصل کرر ہا ہوں۔

قرآن کریم ادب عربی وادب اسلامی کا ایک بیش بہا ذخیرہ وخزانہ ہے اور اس کے لفظ لفظ وحرف حرف میں علوم ومعارف کے دریا بند ہیں؛ اس کا طرز واسلوب وجدانگیز وحلاوت بخش ہے۔اس کے مضامین ومعانی رہنمائی وہدایت کے علمبردار ہیں اس کے احکام وتعلیمات معقول وبصیرت افروز ہیں اور اس کی تلاوت وسماعت فرحت افزاونشاط انگیز ہے۔

لہٰذا اس کے کسی بھی پہلو کو لے کر بحث کی جائے وہ بہ ہر حال اپنا کوئی جواب نہیں رکھتا اسی طرح قرآن کریم کو جب ہم اس نظر ونقطۂ خیال سے دیکھتے ہیں کہ ادب میں قصہ نگاری کے تحت اس نے کیا کام کیا ہے؟ بلاشبہ قرآن کریم کو ایک شان مجاز وندرت کا حامل پاتے ہیں۔

آگے بڑھنے سے قبل، مختصر طور پر ادب، ادب میں قصہ نگاری پھر قرآن کریم میں قصہ نگاری پر بطور تمہید چند گذارشات پیش کرتا ہوں۔

ادب اور قصہ نگاری

اللہ تعالی نے انسان کو صفت عقل سے عزت بخشی جس کی وجہ سے وہ تمام اور مخلوقات پر فوقیت رکھتا ہے اور حق و باطل میں تمیز کر سکتا ہے اور اچھے اور برے کے فرق کو محسوس کر سکتا ہے اور اپنے احساسات اور خیالات کو بیان کر سکتا ہے۔ پس یہ قوت عقل جب کسی مضمون اور معنی کو بہتر سے بہتر اور عمدہ طریقہ پر بیان کرنے اور دوسروں کے سامنے ظاہر کرنے کے لیے الفاظ و عبارات سے کام لیتی ہے۔ تو اس کو ادب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ادب در حقیقت قوت عقل کا ایک فعل و عمل ہے۔ اسی لئے سوائے انسان کے جو کہ اللہ کے مخلوقات میں سے واحد مخلوق ہے جس کو عقل سے مشرف کیا گیا کسی اور سے ادب کا صدور ممکن نہیں۔ پس یہ قوت عقل، الفاظ و عبارات کے بہتر سے بہتر اور حسین لباس میں جس کے معنے و مضمون کو پیش کرتی ہے تو وہ ادب کہلاتا ہے۔ اور اس کا مقصد و منشا انسانی شعور کو بیدار کرنا اور اس کے قوائے وجدانی میں حرکت لانا ہوتا ہے تاکہ انسان غفلت سے جاگ جائے۔

ادب کا مادہ، خطابت، امثال، شعر، وصایا، حکایات و قصص، مکتوبات وگیرہ ہیں۔ ان میں قصص و حکایات نگاری بھی ایک اہم مادۂ ادب ہے اور قدیم زمانے سے اس سے کام لیا جا رہا ہے۔

ادب اور قرآن

جب اسلام آیا تو اسلام نے ادب کو تقدس عطا فرما دیا۔ پہلے زمانے میں ادب موجود تھا مگر اس سے وہ کام نہیں لیا جا رہا تھا جو اس کا اصل مقصد و منشا ہے۔ بلکہ جاہلی دور میں ادب کو ایک بازاری فن کی حیثیت دے دی گئی تھی۔ اسلام نے اس کی اصلاح کی اور اس کے اندر گویا جان ڈال دی اور اس کو اس کا اصلی مقام و مرتبہ بتایا۔

اس کا کام بتایا اور بازار کی ذلیل دنیا سے اٹھا کر اس کو مساجد و معابد اور مکاتب اور مدارس منبر و محراب کی تقدس مآب دنیا سے وابستہ کر دیا اور سب سے بڑی بات یہ کہ مقدس قرآن کو ادب سے بھرپور زبان میں نازل فرما کر اس کے مقام و مرتبہ کو اتنا بلند کر دیا کہ اس سے قبل اس کا کوئی تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

قرآن نے مطالب و معانی کی بلندی والفاظ و عبارات کے حسن و جمال دونوں کو اس شان سے جمع کر دیا کہ قرآن کا ادب ایک معجزہ بن گیا اور کوئی شخص اس کے مقابلہ کی تاب نہ لا سکا اور نہ لا سکے گا۔ اور اس ادب قرآنی کے سامنے عرب کا سارا ادب شعر ونثر پھیکا اور بے مزہ معلوم ہونے لگا اور بڑے بڑے شعراء نے نزول قرآن کے بعد شعر گوئی ترک کر دی۔ کہ اس کے مقابلہ میں کوئی شعر لذیذ معلوم نہیں ہوتا۔

قرآن کریم نے اپنے ادب میں بہت ساری چیزوں کو جمع کر لیا ہے۔ انہیں میں سے ایک قصہ نگاری بھی ہے۔

قرآن کریم اللہ تعالی کی وہ رفیع المرتبت اور عظیم الشان کتاب ہے جو نفوس انسانی کی صلاح و فلاح کی ضامن ان کی سعادت و ہدایت کی حامل، علوم صادقہ اور معارف حقہ کی معلم و داعی ہے۔ اور ظلمتوں اور ضلالتوں سے نکال کر نور ہدایت کی طرف لے جانے والی ہے۔ اور صلاح و فلاح اور سعادت و ہدایت کا راستہ واضح کرنے کے لیے وہ مختلف علوم سے کام لیتی ہے۔ کبھی اللہ کی طرف سے عطاء کردہ ان نعمتوں کی یاد دہانی کر کے راہ راست پر لانے کی کوشش کرتی ہے جو دن رات بارش کی طرح برستی ہیں اور ہماری عقلوں کو حیران اور قلوب کو اپیل کرتی ہے اور کبھی پاکیزہ تعلیمات اور بے نظیر ہدایات پیش کر کے عقل و بصیرت کی تسکین کا سامان فراہم کرتی اور ان تعلیمات و ہدایات کی معقولیت و صداقت کے ذریعہ مخلوق خدا کو خدا کی طرف

متوجہ کرتی ہے اور کبھی گزشتہ زمانوں اور ایام کے حوادث وواقعات پیش کر کے رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی ہے۔ حضرات علماء تفسیر نے قرآن پاک کے اس علم کو "**علم التذکیر بایام اللّٰہ**" کے نام سے یاد فرمایا ہے اس لئے کہ خود قرآن نے بھی اس کو "**تذکیر بأیام اللّٰہ**" فرمایا ہے ﴿**وذکرهم بأیام اللّٰه**﴾ میرے اس مقالے کا موضوع یہی "**علم التذکیر بایام اللّٰہ**" ہے۔

علم التذکیر بایام اللہ

علم التذکیر بایام اللہ سے مراد وہ علم ہے جو گزشتہ زمانوں اور ایام کے ان حوادث اور واقعات سے بحث کرتا ہے۔ جو قوموں اور افراد کے عروج ونزول، ان کے کمال وزوال اور ان کی فتح مندی وشکست خوردی کے اسباب وبواعث اور محرکات ونتائج پر روشنی ڈالتے ہیں اور عبرت وموعظت کا سامان فراہم کرتے ہیں۔

قرآن کریم نے بعض جگہ نیک افراد و اشخاص اور ان کے صالح اعمال عمدہ اخلاق ومضبوط ایمان کا ذکر کیا ہے۔ اور اس پر دنیا میں یا آخرت میں جو مفید نتائج اور بہترین ثمرات مرتب ہوئے یا ہوں گے، ان کا تذکرہ کیا ہے اور ان کے بالمقابل کسی جگہ بد خصلت وشریر فطرت لوگوں کا ان کی بد اطواریوں و بد اعمالیوں کا ان کی بد اخلاقیوں اور شرارتوں کا اور ان کی بے ایمانی و بدعملی و پست خیالی وکج فطری کا ذکر کیا ہے۔ اور اسی کے ساتھ ان کی بے ایمانی و بدعملی کے ہولناک نتائج بھی بیان کئے گئے ہیں اسی طرح متعدد اقوام وملل کا تذکرہ کیا ہے جن میں اہل ایمان بھی ہیں اور بے ایمان بھی اور پھر ان کے اچھے برے اعمال کے نتائج وثمرات بھی ذکر کیے گیے ہیں۔ اس میں ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جو صاحبان تخت و مالکان بخت و باج رہے ہیں اور ان کا بھی جنہوں نے فقیری میں امیری اور گدائی میں شاہی کا لطف ومزا پایا

تھا؛ مگر صرف اسی پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ دنیوی تخت وتاج اور ظاہری بخت وباج لازمی طور پر ہمیشہ کامیابی اور فلاح مندی پر منتج نہیں ہوتے ،فرعون اور نمرود کی ناکامی ذلت اور رسوائی کی مثال بھی سامنے ہے اور سلیمان عَلَیْہِ السَّلَام اور ذو القرنین کی فلاح مندیاں اور کامرانیاں بھی سامنے ہیں۔تاج وتخت ان کے پاس بھی تھے اوران کے پاس بھی اور باج وبخت کے مالک یہ بھی تھے اور وہ بھی مگر ایک کے حصہ میں رسوائیاں آئیں اور دوسرے کے حصہ میں خوش بختیاں آئیں۔قرآن ہمیں ان واقعات کے ضمن میں دعوت فکر دیتا ہے کہ ایک گروہ کے کامیاب ہونے اور دوسرے کے ناکام ہونے کے وجوہ واسباب تلاش کرو پھر خود ہی اس کا جواب دیتا ہے اوران وجوہ اوراسباب کے چہرے سے کشف نقاب کر کے حقیقت کو سامنے کردیتا ہے کہ کامیاب ہونے والوں کی کامیابی کا راز اور ناکام ہونے والوں کی ناکامی کا سبب ان کے ایمان وکفر اور نیک عملی اور بد عملی میں پوشیدہ ومضمر ہے۔

تذکرہ نگاری کا قرآنی اسلوب

قرآن کریم نے علم التذکیر بایام اللہ کے ضمن میں واقعہ نگاری وتذکرہ نگاری کا جو اسلوب وانداز وطرز بیان اختیار فرمایا ہے وہ عام تذکرہ نویسوں اور تاریخ نگاروں کے طرز واسلوب سے یکسر اور مختلف وممتاز ہے۔اور اپنے اندر ایک شان ندرت اور اعجاز بھی رکھتا ہے۔ہم اس فرق وامتیاز کو چند نمبرات میں پیش کرتے ہیں :

(ا) عام تذکرہ نویسوں اور تاریخ نگاروں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تاریخی تربیت کے مطابق واقعات وحوادث قلم بند کرتے ہیں؛ لیکن قرآن کریم اس کی بالکل رعایت نہیں کرتا؛ بل کہ کبھی تاریخی ترتیب کے یکسر خلاف، وہ ان واقعات میں تقدیم

وتاخیر سے کام لیتا ہے اور بعد میں پیش آئے ہوئے واقعہ کو پہلے اور پہلے پیش آئے ہوئے واقعہ کو بعد میں ذکر کرتا ہے۔وجہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا مقصد محض واقعہ نگاری نہیں ہے جیسا کہ عام تذکرہ نویسوں اور تاریخ نگاروں کا مقصد ہوتا ہے۔ بلکہ قرآن کریم کا مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ پڑھنے سننے والوں کو عبرت حاصل ہو اور وہ اپنی اصلاح کی طرف مائل ہوں اور راہ ہدایت پر گامزن ہو جائیں اس لئے واقعہ پہلے پیش آیا ہو یا بعد میں۔اسے اس سے کوئی مطلب نہیں اس کو تو اس سے بحث ہوتی ہے کہ واقعہ سے عبرت پذیری کا فائدہ حاصل ہو چنانچہ سورۂ بقرہ میں حضرت موسی علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے متعدد واقعات کا ذکر کیا گیا ہے۔مگر بعض وہ واقعات جو پہلے پیش آئے تھے ترتیب قرآن میں بعد میں جگہ پائے ہیں اور بعد کے واقعات کو پہلے جگہ دی گئی ہے۔

(۲) عام تاریخوں اور تذکروں کا انداز ہ وطریقہ یہ ہوتا ہے کہ سلسلۂ واقعات کی ان تمام کڑیوں کو بیان کیا جاتا ہے جو مؤرخ اور تذکرہ نگار کے دائرۂ معلومات میں ہوتی ہیں خواہ ان سے کوئی معتد بہ فائدہ متعلق ہو یا نہ ہو،اس کے بالکل برعکس قرآن مجید کا طرز وانداز یہ ہے کہ وہ سلسلۂ واقعات میں سے صرف ان اجزا کو معرض بحث میں لاتا ہے جو نفوس انسانی کی سعادت وفلاح اور ہدایت واصلاح میں بنیادی کردار ادا کرتے ہیں ۔یہی وجہ ہے کہ قرآن میں مذکور تقریباً سبھی قصص و واقعات میں صرف اہم اہم اجزا اور کڑیوں کو بیان کیا گیا ہے اور غیر ضروری اور غیر مفید اجزا اور کڑیوں سے صرف نظر فرمایا گیا ہے۔

(۳) تواریخ نگاروں اور سوانح نویسوں کی عام روش یہ ہوتی ہے کہ وہ واقعات و حوادث کو ایک تذکرہ واقعات کی حیثیت سے بیان کرتے ہیں۔ان کو اس سے کوئی

بحث نہیں کہ یہ واقعہ و حادثہ کیوں پیش آیا؟ اس کے اسباب و بواعث اور محرکات کیا تھے؟ مگر قرآن کریم چوں کہ کوئی تاریخ کی کتاب نہیں اور نہ اس کا مقصد محض تاریخ نگاری و تذکرہ نگاری ہے بلکہ وہ تو ایک صحیفۂ ہدایت ہے اس لئے وہ صرف واقعہ نہیں بلکہ واقعہ کا ایک پورا فلسفہ پیش کرتا ہے وہ صرف کسی حادثہ کا تذکرہ نہیں کرتا بلکہ اس کا پورا پس منظر بھی پیش کرتا ہے وہ واضح طور پر ان اسباب و محرکات کی نشان دہی کرتا ہے جن کے نتیجہ میں واقعے و حادثہ کا ظہور ہوا، تاکہ ان حوادث و واقعات کو پڑھنے والا اقوام و اشخاص کے عروج و نزول و کمال و زوال کے اسباب بھی جان لے اور عبرت حاصل کر سکے۔

(۴) اور سب سے بڑا امتیاز جو قرآن مجید کو عام تاریخوں اور تذکروں سے حاصل ہے وہ یہ ہے کہ اس کا اسلوب بیان اور طرز نگارش سب سے الگ و ممتاز ہے وہ واقعات و قصص کے ساتھ ساتھ کہیں عبرت کا تازیانہ بھی لگاتا ہے تاکہ دل و دماغ پر پڑے ہوئے غفلت کے پردے چاک ہو جائیں اور کہیں موعظت کی چاشنی بھی چکھاتا ہے تاکہ پڑھنے والا اس کی لذت و لطف سے بہرمند ہو اور کہیں علم و حکمت کے موتی بکھیرتا ہے تاکہ اہل علم و دانش ان سے بھرپور استفادہ کر سکیں اور یہ سب کچھ اس طرز و انداز سے ہوتا ہے، اگر پڑھنے والے کے سینے میں سل نہیں دل ہو تو وہ اس پر شیفتہ و فریفتہ ہو جائے اور اس طرح کہ سننے والوں کے دلوں میں ولولہ اور دماغوں میں زلزلہ پیدا ہو جائے اور اس میں قرآن مجید کی شان اعجاز کو بھی بڑا دخل ہے۔

غرض یہ کہ قرآن مجید کا وہ طرز اسلوب جو واقعہ گوئی اور تذکرہ نگاری میں اس نے اختیار فرمایا ہے وہ ایک اچھوتا اور نہایت ممتاز طرز و انداز ہے۔

قصص قرآنی کی اجمالی فہرست

قرآن کریم نے جو قصص و واقعات بیان فرمائے ہیں وہ مقصد و منشاء قرانی کے لحاظ سے دو قسم کے ہیں ایک نیکوں اور ایمان داروں کے واقعات و قصص دوسرے بدوں اور بے ایمانوں کے واقعات و قصص پھر ان میں بعض جگہ بعض افراد واشخاص کے تذکرے ہیں اور بعض جگہ قوموں اور ملتوں کے واقعات و حالات ہیں۔

جن بزرگ و نیک سیرت افراد واشخاص کا تذکرہ قرآن نے کیا ہے ان میں حضرت انبیاء کرام علیہم السلام بھی ہیں اور غیر انبیاء بھی ہیں حضرات انبیاء میں سے درج ذیل حضرات کا تذکرہ قرآن مجید نے کہا ہے.

(۱) حضرت آدم علیہ السلام (۲) حضرت نوح علیہ السلام (۳) حضرت ادریس علیہ السلام (۴) حضرت ہود علیہ السلام (۵) حضرت صالح علیہ السلام (۶) حضرت ابراہیم علیہ السلام (۷) حضرت لوط علیہ السلام (۸) حضرت اسماعیل علیہ السلام (۹) حضرت اسحاق علیہ السلام (۱۰) حضرت یعقوب علیہ السلام (۱۱) حضرت یوسف علیہ السلام (۱۲) حضرت شعیب علیہ السلام (۱۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام (۱۴) حضرت ھارون علیہ السلام (۱۵) حضرت الیاس علیہ السلام (۱۶) حضرت ایوب علیہ السلام (۱۷) حضرت یونس علیہ السلام (۱۸) حضرت الیسع علیہ السلام (۱۹) حضرت داؤد علیہ السلام (۲۰) حضرت سلیمان علیہ السلام (۲۱) حضرت ذوالکفل علیہ السلام (۲۲) حضرت عزیر علیہ السلام (۲۳) حضرت زکریا علیہ السلام (۲۴) حضرت یحییٰ علیہ السلام (۲۵) حضرت عیسیٰ علیہ السلام (۲۶) حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

ان میں سے بعض حضرات کا صرف نام قرآن مجید میں مذکور ہے ان کا کوئی قصہ وواقعہ نہیں ہے جیسے حضرت ذوالکفل علیہ السلام ۔

اور غیر انبیا میں سے حضرت ذوالقرنین، حضرت لقمان علیہ السلام (ان کو بعض نے نبی بھی مانا ہے) اور اصحاب کہف واصحاب اخدود کے جن مومنین کو قتل کیا ہے، حضرت مریم اور اہلیہ فرعون کا ذکر ہے اور جن بے ایمان و بدعمل افراد کا ذکر قرآن نے کیا ہے ان میں فرعون، ہامان، قارون، جالوت، سامری، ابولہب اور ابلیس داخل ہیں نیز لوط ونوح علیہما السلام کی بیویاں بھی داخل ہیں۔

اور جن اقوام کا ذکر قرآن نے کیا ہے ان میں قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب (ان کو اہل مدین کہا جاتا ہے اور بعض کا خیال ہے کہ انہی کو اصحاب الایکہ بھی کہا جاتا ہے) قوم سبا اور بنی اسرائیل شامل ہیں اس کے علاوہ بعض قصص ایسے بھی قرآن میں مذکور ہیں جن کے بارے میں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ کن سے تعلق رکھنے والے واقعات ہیں جیسے اصحاب الجنہ واصحاب القریہ کا قصہ.

ظاہر ہے کہ تمام قرآن مجید کے قصوں کو اس مختصر مقالے میں پیش کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے چند اہم واقعات کو پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔

تذکرہ حضرت آدم وابلیس

حضرت آدم علیہ السلام ، انسان اول بھی ہیں اور نبی اول بھی ہیں قرآن نے ان کی تخلیق کا واقعہ ان کی تعلیم وتربیت کے حالات اور ان کے سامنے فرشتوں کے سجدہ کا واقعہ اور ابلیس لعین کا سجدہ سے انکار اور آدم پر اپنے تفوق کے اظہار واقعات متعدد مواقع پر بیان کئے ہیں پھر ابلیس کے راندۂ درگاہ خداوندی ہونے کا ذکر فرمایا گیا ہے ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے جب حضرت آدم علیہ السلام کی

تخلیق کا ارادہ فرمایا تو فرشتوں کے مجمع میں اس کا اظہار کیا کہ میں زمین پر اپنا ایک خلیفہ بنانے والا ہوں، فرشتوں نے باادب عرض کیا کہ کیا آپ زمین پر اس کو اپنا خلیفہ بنائیں گے جو وہاں فساد کرے گا اور خون ریزی کرے گا جبکہ ہم آپ کی حمد وستائش اور تسبیح اور تقدیس کے لیے موجود ہیں اللہ تعالی نے فرمایا کہ میں جو حکم اور اسرار اس کے جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے، اس کے بعد اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا یہ مٹی جو کھنکھناتی ہوئی ٹھیکری کی طرح آواز دینے لگی تھی مختلف حالات سے گذار کر حضرت آدم علیہ السلام کے خمیر کے قابل بنائی گئی تھی جسد خاکی کے بن نے کے بعد اللہ تعالی نے اس میں روح پھونک دی اور حضرت آدم علیہ السلام کا یہ پتلہ گوشت و پوست ہڈی اور پٹھے کا زندہ انسان بن گیا اور عقل اور شعور اور حس وادراک اور وجدانی کیفیات اور جذبات کا حامل نظر آنے لگا پھر اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی خصوصی عظیم المرتبت صفت، علم، سے نوازا اور تمام اشیا کے ناموں وخواص اور فوائد ومضار سے واقفیت عطا فرمائی اور فرشتوں کے سامنے ان کی برتری کے اظہار کے لیے حضرت آدم علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ آپ ان چیزوں کے نام ان کو بتلائے حضرت آدم علیہ السلام نے اپنے اس علم سے تمام چیزوں کے نام بتلا دئے اور دوسری طرف جب فرشتوں سے پوچھا گیا تو کچھ نہ بتا سکے اس طرح حضرت آدم علیہ السلام کا فرشتوں پر تفوق اور برتری ثابت کر دی گئی اور حضرت آدم علیہ السلام کے اندر خلافت ارض کی اہلیت کا ہونا ان کے سامنے ظاہر کیا گیا پھر اس تفوق و برتری کے مظاہرہ کے لیے تمام فرشتوں کو سجدہ کا حکم دیا گیا اور سب کے سب ان کے سامنے سجدہ میں پڑ گئے؛ مگر ابلیس لعین جو اس وقت فرشتوں میں رہتا تھا اس نے سجدہ سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اسے کیوں سجدہ کروں جس کو اے اللہ تو نے مٹی سے بنایا؟ جب کہ

میں آگ سے پیدا کیا گیا ہوں اور میں اس سے بہتر ہوں؟ اللہ کے حکم سے انکار اور سرتابی کی وجہ سے اس پر اللہ کا عذاب نازل ہوا اور اس پر لعنت ڈالی گئی اور راندۂ درگاہ قرار دیا گیا اور اس کو آسمانوں سے نکل جانے کا حکم دیا گیا اس پر اس نے اللہ تعالی سے مہلت مانگی اور عرض کیا کہ مجھے قیامت کے دن تک مہلت دی جائے اس کی یہ درخواست اللہ تعالی کی حکمت بالغہ کے تحت قبول کر لی گئی اس نے قسم کھائی اور کہا کہ میں آدم کی ذریت کو صراط مستقیم پر بیٹھ کر بہکاؤں گا اور ہر طرف سے اس پر حملہ کروں گا اللہ تعالی نے فرمایا کہ جو تیری بات مانے گا ہم اس کو بھی تیرے ساتھ جہنم میں ڈال دیں گے؛ مگر یاد رکھ کہ تیرا یہ مکروفریب میرے نیک بندوں پر نہیں چلے گا اس کے بعد حضرت آدم علیہ السلام اور ان کی زوجہ حضرت حوا کو جنت میں ٹھہرایا گیا اور ان سے فرمایا گیا کہ اس میں موجودہ تمام اشیا سے استفادہ کرو خوب کھاؤ پیو مگر ایک درخت (گندم کا یا انگور کا) ہے اس کے قریب بھی نہ جاؤ ورنہ ظالموں میں سے ہو جاؤ گے، چناں چہ یہ حضرات قرب خداوندی کی دولت سے محظوظ اور مسرور تھے کہ ایک دن شیطان ابلیس نے حضرت آدم علیہ السلام کو آکر کھانے پر ابھارا جس سے منع کیا گیا تھا وہ قسم کھا کر کہنے لگا، میں تمہارا ناصح ہوں تم سے کوئی عداوت اور دشمنی نہیں کہ خواہ مخواہ تم کو درخت مذکور کے کھانے پر ابھاروں بات یہ ہے کہ تم کو اس کے کھانے سے اس لیے منع کیا گیا کہ کہیں تم فرشتے بن جاؤ یا ہمیشہ زندہ رہ جاؤ؟ غرض جب اس کے قسم کھانے سے حضرت آدم علیہ السلام کو یقین ہوگیا کہ یہ سچ ہی کہتا ہوگا تو انہوں نے اس درخت سے کچھ کھا لیا اور کھاتے ہی عتاب الٰہی کا مورد بن گئے اللہ تعالی فرمایا کہ کیا میں نے تم کو اس کے کھانے سے منع نہیں کیا تھا اور کیا میں نے تم کو نہیں بتایا کہ شیطان تمھارا دشمن ہے پھر اس فعل کے نتیجہ میں ان کا لباس اتار لیا گیا اور شرم گاہیں کھل گئی اس پر مارے شرم کے یہ حضرات جنت کے درختوں کے

پتوں سے اپنے کو چھپانے لگے اور اللہ تعالیٰ کی جناب میں توبہ کی اور عرض کیا کہ اے ہمارے رب ہم نے اپنے آپ پر گناہ کرکے ظلم کیا ہے اگر آپ نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہماری مغفرت نہ کی تو ہم فساد میں پڑے رہنے والے ہو جائیں گے اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام اور حوا کو حکم دیا کہ اب تم جنت میں نہیں رہ سکتے؛ لہٰذا زمین پر چلے جاؤ اور وہاں تم کو ایک مقررہ مدت تک رہنا ہوگا اور ہماری طرف سے ہدایت کا پیغام آئے گا جو اس کی اتباع کرے گا وہ غم وحزن سے محفوظ ہوگا اور جو انکار کرے گا وہ جہنم رسید کیا جائے گا حضرت آدم اور حوا علیہما السلام دنیا میں زمین پر اتار دئے گئے اور یہ حضرات اپنی خطا پر اللہ سے گڑگڑاتے اور توبہ کرتے رہے کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔

واقعہ آدم اور قرآن

یہ واقعات قرآن کریم میں کہیں اختصارا واجمالا اور کہیں توضیحا اور تفصیلا مذکور ہیں، حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر قرآن میں پچیس مرتبہ پچیس آیات میں آیا ہے اور ان میں بعض جگہ واقعہ بھی مذکور ہے اور بعض جگہ صرف نام آیا ہے واقعہ کی تفصیل درجہ ذیل مقامات پر آئی ہے:

(۱) البقرۃ ۳۰ تا ۳۸ (۲) الأعراف ۱۱ تا ۲۴ (۳) الحجر ۲۶ تا ۴۱ (۴) الکھف ۵۰ (۵) طٰہٰ ۱۱۵ تا ۱۲۳ (۶) صٓ ۷۱ تا ۸۳ (۷) الإسراء ۶۱ تا ۶۵۔

عبرت ونصائح

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا قرآن کوئی تاریخی کتاب نہیں؛ بل کہ وہ ایک صحیفہ ہدایت ہے اس لیے قرآن کریم نے اس واقعہ کو پیش کرنے کے ساتھ ہماری عبرت ونصیحت کیلئے واضح اشارے بھی فرمائے ہیں۔

(۱) حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام کی فوقیت و برتری کو صفت علم کی بنیاد پر ثابت کر کے اس جانب اشارہ فرمایا گیا کہ انسان کی عظمت و برتری اور خلافت ارض کی اہلیت و صلاحیت علم پر موقوف ہے اگر اس کے پاس علم ہے تو وہ اس منصب کا اہل ہے ورنہ وہ اس کا اہل نہ ہوگا۔

(۲) فرشتوں نے اپنے علم کے اعتبار سے آدم و ذریت آدم کے بارے میں یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ فساد کریں گے اور خون ریزی کریں گے اس کے جواب میں اللہ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَالَا تَعْلَمُوْنَ﴾ (البقرۃ: ۳۰)

جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اس طرف اشارہ کر دیا گیا کہ بندوں کی عقل وفہم ان کا علم و بصیرت محدود و ناقص ہے اس لیے جب کوئی الٰہی حکم و فرمان سامنے آئے تو اور اپنی عقل وفہم اور علم و دانش میں کھٹکے تو سمجھنے لینا چاہئے کہ یہ ہماری عقل کے فطور اور علم کے قصور کا نتیجہ ہے۔

(۳) شیطان نے سجدۂ آدم سے انکار کیا اپنی بڑائی جتانے لگا قرآن نے اس کے انکار اور کفر کی وجہ یہی تکبر بتائی ہے۔ معلوم ہوا کہ تکبر اس قدر بری اور قبیح چیز ہے کہ وہ کفر تک پہونچا دیتی ہے اس کے برخلاف عاجزی و انکساری ہدایت پانے کے لیے پیش خیمہ کا کام دیتی ہے۔

(۴) شیطان نے گناہ کیا اور اس پر آخر تک اڑا رہا اور حضرت آدم عَلَیْہِ السَّلَام سے جب خطا ہوئی تو فوراً معذرت خواہی کے لیے آمادہ ہو گئے۔ قرآن نے شیطان کے اس تمرد و سرکشی پر اصرار اور اس کی حجت باری کا ذکر کر کے اس کے لیے لعنت کی سزا سنائی اور اس کے برخلاف آدم عَلَیْہِ السَّلَام کی توبہ و انابت کا ذکر

کر کے فرمایا اللہ کی عنایت وتوجہ حضرت آدم علیہ السلام پر ہوئی:

﴿ فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ﴾ (البقرۃ: ۳۷)

اس سے اشارہ ہے۔اس طرف کہ بندہ سے خطا یا گناہ ہو جائے تو شرافت کا بندگی وعبودیت کا تقاضہ ہے کہ وہ اس سے توبہ کر کے اللہ کی عنایت کا مستحق ہو یہ کہ مزید تمرد وسرکشی پر اصرار کر کے راندۂ درگاہ ہو۔

(۵) شیطان کے بارے میں جگہ جگہ وضاحت فرمائی گئی کہ وہ انسان کا کھلا ہوا دشمن ہے انسان کو دکھ پہنچانے کے لیے ہمہ وقت کمر بستہ رہتا ہے۔لہٰذا انسان کو اس کے وساوس پر عمل کر کے اپنے آپ کو ہلاک نہ کرنا چاہئے۔اور نہ اس کی پر از مکر و فریب باتوں سے ہرگز ہرگز دھوکہ نہ کھانا چاہئے۔ورنہ جھوٹی قسمیں کھا کر وہ دھوکہ دیگا اور اس راحت وسکون سے باہر کر دیگا جس میں پہلے سے تھا **فاخرجهما من ما كانا فيه** میں اسی طرف اشارہ ہے۔

(۶) گناہ کے سرزد ہونے سے حضرت آدم وحضرت حوا علیہما السلام کا لباس اتر گیا اللہ تعالیٰ نے اس کا ذکر کر کے آگے چل کر فرمایا کہ تقوی کا لباس زیادہ بہتر ہے اس میں اشارہ ہے کہ ظاہری لباس سے اہم تقوی کا لباس ہے حضرت آدم علیہ السلام سے خطا کا سرزد ہونا تقوی کے خلاف تھا جب اصل لباس اتر گیا تو ظاہری لباس بھی اتر گیا۔

تذکرۂ حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیم علیہ السلام ان رسولوں میں سے ہیں جن کو اُولو العزم من الرسل کہا گیا ہے قرآن کریم نے مکی ومدنی دونوں قسم کی سورتوں میں ان کا ذکر بڑی عظمت و بزرگی کے ساتھ کیا ہے اور متعدد واقعات وحالات ذکر فرمائے ہیں اور ہر

واقعہ اپنے اندر ایک شان اعجاز رکھتا ہے۔ اور کڑی آزمائش اور سخت ترین ابتلاء کی نشان دہی کرتا ہے جس کی طرف قرآن نے بھی اشارہ کیا ہے۔

﴿وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ الخ﴾ (البقرة : ۱۲۴)

اور جب ابرہیم علیہ السلام کو ان کے رب نے چند باتوں میں امتحان لیا اور انہوں نے ان کو پورا کیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعدد واقعات میں سے چند اہم واقعات ذکر کر دینا چاہتا ہوں۔

شرک کا مقابلہ اور بے مثال جرأت

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیدائش ایک ایسے گھرانے اور ماحول و معاشرے میں ہوئی جو شرک و بت پرستی کی گھٹاٹوپ اندھیرے میں بھٹک رہا تھا جب آپ سن شعور کو پہنچے تو سارے خاندان اور شہر والوں کو شرک میں مبتلا دیکھا اور اس کی وجہ سے آپ کی توحید پرست طبیعت کڑھنے لگی اور آپ نے لوگوں کو توحید کا سبق دینا شروع کیا جس کے لیے لازم تھا کہ بتوں کی ربوبیت والوہیت کا انکار و نفی کی جائے اور الا اللہ سے پہلے لا الہ کا نعرہ بلند کیا جائے چناں چہ آپ نے یہی کیا اور اس کی وجہ سے لوگ آپ کی طرف انگلیاں اٹھانے لگے اسی اثناء میں وہ واقع پیش آیا جس نے آپ کو بڑی سخت آزمائش میں مبتلاء کیا اس کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے وہ یہ کہ ان کی قوم کا ایک مذہبی میلا ہونے والا تھا اور کچھ لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی اس میں چلنے کی دعوت دی؛ مگر آپ نے ناسازی طبع کا عذر فرمادیا لوگ سب کے سب میلے میں شہر کے باہر کسی میدان میں چلے گئے اور سبکے سب میلے کی خوشیوں میں مست اور شراب و کباب میں منہمک تھے اور شہر میں کوئی قابل ذکر آدمی نہ تھا تو

آپ نے ایک بڑے بت خانے کا انتخاب کیا اور وہاں جا کر سوائے ایک بڑے بت کے تمام بتوں کو توڑ ڈالا اور ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے اور واپس چلے آئے جب ان کی قوم کے لوگ واپس آئے اور بتوں کو اس طرح ذلیل وخوار ہوتے دیکھا تو آپس میں پوچھنے لگے کہ ہمارے بتوں کے ساتھ ایسا کس نے کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ ہم نے ایک نوجوان کو جس کو ابراہیم کہا جاتا ہے بتوں کو برا بھلا کہتے سنا ہے غالبا اسی نے ایسا کیا ہوگا لوگوں نے کہا کہ اس کو بلالا وَ چناں چہ آپ کو لایا گیا اور پوچھا گیا کہ اے ابراہیم کیا آپ نے ہمارے خداؤں کے ساتھ یہ معاملہ کیا ہے حضرت ابرہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے فرمایا:

﴿ بَلْ فَعَلَهٗ كَبِیْرُهُمْ هٰذَا فَسْـَٔلُوْهُمْ اِنْ كَانُوْا یَنْطِقُوْنَ﴾

(الانبیاء: ٦٣)

بل کہ ان کے اس بڑے خدا نے کیا ہے اگر یہ بول سکتے ہوں تو ان سے پوچھ لو۔

اس پر وہ لوگ کچھ دیر کے لیے حیران و پریشان ہوئے کہ کوئی جواب ان کے پاس نہ تھا کیوں کہ اگر وہ کہتے کہ یہ بول نہیں سکتے تو ان کا عاجز ہونا ثابت ہوتا اور اگر کہتے کہ ہاں بول سکتے ہیں تو یہ کھلا جھوٹ ہوتا۔لہٰذا حیران ہوئے ، پھر جب دیکھا کہ بتوں کے عجز کا اقرار کیے بغیر چارہ نہیں تو کہنے لگے کہ تم تو جانتے ہو کہ یہ بت بولتے نہیں اس پر حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام نے موقعہ کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کو دعوت فکر دی اور فرمایا:

﴿قَالَ اَفَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَالَا یَنْفَعُكُمْ شَیْـًٔا وَّلَا یَضُرُّكُمْ﴾ (الانبیاء: ٦٦)

(تو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر ان چیزوں کی پرستش کرتے ہو جو تم کو نہ تو

کوئی نفع پہونچا سکتا ہے اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں۔)

﴿أُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ﴾

(الأنبياء: ٦٧)

(نیز فرمایا کہ تم پر اور تمہارے ان معبودوں پر افسوس ہے جن کی تم اللہ کو چھوڑ کر عبادت کرتے ہو کیا تم کو عقل نہیں ہے۔)

حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کی حجت اور دلیل پوری ہوگئی اور جو آپ ان کو سمجھنا چاہتے تھے وہ ان کو سمجھا چکے اور ان کو خاموش بھی کر دیا؛ مگر ہمیشہ سے دنیا میں ایسا ہوتا چلا آیا ہے کہ جب غلط کار لوگ دلیل اور برہان کی طاقت کے سامنے ہار جاتے ہیں اور ان کے پاس کوئی علمی دلیل و برہان نہیں ہوتی تو ظلم و جبر پر اتر آتے ہیں، تمام نبیوں کے ساتھ اور اللہ والوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا ہے کہ مخالفین نے دلیل و برہان کا جواب نہ پایا تو ظلم پر اتر آئے۔ چناں چہ حضرت ابراہیم عَلَیْہِ السَّلَام کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی لوگوں نے کہا کہ اس کو جلا دو اور اپنے دیوتاؤں کی مدد کرو اگر کچھ کرنا نہ ہو۔ پھر ان کو جلانے کی تیاری کی گی اور بہت بڑی آگ دہکائی گئی ہر مشرک و کافر نے اس آگ کے بھڑکانے میں حصہ لینا باعث فخر و عزت جانا آگ تیار ہوگئی اور آپ کو آگ میں ڈالنے کی فکر شروع ہوئی ادھر اللہ کا فرشتہ حضرت جبرئیل عَلَیْہِ السَّلَام آپ کے پاس حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اگر چاہو تو میں آپ کی مدد کروں آپ نے فرمایا کہ مجھے میرا اللہ کافی ہے جب آپ کو آگ میں ڈال دیا گیا تو اللہ کا حکم آگ کو پہنچا۔

﴿يٰنَارُ كُونِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى إِبْرَاهِيْمَ﴾ (الأنبياء: ٦٩)

(اے آگ تو ابراہیم پر ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو جا۔)

پس آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لئے گل گلزار بن گئی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ان کی قوم نے ان کے ساتھ برائی کرنی چاہی؛ لیکن ہم نے خود ان کو خسارہ میں ڈال دیا۔

درس عبرت

اس واقعہ میں بھی ہمارے لیے عبرت کے کئی سبق دئے گئے ہیں:

(۱) شرک میں مبتلا لوگوں کی حماقت و جہالت بتائی گئی کہ خود مانتے ہیں کہ ان بتوں میں بولنے اور کچھ کرنے اور نفع پہنچانے کی کوئی طاقت وقدرت نہیں پھر بھی ان کی محبت میں سرشار اور ان کی غلامی و بندگی میں گرفتار ہیں اسی طرح تمام مشرک قوموں کا حال ہے۔

(۲) حکمت عملی اور طریق دعوت میں مضبوطی و پختگی کا سبق بھی دیا گیا کہ دعوت کی راہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بتوں کو توڑ کر ایک بڑے بت کو چھوڑ ادیا کیوں کہ ان کو معلوم تھا کہ ان لوگوں کی طرف سے اس کی تفتیش ہوگی اور مجھے ہی اس کا مرتکب قرار دیا جائے گا اور مجھ سے پوچھا جائے گا تو دعوت حق کے پیش کرنے اور شرک کی برائی اور توحید کی فضیلت ثابت کرنے کے لیے بہترین موقعہ ہاتھ آئے گا۔ چناں چہ ایسا ہی ہوا اور حضرت ابراھیم علیہ السلام نے پوری مضبوطی وتوانائی کے ساتھ بتوں کی عاجزی و بےبسی ظاہر کر دی۔

(۳) دین حق کی راہ میں ہر تکلیف ومصیبت کو برداشت کرنے کا سبق بھی اس میں ملتا ہے کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام نے آگ میں گرنا گوارا کرلیا؛ مگر دین سے اور دعوت دین سے منہ نہیں موڑا اور پوری طرح حق پر جمے رہے ایک داعی دین کو اسی طرح پر قائم رہنا اور اس کے لیے ہر قسم کی مصیبت کو برداشت کرتے رہنا چاہیئے۔

(۴) نیز اس واقعہ سے اللہ پر اعتماد وتوکل اور اس کی طرف انابت کا عظیم ثمرہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ تعالی مخالفین کو ذلیل ورسوا کرتا ہے اور اس کی تدبیروں وسازشوں کو ناکام کرتا ہے اور اہل حق کا ساتھ دیتا ہے۔

لخت جگر کی قربانی

حضرت ابراھیم عَلَيْهِ السَّلَام اللہ کے خلیل اللہ تھے:

﴿وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ خَلِيْلًا﴾ (النساء: ۱۲۵)

اس لیے آپ کی آزمائش بھی بڑی سخت ہوئی انہی آزمائشوں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کو خواب میں بتایا گیا کہ اپنے لخت جگر ونور نظر اسماعیل کو ذبح کر کے اللہ کے نام پر قربانی کرو اور اللہ سے خلت ومحبت کا ثبوت پیش کرو خواب دیکھ کر حضرت ابراھیم عَلَيْهِ السَّلَام نے اپنے لخت جگر سے فرمایا:

﴿يٰبُنَيَّ اِنِّيْۤ اَرٰى فِي الْمَنَامِ اَنِّيْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى﴾ (الصافات: ۱۰۲)

"اے بیٹے! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھ کو ذبح کر رہا ہوں، پس دیکھ لے کہ تیری کیا رائے ہے۔"

یعنی تمہاری اس حکم خداوندی پر عمل کرنے کے بارے میں کیا رائے ہے؟ حضرت ابراھیم عَلَيْهِ السَّلَام نعوذ باللہ حضرت ابراھیم عَلَيْهِ السَّلَام کی رائے پر تعمیل حکم کو موقوف ومعلق نہیں کیا تھا؛ بل کہ اس سوال کا منشا دراصل حضرت اسماعیل عَلَيْهِ السَّلَام کا امتحان لینا تھا جیسے استاذ کبھی شاگرد سے رائے پوچھتا ہے پوچھنے کا منشا یہ ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم وتربیت کے اثرات معلوم کیے جائے، اسی طرح حضرت ابراھیم عَلَيْهِ السَّلَام نے یہ دیکھنا چاہا کہ خاندان نبوت کے پروردہ لخت جگر میں اللہ

پر مر مٹنے کا کتنا جذبہ پیدا ہوا ہے؟ اس سوال پر حضرت اسماعیل علیہ السلام نے اپنے شایانہ شان جواب دیا کہ:

﴿ قَالَ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ﴾ (الصافات: ۱۰۲)

(اے ابا جی! آپ کو جس بات کا حکم دیا گیا اس کو کر گزرئے انشاء اللہ آپ مجھ کو صبر کرنے والوں میں پائیں گے۔)

یہ جواب بلا شبہ ایک نبی کے شایانہ شان ہے اس سے حضرت ابراھیم علیہ السلام کو جس قدر خوشی ہوتی ہے اس کا اندازہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس نے اپنی اولاد کو تعلیم وتربیت دی ہو اور وہ اس پر پورا پورا اترا ہو اور باپ کے منشا و مقصد پورا کرنے میں لگا ہو غرض حضرت ابراھیم علیہ السلام اپنے لخت جگر کو لے کر قربان گاہ پر پہنچے اور ان کو پیشانی کے بل لٹا دیا اور گردن پر چھری چلانے لگے؛ مگر چھری نے کاٹنے سے گویا انکار دیا اور اسماعیل کی گردن کٹ نہ سکی اور دوسری طرف اللہ کی جانب سے حضرت ابراھیم علیہ السلام کو پکارا گیا فرماتے ہیں:

﴿وَنَادَيْنٰهُ اَنْ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ﴾

(الصافات: ۱۰۴-۱۰۵)

(اور ہم نے ان کو پکارا کہ اے ابراھیم آپ کو خواب کو سچ کر دکھایا ہم نیک کام کرنے والوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔)

پھر اللہ نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ذریعہ جنت کا ایک مینڈھا بھیجا

اور وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی جگہ ذبح کیا گیا اور یہی وہ قربانی کا عمل ہے جو شریعت اسلام میں آج تک زندہ ہے۔

درس عبرت

اس واقعہ سے یہ سبق دیا گیا کہ اللہ کی محبت کے مقابلہ میں کسی چیز کی محبت کوئی حیثیت نہیں رکھتی اور اس کے مقابلہ میں ہر چیز کو قربان کیا جا سکتا ہے مال دولت تو ایک طرف اگر اللہ کی محبت میں اولاد کو ذبح کرنا پڑے تو انسان اس سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے پھر اس واقعہ میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا اللہ کے نام پر مر مٹنے کا جذبہ ذکر کیا گیا اور اس میں سبق ہے کہ ہر مومن کو اس طرح اللہ کے حکم کی تعمیل اور اس کے نام پر مر مٹنے کے لیے تیار رہنا چاہیے، اگر ہم اپنا سب کچھ قربان کر کے، اپنی جان، اپنی اولاد، اپنا مال اور دولت، سب کچھ لٹا کر، اللہ کو پا جائیں تو سمجھنا چاہیے کہ سستا سودا ہے۔

قیمت خود ہر دو عالم گفتہ ای
نرخ بالا کن ار زانی ہنوز

پھر اس میں یہ بھی بتایا گیا کہ قربانی میں جو جانور ذبح کئے جاتے ہیں اس سے مقصود یہی ہے کہ ہم اللہ کی محبت میں سرشار ہوں اور اس کے ہر حکم کو ماننے کے لیے تیار ہوں، محض جانور کو ذبح کر دینا اصل مقصود نہیں ہے یہ قربانی کی صورت ہے اور اصل اس کی روح ہے اور وہ محبت خداوندی میں سرشاری ہے یہ نہ ہو تو عمل کی صرف صورت صورت رہ جاتی ہے اور اللہ کے یہاں اصل کو اور روح کو دیکھا جاتا ہے جیسا کہ ایک جگہ فرمایا گیا:

﴿لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ﴾

(الحج : ۳۷)

قوم عاد اور حضرت ہود علیہ السلام

قرآن کریم نے جن اقوام کا ذکر کیا ہے ان میں قوم عاد بھی ہے اور یہ قوم عرب کے قدیم قبائل میں شمار ہوتی ہے کہا جاتا ہے کہ عرب کے قدیم باشندے کثرت افراد وقبائل کے اعتبار سے ایک باعظمت وسطوت جماعت کی حیثیت میں تھے، جو عرب سے نکل کر شام، مصر، بابل کی طرف بڑھے اور وہاں زبردست حکومتوں کی بنیادیں قائم کی، عرب ان باشندوں کو امم بائدہ یا عرب عاریہ کہتے ہیں اور ان کی مختلف زبانوں کو عاد، ثمود، طسم، اور جدیس کہتے ہیں اور یہ عاد بلا کسی اختلاف کے عرب نژاد ہیں اور عاد کا لفظ بھی عربی ہے اس کے معنے ہوتے ہیں بلند و مشہور قوم عاد کا مقام ارض احقاف ہے، بعض مورخین کہتے ہیں ان کی آبادی عرب کے سب سے بہترین حصہ حضر موت اور یمن میں خلیج فارس کے ساحل سے حدود عراق تک وسیع تھی اور یمن کا ان کا دار الحکومت تھا، اور یہ قوم بت پرست تھی اور صنم پرستی کے ساتھ صنم تراشی کی ماہر تھی اور قوم نوح کے جو بت تھے ود، سواع، یغوث، یعوق، اور نسر، وہی ان کے بت تھے۔ (۱)

اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت واصلاح کے لیے انہیں میں سے ایک معزز فرد حضرت ہود علیہ السلام کو نبی بنا کر بھیجا آپ نے اپنے فرض منصبی کے مطابق ان کو بت پرستی اور شرک سے باز آنے اور وحدانیت پر قائم ہونے کی دعوت دی، نیز ان کے ظلم وجور اور بغاوت وسرکشی دنیا میں انہماک اور آخرت سے اعراض پر ان کو تنبیہ فرمائی مگر ان میں اکثر لوگ اپنی دنیوی شان وشوکت اپنی قوت وطاقت اور اور مال ودولت کے گھمنڈ میں حضرت ہود علیہ السلام کی بات کو ماننے سے گریز کرنے لگے اور بحث ومباحثہ پر اتر آئے اور حضرت ہود علیہ السلام کی شان میں گستاخی کرنے لگے۔

---

(۱) قصص القرآن: ۱/۱۰۳-۱۰۴

حضرت ہود علیہ السلام نے ان سے فرمایا کیا تم اللہ سے ڈرتے نہیں میں تمہارے پاس معتبر رسول بنا کر بھیجا گیا؛ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو میں تم سے کوئی اجرت و بدلہ نہیں مانگتا میرا اجر و بدلہ تو رب العالمین ہے کیا تم اونچی زمین پر کھیلنے کو ایک شان بناتے ہو؟ اور ایسے صنعتیں بناتے ہو کہ تم کو یہاں ہمیشہ رہنا ہے اور جب کسی پر ہاتھ مارتے ہو تو ظلم و جبر کرنے والوں کا سا ہاتھ مارتے ہو، اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو اور اس (اللہ) سے ڈرو جس نے تم کو پہچائی وہ چیزیں جو جن کو تم جانتے ہو اور چوپائے اور بیٹے اور باغ اور چشمے دئے میں تم پر بڑے دن (قیامت کے دن) کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ (۱)

مگر حضرت ہود کی یہ نصیحتیں و ہدایتیں ان پر اثر انداز نہیں ہوئیں؛ بل کہ وہ لوگ اور زیادہ ضد و ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرنے لگے اور حضرت ہود علیہ السلام کا مذاق واستہزا کرنے لگے اور ان کو بیوقوف قرار دینے لگے؛ بل کہ ان کے دلائل و براہین کو جھٹلانے اور ان کو جھوٹا ٹھہرانے لگے چناں چہ کہا:

﴿قَالَ الْمَلَأُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖٓ اِنَّا لَنَرٰئكَ فِيْ سَفَاهَةٍ وَّاِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ﴾ (الاعراف: ٦٦)

(ہم تجھے اے ہود حماقت و بیوقوفی میں مبتلا دیکھتے ہیں اور ہم تو تجھے جھوٹوں میں سے سمجھتے ہیں۔)

نیز ان لوگوں نے کہا کہ اے ہود تو ہمارے پاس کوئی دلیل کے ساتھ نہیں آیا اور ہم تیری بات سے ہمارے معبودوں کو چھوڑنے والے نہیں اور نہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے اور ہم تجھ کو جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ تجھ پر ہمارے معبودوں اور دیوتاؤں

(۱) شعراء

میں سے کسی کی مار پڑ گئی ہے (ہود) اور کہا کہ ہم سے زیادہ قوت والا کون ہے؟(۱)

پھر حضرت ہود سے انہوں نے مطالبہ کیا کہ اگر تم جو عذاب کا وعدہ کرتے ہو وہ سچا ہے تو عذاب لے آؤ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا کہ عذاب کب آئے گا اس کا علم تو اللہ کو ہے؛ لیکن اگر تمہاری سرکشی اور طغیانی کی یہی حالت رہی تو ضرور عذاب آ کر رہے گا اور چوں کہ وہ لوگ حضرت ہود علیہ السلام کی ان کھری کھری باتوں کا جواب نہ دے سکے اس لیے ان کے خلاف مکر و سازش کرنے لگے حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا کہ تم سب کے سب مل کر میرے خلاف سازش کرلو اور مجھ پر کوئی مہلت نہ دو (مگر نتیجہ دیکھ لو) کیوں کہ میں تو اللہ پر بھروسہ کرتا ہوں جو کہ میرا پروردگار ہے اور تمہارا بھی پروردگار ہے۔

غرض جب قوم عاد انتہائی شرارت و بغاوت پر اتر آئی اور اپنے نبی کے خلاف سازش کرنے لگی تو قانون خداوندی کے تحت پاداش عمل اور قانون جزا کا وقت آ پہنچا اور اللہ کا غضب ان پر بھڑکا اور اولاً ان پر خشک سالی کا عذاب مسلط ہوا جس سے وہ عاز و درماندہ نظر آنے لگے حضرت ہود علیہ السلام نے دوبارہ ان کو سمجھاتے ہوئے فرمایا کہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اس کی طرف متوجہ ہو جاؤ وہ تمہارے اوپر آسمان سے برسنے والے بادل بھیجے گا اور تمہاری قوتوں پر نئی قوتیں بڑھا دے گا اور تم اس سے منہ نہ موڑو۔ (۲)

مگر وہ برابر اپنی سرکشی پر قائم رہے تب ان پر ہولناک عذاب بھیجا گیا اور ان کو بادل نظر آئے جو ان کی وادیوں کی طرف آ رہے تھے کہنے لگے کہ یہ بادل ہم پر برسیں گے

---

(۱) حم سجدہ

(۲) ہود

مگراسی میں انکا عذاب پوشیدہ تھا یہ ہوا تھی تیز وتند جب مسلسل آٹھ دنوں تک یہ ہوائیں اور آندھیاں ان پر چلائی گئیں تو ان کو اور ان کی آبادی کو انہوں تہہ وبالا کر کے رکھ دیا تنومند انسان بے حس وحرکت لاشوں کی شکل میں پڑے ہوئے تھے اور اپنی جسمانی طاقتوں اور قوتوں پر مغرور اور اپنی شان وشوکت کے گھمنڈ میں سرمست سرکشی انسان اس طرح پڑے ہوئے تھے جیسے کسی درخت سے شاخوں کو کاٹ کر ڈالا گیا ہو بس اس عذاب سے بچنے والے صرف وہ لوگ تھے جن کو سرمست وسرکشی مغرور لوگ حقارت آمیز نظروں سے دیکھتے تھے اور وہ اللہ کے پیغمبر حضرت ہود علیہ السلام کے ہاتھ ایمان لائے ہوئے تھے۔

عبرت وموعظت

قرآن کریم نے اس واقعہ کو متعدد جگہ بیان کیا ہے۔ سورۂ اعراف ، ہود، مؤمنون، شعراء، حم سجدہ، احقاف، ذاریات، قمر، الحاقہ۔ کہیں اختصارا واشارۃ ذکر آیا ہے بعد کہیں تفصیلا اس کو پڑھتے ہوئے ایک انسان کو جو عبرت وموعظت کا سبق ملتا ہے وہ یہ کہ

۱- دنیوی شان وشوکت عزت وعظمت ، طاقت وحکومت انسان کو مغرور وسرکش بنا دیتے ہیں اور ان چیزوں کا نشہ اس کو خدا اور رسول اور اللہ والوں سے گستاخی وشرارت وبغاوت پر آمادہ کر دیتا ہے؛ مگر اس کا نتیجہ خود اس کی ہلاکت وتباہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لیے انسان کو ان چیزوں پر فخر وناز کر کے اور ان چیزوں کے نشہ میں گرفتار ہو کر خدا اور رسول سے بغاوت وسرکشی نہ کرنا چاہیے۔

۲- یہ بھی معلوم ہوا کہ کافر ومشرک اقوام وافراد کا طریقہ یہ رہا ہے کہ وہ خدا کے

نبیوں اور پیغمبروں کو نعوذ باللہ بیوقوف و احمق سمجھتے تھے حالاں کہ اللہ کے پیغمبر تمام مخلوق میں سب سے زیادہ عقل منداور صاحب بصیرت ہوتے ہیں؛ مگراس کا نتیجہ بھی وہی ہوتا ہے کہ آخر کار یہ لوگ رسوا ہوتے ہیں افسوس کے آج کفارومشرکین کی روش پر چلتے ہوئے بہت سے مسلمان بھی اللہ والوں کو علمائے دین کو بے عقل و بیوقوف سمجھتے ہیں اور اس کی بنیاد صرف یہ ہوتی ہے کہ یہ حضرات دنیا کی زندگی کو آراستہ کرنے اوراس کی فکر میں لگ کر آخرت سے غفلت برتنے پرنکیر کرتے ہیں حالاں کہ یہی انبیائے کرام نے بھی کیا تھا اوراس بنا پر کفار نے ان کو بے وقوف کہا تھا تو اس بنا پر علما کو بے وقوف کہنا دراصل کفار کی روش وطریقہ ہے۔

۳- اس واقعہ سے یہ عبرت بھی ہوتی ہے کہ آخر کار انجام بخیر صرف وہ طبقہ ہوتا ہے جو خدا اوراس کے رسول کی تعلیم پر عمل کرتا ہے اس لیے انسان کو صرف اللہ سے ڈرنے اور نبی کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کی ضرورت ہے۔

قوم سبا کا تذکرہ

ملک یمن کی مشہور قوم قوم سبا بڑی دولتمند اور ذی اقتدار تھی اور صدیوں تک پورے جاہ وجلال اور کروفر کے ساتھ وہاں کی حکومت کرتی رہی اور عیش وعشرت اور راحت ورفاہیت خوش حالی اور فارغ البالی میں اپنی بے نظیر آپ تھی۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رَحِمَہُ اللّٰہُ شیخ الہند کے ترجمہ پر فوائد تفسیر میں رقم طراز ہیں کہ مصنف ارض القرآن سبا کی عمارتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ اسی سلسلۂ عمارات میں ایک چیز بند آب ہے، جس کو عربِ حجاز ''مسد'' اور عرب یمن ''عرم'' کہتے ہیں عرب کے ملک میں کوئی دائمی دریا نہیں پانی پہاڑوں سے بہ کر ریگیستانوں میں خشک و ضائع ہوجاتا ہے زراعت کے مصرف میں نہیں آتا سبا مختلف مناسب وموقعوں پر پہاڑوں

اور وادیوں کے بیچ میں بڑے بڑے بند باندھ دیتے تھے کہ پانی رک جائے اور بقدر ضرورت زراعت کے کام میں آئے مملکت سبا میں اس طرح کے سینکڑوں بند تھے ان میں سب سے زیادہ مشہور سد مأرب ہے جو ان کے دارالحکومت مأرب میں واقعہ تھا شہر مأرب کے جنوب میں داہنے بائیں دو پہاڑ ہیں جن کا نام کوہ ابلق ہے۔ سبا نے ان دو پہاڑوں کے درمیان ۸۰۰ھ ق م میں سد مأرب کی تعمیر کی یہ بند تقریباً ایک سو پچاس فٹ لمبی اور پچاس فیٹ چوڑی ایک دیوار ہے اس کا اکثر حصہ تو آب افتادہ ہے تاہم ایک ثلث دیوار اب بھی باقی ہے۔"

ارناؤ ایک یورپین سیاح نے اس کی موجودہ حالات پر ایک مضمون فرنچ ایشائےٹیک سوسائٹی کے جرنل نے لکھا ہے اور اس کا موجودہ نقشہ نہایت عمدگی سے تیار کیا ہے اس دیوار پر جابجا کتابت ہیں۔ وہ بھی پڑھے گئے اس سد میں اوپر نیچے بہت سی کھڑکیاں تھی جو حسب ضرورت کھولیں اور بند کی جاسکتی تھیں سد کے دائیں بائیں مشرق و مغرب میں دو بڑے بڑے دروازے تھے جن سے پانی تقسیم ہو کر چپ و راست کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا اس نظام آب رسانی سے چپ و راست کے دونوں جانب اس ریگستانی اور شور ملک کے اندر ۳۰۰ سو میل مربع میں سینکڑوں کوس تک بہشت زار تیار ہو گئی تھی جس میں انواع و اقسام کے میوے اور خوش بودار درخت تھے۔ (۱)

قوم سبا کے اس بند کا ذکر قرآن کریم نے کیا ہے اور ان کے باغات کا ذکر بھی فرمایا ہے۔ ان کے باغات کے متعلق قوم سبا کا ایک معاصر مؤرخ اگاتھر شیدس جو یونان کا باشندہ تھا وہ لکھتا ہے:

"سبا عرب کے سرسبز و شاداب حصہ میں رہتے ہیں جہاں بہت

(۱) تفسیر بر حاشیہ ترجمہ حضرت شیخ الہند

اچھے اچھے اور بے شمار میوے ہوتے ہیں دریاء کے کنارے جو زمین ہے اس میں نہایت خوبصورت درخت ہوتے ہیں اندروں ملک بخورات دارچینی اور چھواروں کے نہایت بلند درختوں کے گنجان جنگل ہیں اوران درختوں سے نہایت شیریں خوشبو پھیلا کرتی ہے درختوں کے اقسام کی کثرت وتنوع کے سبب سے ہر قسم کا نام ووصف مشکل ہے جو خوشبو اس میں سے اڑتی ہے وہ جنت کی خوشبو سے کم نہیں اور جس کی تعریف لفظوں میں ادا نہیں ہوسکتی جو اشخاص زمین سے دور ساحل سے گزرتے ہیں وہ بھی جب ساحل کی طرف سے ہوا چلتی ہے تو اس خوشبو سے محظوظ ہوتے ہیں وہ گویا آب حیات کا لطف اٹھاتے ہیں۔"(۱)

عرض یہ کہ قوم سبا کو اللہ تعالی نے لطف و بہار کی زندگی عطا فرمائی تھی اور سرسبزی وخوش حالی کا تمام سامان مہیا فرمایا تھا چنانچہ قرآن کہتا ہے:

تحقیق قوم سبا کو تھی ان کی بستی میں نشانی دو باغ داہنے اور بائیں (بنی قوم کی زبانی اب سے کہا گیا ہے) کھاؤ روزی اپنے رب کی اوراس کا شکر کرو شہر ہے پاکیزہ اور رب ہے گناہ بخشنے والا۔(۲)

نیز فرمایا کہ:

﴿وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ وَبَيْنَ الْقُرَى الَّتِىْ بٰرَكْنَا فِيْهَا قُرًى ظَاهِرَةً وَّقَدَّرْنَا فِيْهَا السَّيْرَ سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ﴾

(سبا: ۱۸)

(اور ہم نے رکھی تھیں ان میں اوران بستیوں میں جہاں ہم نے برکت رکھی ہے ایسی بستیاں جو راہ پر نظر آتی تھیں اور منزلیں مقرر کردیں ہم نے

(۱) حوالہ سابق
(۲) سورۃ سبا

ان مین آنے جانے کی پھر وان میں راتوں کو اور دونوں کو امن سے۔)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

برکت والی بستیاں ملک شام کی ہیں یعنی ان کے ملک (یمن) سے شام تک راستے مامون تھے سڑک کے کنارے کنارے دیہات کا سلسلہ ایسے اندازے اور تناسب سے چلایا گیا تھا کہ مسافر کو ہر منزل پر کھانا، پانی اور آرام کرنے کا موقعہ ملتا تھا آبادیوں کے قریب ہونے اور جلد جلد نظر آنے سے مسافر کا جی نہیں گھبراتا تھا نہ چوروں ڈاکوؤں کا کوف تھا سفر کیا تھا ایک طرح سیر تھی۔(۱)

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ مصنف ''ارض القرآن'' کے حوالہ سے وہ لکھتے ہیں:

''سبا کی دولت وثروت کی اساس صرف تجارت تھی یمن ایک طرف سواحل ہندوستان کے مقابل واقع ہے اور دوسری طرف سواحل افریقہ کے سونا بیش قیمت پتھر مسالہ خوشبوئیں، ہاتھی دانت، یہ چیزیں حبش اور ہندوستان سے ٹھیک یمن آکر اترتی تھیں وہاں سے سبا اونٹوں پر لاد کر بحر احمر کے کنارے خشکی خشکی حجاز سے گزر کر شام ومصر لاتے تھے، ان تجارتی کاروانوں کی آمد ورفت کے سبب یمن سے شام تک آبادیوں کی ایک قطار قائم تھی جہاں بے خوف وخطر سفر ہوسکتا تھا۔'' (۲)

---

(۱) فوائد بر حاشیہ ترجمہ شیخ الہند

(۲) حوالہ سابق

اللہ کی ان عنایات اور نعمتوں سے استفادہ کر کے اللہ کا شکر بجالانے اور اللہ کے نبیوں پر ایمان لا کر ان کی تعلیمات پر عمل پیدا ہونے کا ان کو حکم تھا کہتے ہیں کہ ان میں تیرہ انبیاء تشریف لائے تھے؛ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا؛ بل کہ اللہ سے اعراض کیا اور صرف لذات وخواہشات کی پیروی کرنے لگے اس کے نتیجہ میں اللہ کا عذاب ان پر نازل ہوا پھر ان کے لیے اللہ نے جو رحت رسانی کا سامان کیا تھا اس کی ناشکری کرتے ہوئے انہوں نے اللہ سے کہا:

(اے رب ہمارے! ہمارے سفروں اور دراز کر دے۔)(۱)

اس اعراض وغفلت اور ناشکری پر اللہ کا عذاب ان پر آیا کہ پانی روکنے کے لیے جو بند انہوں بنایا تھا وہ بند ٹوٹا، تمام باغات اور زمینیں غرقاب ہوگئیں اور ان اعلی درجہ کے نفیس میوؤں اور پھلوں کی جگہ نکمے درخت اور جھاڑ جھنکاڑ رہ گئے اور انگور چھارے غیرہ کی جگہ جھاؤ پیلو اور کیلے اور بدمزہ پھل اگنے لگے.

حضرت شاہ عبدالقادر دہلوی رحمۃ اللہ موضح القرآن میں لکھتے ہیں:

”جب اللہ نے چاہا عذاب بھیجے، گھونس پیدا ہوئی اس پانی کے بند میں اس کی جڑ کرید ڈالی ایک بار پانی نے زور کیا بند کو توڑ ڈالا وہ پانی عذاب کا تھا جس زمین پر پھر گیا کام سے جاتی رہی۔“(۲)

نیز قرآن نے فرمایا:

﴿فَجَعَلْنٰهُمْ اَحَادِيْثَ وَمَزَّقْنٰهُمْ كُلَّ مُمَزَّقٍ﴾ (سبا :۱۹)

(پھر ہم نے کر دیا ان کو کہانیاں اور ان کو چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔)

---

(۱) سورۂ سبا

(۲) موضح القرآن

یعنی اللہ نے ان کے شیرازہ کو منتشر کر دیا اور ان کو پارہ پارہ کر دیا ان کے اکثر قبیلے وخاندان ادھر اُدھر منتشر ہو گئے اور اب ان کا نام ونشان بھی باقی نہ رہا اور سب کے سب ختم ہو گئے اور صرف ان کی کہانیاں رہ گئیں تاکہ سننے والے عبرت حاصل کریں۔

شاہ مصر فرعون کی سرکشی وتباہی

قرآن کریم نے عظیم پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کثرت کے ساتھ کیا ہے ان کے بے شمار واقعات تفصیلی طور پر قرآن نے بیان فرمائے ہیں ان کے واقعات میں فرعون شاہ مصر کا تذکرہ بھی بڑی اہمیت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کیوں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کو اسی کی طرف اولا بھیجا گیا تھا تاکہ اس کو راہ راست پر لانے کی کوشش کریں چوں کہ یہ اپنے زمانہ کا سب سے بڑا سرکش اور خدا کا باغی ودشمن تھا؛ بل کہ خود خدائی کا دعوے دار بھی تھا اس لیے اس کی شرارتوں وخباثتوں اور سرکشیوں اور بغاوتوں کو پوری تفصیل کے ساتھ پیش کیا گیا تاکہ بعد میں آنے والوں کے لیے عبرت پذیری کا کام دے۔فرعون دراصل شاہان مصر کا لقب ہے کسی شخص کا نام نہیں مصر پر متعدد خاندان حکمران رہے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو فرعون مصر پر حاکم تھا عام مفسرین اس کا نام ولید بن مصعب بن زیان یا مصعب بن ریان بتاتے ہیں اور بعض اہل تحقیق نے اس کا نام ریان یا ریان ابا بتایا ہے اور جدید عصری وحجری تحقیقات کہتے ہیں کہ اس کا نام منفتہ بن رمسیس ثانی ہے جو ہجری ۱۲۹۲ق م سے لیکر ۱۲۲۵ق م تک جو مصر پر حکمرانی کرتا رہا ہے۔

بہ ہر حال! یہ فرعون نہایت سرکش وظالم اور خدائی کا دعویدار تھا اور ''انا ربکم االاعلی'' کہا کرتا تھا اس نے بنی اسرائیل کو جو حضرت یوسف علیہ السلام کے زمانہ سے مصر آ کر آباد ہو گئے تھے اپنی اور اپنی قوم کی خدمت وغلامی کے لیے مقرر کر

دیا تھا اور یہ انتہائی ذلیل وگھٹیا کام ان سے لیا کرتا تھا ایک دن اس نے خواب دیکھا کہ ملک شام کی طرف سے ایک آگ آئی اور اس کے محل کو جلا کر خاک کر دیا صبح اٹھ کر پریشان ہوا اور معبرین سے اس کی تعبیر معلوم کیا سب نے یہی کہا کہ بنی اسرائیل میں ایک لڑکا پیدا ہوگا اور فرعون کی حکومت اسی کے ہاتھوں تباہ ہوگی اور خاک میں ملے گی یہ سن کے وہ بہت پریشان ہوا اور اہل الرائے لوگوں سے اور نجومیوں سے مشورہ کیا کہ کوئی ایسی تدبیر بتاؤ کہ وہ لڑکا زندہ نہ رہ سکے اور میری حکومت کے لیے جو خطرہ ہے وہ ٹل جائے۔

بہ ہر حال! مشورہ ہوا اور طے ہوا کہ بنی اسرائیل میں جو بھی بچہ پیدا اس کو قتل کر دیا جائے چناں چہ بنی اسرائیل میں جو بچہ پیدا ہوتا وہ جاسوس کے اطلاع قتل کر دیا جاتا اسی طرح ہزاروں بچے قتل کر دئے گئے اور جب حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام کی پیدائش ہوئی تو ان کی والدہ اور اہل خاندان نے ان کو کسی جگہ چھپا دیا اور کسی کو خبر نہ ہونے دی پھر چوں کہ جاسوس لوگوں کو خطرہ تھا اس لیے موسی کی والدہ پریشان رہا کرتی تھی اسی اثنا میں اللہ نے ان کے دل میں ڈالا کہ بچہ کو ایک صندوق میں رکھ کر سمندر میں ڈالدو ہم اس کی حفاظت کریں گے اور پھر تم تک اس بچہ کو واپس بھی پہنچائیں گے اور آخر کار رسولوں میں سے بنائیں گے حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَام کی والدہ نے ایسا ہی کیا وہ صندوق جب دریا کے حوالہ کیا گیا تو موسیٰ کی والدہ نے اپنے لڑکی کو فرمایا کہ تم اس صندوق پر نظر رکھنا کہاں جاتا ہے؟ وہ صندوق سید ھے فرعون کے محل کی طرف گیا اور سمندر کی جو شاخ فرعون کے محل میں گئی تھی اسی سے فرعون کے محل میں داخل ہو گیا وہاں چند باندیاں نہانے دھونے میں تھی انہوں نے صندوق کو ادھر آتے دیکھ کر ادھر توجہ کی اور جب وہ قریب آیا تو اس کو لیا اور کھولا تو اس میں حسین

بچہ تھا اور سب کو پسند آ گیا حتی کہ فرعون کی بیوی آسیہ نے کہا ہم اس کو بچہ بنالیں ؛ مگر فرعون نے خطرہ کا اظہار کیا؛ مگر جب آسیہ نے سمجھایا تو وہ راضی ہو گیا اب مسئلہ یہ تھا کہ بچہ کو دودھ پلانے کا انتظام کیا جائے ؛ مگر حضرت موسی کسی عورت کا دودھ پینے تیار نہ ہوئے حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ کی بہن صندوق کا پیچھا کرتے ہوئے تماشہ دیکھنے کے بہانے محل میں پہنچ گئی اور جب موسیٰ کسی عورت کا دودھ پینے تیار نہ ہوئے تو بطور مشورہ کہ کہا کہ کیا میں ایسی عورت کی نشاندہی کروں جو اس کی کفالت کر سکے؟ لوگوں نے کہا کہ ہاں لے آؤ یہ سن کر حضر موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ کی بہن اپنی والدہ کے پاس آئی اور پوری صورت سے آگاہ کیا اور والدہ کو محل میں لے گئی جب ان کے پاس بچہ کو دیا گیا تو بچہ ان کی چھاتیوں سے از خود دودھ پینے لگا اور اہل محل سب خوش ہو گئے اور حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ ان کے ماں کے سپرد کیا گیا کہ وہ اس کی کفالت کرے اور کبھی کبھی محل لا کر دکھا لے جائیں اور اس کے لیے ان کی والدہ کو بادشاہ کی جانب سے تنخواہ اور وظیفہ بھی ملنے لگا۔ بہ ہر حال اس طرح اللہ کا وعدہ پورا ہوا اور حضرت موسیٰ عَلَیْہِ السَّلَامُ اپنی والدہ کے آغوش تربیت میں ہی پہنچ گئے دو سال کے بعد پھر محل میں ان کو رکھ لیا گیا پھر ایک واقعہ اس وقت پیش آیا جب کہ آپ جوان ہو گئے تھے وہ یہ کہ ایک قبطی (فرعون کے قوم کے آدمی) کو آپ نے مار دیا؛ کیوں کہ وہ ایک بنی اسرائیل کے آدمی سے لڑ رہا تھا جب اس کو مارا تو وہ مر گیا اور آپ کو مصر چھوڑ کر مدین جانا پڑا اور وہاں ایک بزرگ (جس کو بعض نے حضرت شعیب عَلَیْہِ السَّلَامُ کہا ہے؛ مگر یہ صحیح نہیں) کے پاس خدمت کرتے ہوئے دس سال رہے اور ان کی لڑکی سے شادی کی پھر مصر کی طرف واپس آئے راستہ میں آپ کو وادیٔ سینا میں نبوت کے عظیم الشان منصب پر فائز کیا گیا اور حکم ہوا کہ آپ فرعون کے پاس جائیں اور اس کو دعوت دے

آپ سے فرمایا گیا۔

آپ فرعون کے پاس جائیں کہ وہ سرکش ہو گیا ہے پھر اس سے کہنا کہ تیرا جی چاہتا ہے کہ تو سنور جائے اور یہ کہ میں تجھ کو تیرے رب کا راستہ بتاؤں کہ تیرے دل میں خوف پیدا ہو جائے۔ (۱)

نیز آپ سے فرمایا کہ فرعون سے نرم کلامی سے پیش آنا شاید کہ وہ نصیحت قبول کر لے یا ڈر جائے اور اس سے کہنا کہ ہم اللہ کی طرف سے رسول بنا کر بھیجے گئے ہیں، بنی اسرائیل کو ہمارے ساتھ بھیج دے۔ (ان کو آزاد کر دے۔) (۲)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اسی کے ساتھ دو عظیم نشانیاں اور معجزہ عطا فرمائے گئے ایک یہ کہ عصا کو آپ نیچے ڈالتے تو وہ سانپ بن جاتا اور پھر اس کو پکڑ لیتے تو عصا ہو جاتا اور دوسرے یہ کہ آپ اپنا ہاتھ بغل میں دبا کر نکالتے تو وہ سفید ہو جاتا آپ ان معجزات کو لے کر حضرت ہارون علیہ السلام اپنے بھائی کے ساتھ جن کو بھی اللہ نے نبوت سے مشرف کیا تھا فرعون کے پاس گئے اور بتایا کہ ہم دونوں اللہ کے رسول ہیں جو تیری جانب بھیجے گئے ہیں پھر بنی اسرائیل کو آزاد کرنے کا مطالبہ کیا۔

اس نے اولاً موسیٰ پر اس کے احسانات گنائے پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جو ایک قبطی کو قتل کر دیا تھا اس کو یاد دلایا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ ہاں لاعلمی میں مجھ سے ایسی حرکت ہوئی ہے۔

پھر فرعون نے پوچھا کہ یہ رب العالمین جس کا تو ذکر کرتا ہے یہ کیا ہے و ما رب العالمین۔ رب العالمین وہ ہے جو زمین وہ آسمان اور ان دونوں کے مابین کی چیزوں کا رب ہے۔

فرعون اپنے درباریوں سے کہنے لگا کیا تم سنتے نہیں؟

---

(۱) النازعات

(۲) طٰہٰ

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بات جاری رکھتے ہوئے فرمایا:

''وہ تمھارا اور تمھارے باپ داداؤں کا رب ہے۔''

فرعون کہنے لگا:

''تمہارا یہ رسول جو تمھاری طرف بھیجا گیا ہے مجنون ہے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: وہ مشرق ومغرب کا بھی رب ہے اور ان چیزوں کا بھی رب ہے جو ان کے مابین ہے اس پر وہ چراغ پا ہوا۔ اور کہنے لگا:

''اگر تو نے میرے سوا کسی اور خدا ومعبود بنایا تو میں تجھے قیدیوں میں کر دوں گا۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں کوئی دلیل وبرھان لے آؤں تب بھی؟ فرعون نے اس پر دلیل کا مطالبہ کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عظیم معجزہ دکھایا اور ہاتھ سے اپنے لاٹھی نیچے ڈالدی اور وہ بہت بڑا اژدھا بن گئی۔ بعض روایت میں ہے کہ یہ منظر دیکھ کر وہ اپنے تخت سے کود کر نیچے آگیا اور موسیٰ علیہ السلام سے درخوست کی کہ آپ اس کو پکڑ لیجئے اس کے بعد اس نے مشورہ کیا کہ اور طے ہوا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام دراصل (نعوذ باللہ) ایک جادوگر ہیں اور جادو کے بل بوتے وہ فرعون کو مصر سے نکال کر خود حکومت کرنا چاہتے ہیں ہمیشہ سے کفار ومعاندین کا یہ طریقہ رہا ہے کہ وہ انبیا کے معجزات کو سحر وجادوگر دانتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ کو دیکھ کر فرعون اور اس کے لوگوں نے یہی کہا کہ یہ جادو ہے اس لیے تمام جادوگروں کو بلا کر اس کا مقابلہ کراؤ، حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے لیے تیار ہو گئے چناں چہ تمام شہروں سے بڑے بڑے جادوگروں کو بڑے وظائف وانعامات کا وعدہ دے کر لایا گیا اور مقررہ وقت پر تمام

لوگو درباری جادوگر سب جمع ہو گئے اور مقابلہ شروع ہوا جادوگروں نے پوچھا کہ اے موسیٰ تم پہلے ڈالو گے یا ہم اپنا جادو دکھائیں؟ حضرت موسیٰ علیہ السلام ! نے فرمایا کہ تم ہی پہلے ڈالو، انہوں نے رسیوں پر جادوں کیا تو وہ چلتے ہوئے سانپ معلوم ہونے لگے اور بہت سارے ہونے کی وجہ سے سارا میدان بھرا ہوا معلوم ہونے لگا یہ منظر دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دل میں ایک طبعی خوف وحراس بھی پیدا ہوا اللہ نے وحی بھیجی کہ اے موسیٰ خوف نہ کرنا اور فرمایا کہ اور آپ اپنا عصا ڈالیے آپ ہی غالب رہیں گے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ ایک بڑا اژدھا بن گئی اور وہ سارے سانپوں کو نگل گیا یہ حیرت انگیز معجزہ دیکھ کر جادوگر سمجھ گئے کہ یہ معجزہ ہے جادو نہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام حق پر ہیں اور سچے نبی ہیں؛ لہٰذا وہ سب کے سب اللہ کے سامنے سجدہ میں پڑ گئے اور کہا کہ ہم رب العالمین پر جو کہ ہارون اور موسیٰ علیہما السلام کا رب ہے ایمان لائے۔

یہ فرعون کے لیے ہدایت پانے کے لیے بڑا اچھا موقعہ تھا اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے لیے غنیمت موقعہ تھا؛ مگر وہ ہدایت پر آنے کے بجائے مزید سرکشی اور بغاوت پر اتر آیا اور کہنے لگا کہ یہ سارے جادوگر دراصل موسیٰ علیہ السلام کے شاگرد ہیں اور موسیٰ ان کا استاذ ہے اور یہ سب مجھ کو دھوکہ دینے کے لیے آئے تھے پھر ان کو دھمکی دینے لگا کہ میں تم کو سولی پر لٹکا دوں گا جادوگروں کے دلوں میں ایمان گھس چکا تھا اور پوری بشاشت وحلاوت ایمانی ان کو حاصل ہوگئی تھی کہنے لگے کہ تو جو کچھ کرسکتا ہے وہ صرف اس دنیا میں کر سکے گا جو تو کرنا چاہے کرلے بہ ہر حال وہ لوگ ایمان پر قائم رہے اور فرعون اپنے کفر پر جمارہا پھر وقتاً فوقتاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے یہاں تک کہ اس پر اور اس کی قوم پر اللہ

کی طرف سے مسلسل ولگا تار عذابات کا سلسلہ شروع ہوگیا تا کہ وہ چو نکے اور حق کی طرف رجوع کرلے؛ کبھی خون کا عذاب آیا کہ پانی وغیرہ چیزیں خون سے تبدیل ہو جاتی کبھی قحط کا عذاب بھیجا گیا کبھی مینڈک کا عذاب بھیجا گیا کہ ان کے کھانوں اور کپڑوں اوبستروں وغیرہ میں مینڈک ہی مینڈک پھرتے رہتے تھے اور کبھی ان پر جوئیں ڈال دی گئیں؛ مگر ہر بار وہ حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ سے وعدہ کرتا کہ اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ایمان لاؤں گا اب دعا کر دیجئے اور جب دعا کر دی جاتی اور عذاب ٹل جا تا تو پھر اسی سرکشی پر جم جاتے حتیٰ کہ خدا کی طرف سے اس کی ہلاکت کا فیصلہ ہوگیا اور اس کی پاداش عمل کا وقت آ گیا۔

اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ کو حکم دیا کہ بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات مصر سے نکل جائیں اور ملک شام کی طرف چلیں، اس وقت چھ لاکھ سے زائد بنی اسرائیل وہاں تھے حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ نے سب کو نکل نے کا حکم دے دیا اور راتوں رات یہ سب کے سب مصر سے نکل کر اس طرف چلے جہاں راستہ میں بہر قلزم پڑتا ہے جب بنی اسرائیل چلے گئے تو فرعون کو خبر ہوئی تو وہ اپنے لشکر کو لے کر ان کے تعاقب میں نکلا اور بنی اسرائیل بحر قلزم کے ساحل میں ٹہرے ہوئے تھے کہ ان کو راستہ نہیں مل رہا تھا جب پیچھے سے فرعون اور اس کے لشکر کو آتا ہوا دیکھا تو حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ سے بنی اسرائیل کہنے لگے کہ اے موسیٰ! اب تو ہم پکڑے گئے، حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ کو خدا پر اعتماد تھا کہا کہ ہر گز نہیں اللہ مجھے راستہ دکھائے گا اللہ نے حضرت موسیٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ کو وحی کے ذریعے سے بتایا کہ آپ اپنا عصا سمندر پر ماریئے، اس میں راستہ ہو جائیں گے، آپ نے عصا مارا سمندر میں حیرت ناک طور پر بارہ راستہ بن گئے، پانی دیواروں کی طرح کھڑا ہوگیا حضرت موسیٰ

عَلَيْهِ السَّلَامُ نے حکم دیا کہ اب ان راستوں سے گزرو بنی اسرائیل ان راستوں سے باطمینان چلنے لگے فرعون اور فرعونی لشکر نے جب دیکھا کہ یہ لوگ گزر رہے ہیں تو انہوں نے چاہا کہ اس راستہ سے چلیں؛ بل کہ فرعون نے ی ڈینگ بھی ماری کہ ان کو یہ راستہ میرے آنے سے ہی ملا ہے غرض وہ سب بھی اس سمندر میں داخل ہو گئے جب درمیان سمندر میں یہ لوگ گئے تو اللہ کا حکم آ گیا کہ سمندر پھر جاری ہو جائے، چناچہ وہ حسب سابق پوری قوت کے ساتھ جاری ہوگیا، اور فرعون اور اس کا لشکر سب کے سب غرق ہو گئے، اس موقعہ پر فرعون نے کہا کہ میں ایمان لاتا ہوں؛ مگر اس سے کہا گیا کہ اب ایمان لاتا ہے؟ جب کہ اس سے پہلے بغاوت کرتا رہا؛ بہ ہر حال یہ انتہائی درجہ کا بدنصیب اور محروم القسمتی کا شکار، عبرت ناک قسم کی موت سے دوچار ہوا اور عذاب خداوندی میں گرفتار ہوا۔

عبرت وموعظت

فرعون کی سرکشی و بغاوت اور اس کے نتیجہ میں اس کی تباہی و ہلاکت کی یہ پوری داستان مرقعہ عبرت ہے اس کی ہر کڑی عبرت کا ایک تازیانہ ہے جیسا کہ غور کرنے والوں پر مخفی نہیں.

یہ چند واقعات جو قرآن کریم نے پیش کئے ہیں بہ طور نمونہ پیش کئے گئے جن سے ادب اسلامی کی روح تازہ ہوتی ہے۔

اتفاق واختلاف

کے شرعی حدود

بسم اللہ الرحمن الرحیم
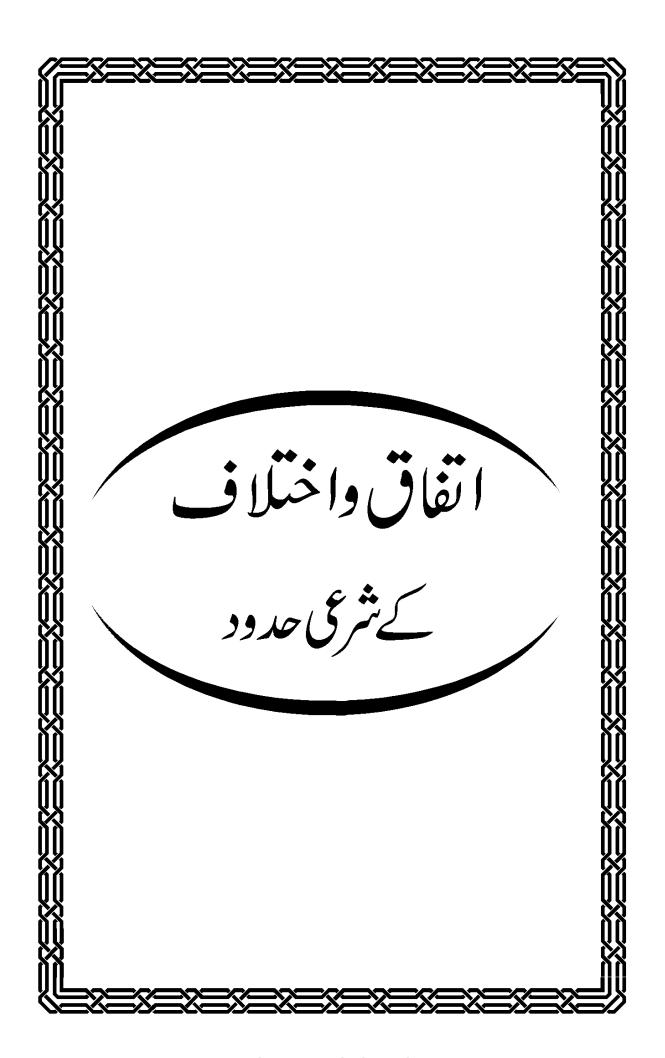
اتفاق واختلاف کے شرعی حدود وآداب

الحمد للّٰہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی سید المرسلین،
أما بعد:

اتفاق واختلاف ان الفاظ میں سے ہیں، جو بڑی کثرت کے ساتھ استعمال میں آتے رہتے ہیں اور بڑے سے لے کر چھوٹے تک سب ان کا استعمال کرتے رہتے ہیں۔ اور عموما یہ سمجھا جاتا اور سمجھایا جاتا اور بہت حد تک عوامی دنیا میں اور بعض علمی حلقوں میں بھی یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اتفاق محمود واچھی چیز اور اختلاف بری و مذموم بات ہے؛ لیکن حقیقت کے لحاظ سے جب غور وفکر کیا جائے؛ تو یہ بات سمجھنا کوئی مشکل نہیں کہ یہ خیال نہ عقلاً صحیح ہے اور نہ شرعاً اس کی کوئی حیثیت ہے۔

اولاً: تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اختلاف انسانی فطرت کا لازمہ اور میدان علم وعمل میں ایک ناگزیر چیز ہے، لہٰذا ایسی چیز کو مطلقاً مذموم و بری قرار دینا یا باور کرانا فطرت کا گلا کھوٹنے کے مترادف ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اپنے رسالے ”وحدت امت“ میں فرمایا:

”اختلاف رائے ایک فطری اور طبعی امر ہے، جس سے نہ کبھی انسانوں کا کوئی گروہ خالی رہا نہ رہ سکتا ہے، کسی جماعت میں ہر بات اور ہر کام میں مکمل اتفاق رائے صرف دو صورتوں میں ہوسکتا ہے: ایک یہ

کہ ان میں کوئی سمجھ بوجھ والا انسان نہ ہو، جو معاملہ پر غور کر کے کوئی رائے قائم کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو، اس لیے ایسے مجمع میں ایک شخص کوئی بات کہہ دے تو دوسرے سب اس پر اس لیے اتفاق کر سکتے ہیں کہ ان کے پاس کوئی رائے اور بصیرت ہی نہیں۔ دوسرے اس صورت میں مکمل اتفاق رائے ہوسکتا ہے کہ مجمع کے لوگ ضمیر فروش اور خائن ہوں کہ ایک بات کو غلط اور مضر جانتے ہوئے محض دوسروں کی رعایت سے اختلاف کا اظہار نہ کریں۔ اور جہاں عقل بھی ہو اور دیانت بھی، یہ ممکن نہیں کہ ان میں اختلاف رائے نہ ہو، اس سے معلوم ہوا کہ اختلافِ رائے عقل و دیانت سے پیدا ہوتا ہے؛ اس لیے اس کو اپنی ذات کے اعتبار سے مذموم نہیں کہا جاسکتا۔"(۱)

لہٰذا اولاً تو اختلاف کو علی الاطلاق مذموم قرار دینا خود مذموم ہے۔ دوسرے یہ کہ ہر اختلاف کو مذموم سمجھنا و سمجھانا بھی خلاف عقل ونقل ہے؛ کیوں کہ بعض جگہ اختلاف ضروری وفرض ہو جاتا ہے، مثلاً چوری کرنے والے سے ہر انسان کو اختلاف ہوتا ہے، اسی طرح کفر وشرک اور گناہ کی باتوں سے مؤمن کو اختلاف رکھنا اور اس کے اظہار کا موقعہ ہو تو اس کا اظہار کرنا بھی ایک لازمی بات اور ایمان و اسلام کا تقاضا ہے۔ معلوم ہوا کہ ہر اختلاف غلط و مذموم نہیں ہوتا۔

اسی طرح ہر اتفاق کو محمود سمجھنا اور باور کرنا بھی عقل ونقل کے خلاف ہے، کیوں کہ ہر کوئی جانتا ہے کہ کفر وشرک سے اہل اسلام کو اتفاق کرنے کی اجازت نہیں؛ بل کہ ان امور سے اپنی برأت و بے تعلقی کا اظہار اور ان امور کی شناعت وقباحت کا اظہار

(۱) وحدت امت:۴-۵

لازمی امر ہے اوران امور سے کوئی مسلمان اتفاق نہیں کرسکتا اور نہ کرنا چاہیے۔معلوم ہوا کہ ہر اتفاق کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔

جب یہ واضح ہوگیا کہ اتفاق و اختلاف میں سے ہر ایک اپنے موقعہ ومحل میں ہو تو صحیح بھی ہے اور اچھا بھی اور اگر اپنے موقعہ ومحل سے ہٹا ہوا ہے تو وہ غلط بھی ہے اور مضر بھی۔

اختلاف کی دو قسمیں

اس کے بعد ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کونسا اختلاف و اتفاق جائز ومحمود ہے اور کونسا ناجائز و مذموم؟ لیکن اس کو جاننے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ اختلاف دو قسم کا ہوتا ہے: ایک وہ جو اصول وعقائد میں ہو، دوسرے وہ جو فروعی وجزوی مسائل میں ہو۔پھر اصول میں اختلاف بھی دو قسم پر ہے۔

اصولی اختلاف:

(ا) ایک وہ جس سے اسلام و کفر کا اختلاف پیدا ہوتا اور ایک جانب والا مسلمان تو دوسری جانب والا کافر ٹھہرتا ہے۔جیسے قادیانی فرقہ کا اختلاف۔ظاہر ہے کہ اس فرقہ کا اختلاف معمولی اور جزوی وفروعی اختلاف نہیں ہے؛ بل کہ اتنا سخت اختلاف ہے کہ اس اختلاف کی بنا پر اس کا رشتہ اسلام سے اکسر کٹ جاتا اور ختم ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ اسلام کی تعلیم کے مطابق حضرت محمد صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم خاتم النبیین وآخر النبیین ہیں اور آپ کے بعد نبوت کا باب کلیۃً مسدود و بند کر دیا۔لیکن قادیانی فرقہ اس مسئلہ اور بنیادی عقیدہ کے خلاف پنجاب کے کذّاب ودجّال ایک جھوٹے دعویدار نبوت کو نبی مانتا ہے۔لہٰذا یہ اختلاف معمولی اختلاف نہیں اسی طرح شیعہ میں سے اس فرقے کا اختلاف جو موجودہ قرآن کو اللہ کی کتاب نہیں مانتا اور اللہ

کے بارے میں برا عقیدہ رکھتا ہے، یہ بھی بنیادی عقائد اور مسلمہ مسائل میں اختلاف ہے جس سے اسلام و کفر کا اختلاف پیدا ہوتا ہے۔

(۲) اور دوسرا اصولی اختلاف وہ ہے جس سے سنت و بدعت کا اختلاف پیدا ہوتا ہے اور ایک طرف کا حامل اہل سنت میں سے ہوتا ہے تو دوسرا بدعتی کہلاتا ہے۔ جیسے بہت سے اسلامی فرقوں قدریہ، جبریہ، معتزلہ، مجسمہ ومشبہہ، معطلہ وجہمیہ وغیرہ کا حال ہے، کہ یہ فرقے اہل سنت سے ہٹ گئے اور ان کے اختلاف سے شاہراہ سنت سے وہ الگ ہو گئے۔ اسی طرح بعض لوگوں کا حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیا اور اولیا کو عالم الغیب و حاضر و ناظر اور مشکل کشا وغیرہ ماننا، اسلام کے بنیادی عقائد کے خلاف ہے، اسی طرح اسلام میں نئی نئی باتوں کو پیدا کرنا اور دین کے نام پر رواج دینا اور ان بدعات وخرافات کے لیے آیات واحادیث میں بے جا تاویل بل کہ تحریف سے کام لینا بھی اختلاف کی اسی قسم میں سے ہے جو انسان کو سنت وشریعت کی شاہراہ سے ہٹا دیتا ہے۔

فروعی اختلاف

اور دوسرا اختلاف وہ ہے جو اجتہادی مسائل میں دلائل شرعیہ کی روشنی میں ہوتا ہے اور ایسا اختلاف صدرِ اول صحابہ کے زمانے سے برابر چلا آ رہا ہے؛ بل کہ اس قسم کا اختلاف خود دورِ رسالت میں بھی حضرات صحابہ کے درمیان ہوا ہے اور اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اختلاف کی دونوں جہتوں کی تصویب فرمائی ہے (اس کی تفصیل آگے آئے گی) کیوں کہ خود دلائل میں دونوں جہتوں اور شقوں کی گنجائش ہوتی ہے ایک بات منصوص اور فیصل نہیں ہوتی، ایسے اختلاف کو اجتہادی وفروعی اختلاف کہا جاتا ہے یہ اختلاف نہ مذموم ہے نہ ممنوع ہے؛ بل کہ یہ فطری وطبعی ہونے

کے ساتھ باعث رحمت بھی ہے۔

علامہ ابن بطہ اختلاف کی ان دونوں قسموں: اصولی وفروعی کا ذکر کرتے ہوئے ان دونوں کے مابین فرق بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے، وہ اپنی کتاب ”الابانة الکبری“ میں کہتے ہیں:

”وأما الاختلاف فهو ينقسم على وجهين: اختلاف، الإقرار به إيمان ورحمة وصواب، وهو الاختلاف المحمود الذى نطق به الكتاب ومضت به السنة، ورضيت به الأمة، وذلک فی الفروع والأحكام التي ترجع أصولها إلى الإجماع والائتلاف. واختلاف هو كفر وفرقة وسخطة وعذاب يئول بأهله إلى الشتات والتضاغن والتباين والعداوة واستحلال الدم والمال، وهو اختلاف أهل الزيغ في الأصول والاعتقاد والديانة.“

(اور اختلاف دو قسم پر ہے: ایک وہ اختلاف جس کا اقرار کرنا ایمان اور رحمت اور صواب ہے اور یہی وہ قابل تعریف اختلاف ہے جس کو قرآن و سنت نے بیان کیا ہے اور جس سے امت راضی ہے اور یہ اختلاف فروع و احکام میں ہوتا ہے جس کے اصول اجماع و اتحاد کی جانب لوٹ آتے ہیں۔ اور دوسرا اختلاف وہ ہے جو کفر اور فرقہ بازی اور اللہ کی ناراضی اور عذاب پر مشتمل ہے، جو اختلاف کرنے والوں کو آپسی افتراق، بغض و عداوت اور دوسروں کے جانوں اور مالوں کو حلال سمجھ لینے کی جانب لے جاتے ہیں اور یہ اصول اور عقائد اور دین میں اختلاف ہے۔)(۱)

(۱) الابانة الکبری: ۲/۵۵۷

اختلاف واتفاق کی مذموم ومحمود صورتیں

اس سے معلوم ہوا کہ ہر اختلاف مذموم و برانہیں ہوا کرتا، اور نہ ہر اتفاق محمود و قابل تعریف ہوا کرتا ہے، بلکہ ان میں الگ الگ درجات ہیں۔ مگر بعض لوگ شدید سے شدید اختلاف و اصولی اختلاف کو بھی یہ کہہ کر ہلکا و معمولی قرار دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ اس میں دو رائیں ونظریے ہیں، لہذا کوئی بڑی بات نہیں، حتی کہ ان اصولی و شدید اختلافات کو حضرات صحابہ وائمہ کے درمیان رونما ہونے والے اختلافات سے تشبیہ دیتے ہیں، حالانکہ صحابہ وائمہ میں جو اختلاف تھا وہ فروعی مسائل میں تھا، اصولی مسائل میں نہیں تھا۔

دوسری جانب کچھ حضرات وہ ہیں جو ہر اختلاف کو اصولی اختلاف وایمان وکفر کے اختلاف کا ہم پلہ سمجھتے ہیں اور اس سے وہی معاملہ کرتے ہیں جیسے اصولی اختلاف سے ہونا چاہئے، حالانکہ یہ اختلاف نہ کوئی مذموم ہے نہ ممنوع۔

فروعی اختلاف نہ مذموم ہے نہ ممنوع

اب ہم آگے بڑھتے ہوئے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ان دونوں قسم کے اختلاف کا حکم و درجہ یکساں نہیں ہے؛ بلکہ دونوں کے درجہ میں ایسا ہی فرق ہے جیسے زمین وآسمان میں اور حق و باطل میں اور حرام وحلال میں ہے۔ مگر بعض لوگ اس فرق کو نظر انداز کر کے دونوں اختلافات کے ساتھ یکساں سلوک کرتے ہیں اور دونوں کو مذموم وحرام قرار دیتے ہیں اور ان آیات واحادیث سے استدلال کرتے ہیں جو اختلاف کی قسم اول کے متعلق وارد ہوئی ہیں۔

مگر ظاہر ہے کہ ان آیات واحادیث سے صرف اس اختلاف کی مذمت و برائی

ثابت ہوتی ہے جو بغیر دلیل شرعی نفسانیت وشرارت سے کیا جائے اور بنیادی ومسلمہ عقائد ومسائل میں ہو لیکن دوسری قسم کا اختلاف جو دلائل کی روشنی میں کیا جائے۔ اور اجتہادی وفروعی مسائل میں ہو ان سے اس کا مذموم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

مثال کے طور پر قرآن میں متعدد جگہ فرمایا کہ:

﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾

(آل عمران : ۱۰۳)

(اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لو اور آپس میں اختلاف نہ کرو۔)

ایک جگہ فرمایا:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ.﴾

(آل عمران :۱۰۵)

(تم ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے اختلاف کیا اور متفرق ہو گئے۔)

ان آیات میں جس اختلاف سے ممانعت کی گئی ہے وہ وہ اختلاف ہے جو کفّار کی طرح عقائد ومسلمات میں کیا جائے جس سے انسان اسلام سے خارج ہو جاتا یا کم از کم سنت کی شاہراہ سے ہٹ کر بدعت کی گمراہی میں ملوث ہو جاتا ہے۔

چناں چہ مذکورہ بالا آیات میں سے آل عمران کی آیت ۱۰۳ کی تفسیر میں مشہور اہل حدیث عالم مولانا جونا گڑھی کے ترجمۂ قرآن پر حواشی میں مولانا صلاح الدّین یوسف صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

''وَلَا تَفَرَّقُوْا'' اور پھوٹ نہ ڈالو' کے ذریعہ فرقہ بندی سے روک

دیا گیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر مذکورہ دو اصولوں (تقوی اور اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑنا) سے انحراف کروگے تو تمہارے درمیان پھوٹ پڑ جائے گی اور تم الگ الگ فرقوں میں بٹ جاؤ گے، چناں چہ فرقہ بندی کی تاریخ دیکھ لیجیے، یہی چیز نمایاں ہوکر سامنے آئے گی قرآن وحدیث کے فہم اور اس کی توضیح وتعبیر میں کچھ باہم اختلاف یہ فرقہ بندی کا سبب نہیں ہے، یہ اختلاف تو صحابہ وتابعین کے عہد میں بھی تھا؛ لیکن مسلمان فرقوں اور گرہوں میں تقسیم نہیں ہوئے۔"

مذکورہ تشریح سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ ہر اختلاف مذموم نہیں ہے؛ بل کہ قرآن وحدیث کے فہم اور تشریح وتوضیح اور تفسیر وتعبیر میں صحابہ میں بھی اختلاف ہوا ہے اور ایسا اختلاف گروہ بندی وفرقہ بندی کا سبب بھی نہیں جس سے قرآن نے روکا ہے۔

ہاں جنھوں نے ان اختلافات فرعیہ کی بنیاد پر فرقہ بندیاں کیں ہیں وہ ضرور ماخوذ ہوں گے۔ معلوم ہوا کہ اجتہادی مسائل کا اختلاف ان آیات میں مراد نہیں ہے؛ بل کہ ان سے مراد اصولی اختلاف ہے۔

اسی طرح حدیث میں جس اختلاف وافتراق سے منع کیا گیا ہے اس سے مراد بھی یہی پہلی قسم کا اختلاف ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"بنی اسرائیل بہتّر (۷۲) فرقوں میں بٹ گئے اور میری اُمت تہتر (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی اور یہ سارے فرقے دوزخ میں جائیں گے سوائے ایک فرقہ کے صحابہ نے پوچھا کہ یارسول اللہ وہ ایک فرقہ کون ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جو اس طریقہ پر قائم ہو جس پر میں اور میرے صحابہ قائم ہیں۔"

اس حدیث میں جو اُمت کے اختلاف وافتراق کا ذکر کر کے سارے فرقوں کو جہنمی اور صرف ایک فرقہ کو جنتی قرار دیا گیا ہے، اس سے بھی یہ مسائل کا اختلاف مراد نہیں ہے؛ بل کہ عقائد واصول میں اختلاف مراد ہے، بعض لوگ اس حدیث کو پیش کر کے ان فرقوں سے حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی مکاتب فکر مراد لیتے اور ان مکاتب فکر کے لوگوں کو نعوذ باللہ جہنمی قرار دیتے ہیں؛ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا، اس حدیث سے یہ اختلاف ہرگز مراد نہیں۔

چناں چہ اہل حدیث کے مشہور عالم علامہ عبید اللہ مبارکپوری رحمہ اللہ نے مرقاۃ المفاتیح شرح مشکوۃ المصابیح میں مذکورہ حدیث کی شرح میں لکھا ہے:

> ''حدیث میں افتراق سے مراد مطلق افتراق نہیں ہے کہ اس میں وہ اختلاف بھی داخل ہو جائے جو فروعی مسائل میں خلفائے راشدین پھر دیگر صحابہ پھر تابعین پھر ائمہ مجتہدین کے زمانہ میں واقع ہوا؛ بل کہ مراد اس سے ایک خاص اختلاف وافتراق ہے اور وہ اختلاف وتفرق ہے جس سے پارٹیاں اور جماعتیں بن گئیں اور بعض نے بعض سے جدائی اختیار کی جو آپسی محبت والفت اور تعاون وتناصر پر قائم نہیں ہیں؛ بل کہ اس کی ضد یعنی ہجر، قطع تعلق عداوت اور بغض اور ایک دوسرے کی تضلیل وتکفیر وتفسیق پر قائم ہیں (پھر فرمایا کہ) کہا گیا ہے کہ اس اختلاف سے مراد اصول اور عقائد میں بدعتیں پیدا کرنا ہے۔ نہ کہ فروعات اور عملیات میں الخ۔''(۱)

علامہ عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ کی مذکورہ عبارت سے واضح ہوا کہ اس حدیث

(۱) مرقاۃ المفاتیح

میں وہ اختلاف مراد نہیں ہے جو فروعی و اجتہادی مسائل میں صحابہ وتابعین و ائمہ مجتہدین جیسے امام شافعی وامام مالک وامام ابوحنیفہ وامام احمد وامام اوزاعی وامام سفیان ثوری رحمہم اللہ وغیرہ کے زمانوں میں واقع ہوا۔

الغرض آیات واحادیث میں جس اختلاف کی مذمت وبرائی آئی ہے، اس سے پہلی قسم کا اختلاف مراد ہے یا اس سے مراد گروہ بندی وپارٹی بازی ہے، جس کی بنا پر ایک دوسرے کی تکفیر وتفسیق وتضلیل کی جائے اور ان جزوی مسائل کی بنا پر حسد و بغض رکھا جائے، یہ بلا شبہ سخت قبیح چیز ہے رہا فروعی مسائل میں آراء کا اختلاف جو قرآن وحدیث کے فہم اوران کی تعبیر وتشریح میں تفاوت کی بنا پر واقع ہوا وہ نہ قرآن وحدیث میں مذموم ٹھہرایا گیا نہ ممنوع قرار دیا گیا۔

فروعی اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ سلوک

اوراسی لیے فروعی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے سے عداوت ودشمنی یا ایک دوسرے پر ملامت و مذمت یا طعن وتشنیع کا رویہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے؛ بل کہ تمام ائمہ وعلما کا احترام اور عظمت کرنا چاہیے اوران سے محبت والفت کا طریق اپنانا چاہیے۔ چناں چہ سلفِ صالحین کے یہاں یہی نقشہ نظر آتا ہے۔

امام ابن بطہ رحمہ اللہ حضرات صحابہ کے مابین ہونے والے اختلافات فرعیہ کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

”فإن أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم اختلفوا في الحلال والحرام ومخارج الأحكام، فلم يخطئ بعضهم بعضا، فهم من أن يبدع بعضهم بعضا أبعد وهم من أن يكفر بعضهم بعضا بالتأويل أبعد.“

(بلا شبہ حضرات صحابہ نے حلال وحرام اور مخارج احکام میں اختلاف کیا ہے؛ مگر ان میں سے بعض بعض کو خطاوار نہیں قرار دیتے تھے، پس ان حضرات میں سے بعض بعض کو مبتدع قرار دیں یہ تو اور بعید ہے اور ان میں سے بعض بعض کو تاویل سے کافر ٹھہرائیں یہ تو اور بھی بعید ہے۔)(۱)

امام یحییٰ بن سعید تابعی رحمہ اللہ نے بڑی حقیقت افروز بات بیان فرمائی:

" أهل العلم أهل توسعة، و ما برح المفتون يختلفون، فيحلل هذا، و يحرم هذا ، فلا يعيب هذا على هذا، و لا هذا على هذا. "

(اہل علم توسع رکھنے والے ہیں اور ہمیشہ سے حضرات مفتیان میں مسائل میں اختلاف رہا ہے کہ یہ مفتی کسی چیز کو حلال کہتے ہیں تو دوسرے مفتی اس کو حرام قرار دیتے ہیں؛ لیکن نہ یہ ان پر کوئی عیب لگاتے نہ وہ ان پر کوئی نکتہ چینی کرتے۔)(۲)

اور اسی لیے حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے لوگوں سے یہ فرمایا تھا:

"إذا رأيت الرجل يعمل العمل الذي قد اختلف فيه وأنت ترى غيره فلا تنهه."

(اگر تو کسی شخص کو کوئی ایسا کام کرتے دیکھے جس میں اختلاف ہے اور تیری رائے اس کے خلاف ہو تو تو اس کو منع نہ کرنا۔)(۳)

---

(۱) الابانة: ۲۴۱/۶

(۲) تذكرة الحفاظ: ۱۲۴/۱

(۳) الفقيه و المتفقه: ۳۵۵/۲

بل کہ اس سے بھی آگے سلف کا خیال یہ تھا کہ یہ فروعی اختلافات امت کے حق میں رحمت ہیں اور ان اختلافات کا نہ ہونا کوئی پسندیدہ بات نہیں ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے:

"ما سرني لو أن أصحاب محمد صلى الله عليه وسلم لم يختلفوا؛ لأنهم لو لم يختلفوا لم تكن رخصةً."

(میرے لیے یہ بات کوئی خوشی ومسرت کی نہیں کہ صحابۂ رسول میں کوئی اختلاف نہ ہوتا؛ کیوں کہ وہ اگر اختلاف نہ کرتے تو امت کے لیے کوئی رخصت کا پہلو نہ ہوتا۔)(۱)

اور حضرت قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے فرمایا:

"كان اختلاف أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم رحمةً لهؤلاء الناس."

(حضرات صحابہ کا اختلاف ان لوگوں کے لیے رحمت تھا۔)(۲)

انہی قاسم بن محمد رحمہ اللہ نے ایک موقعہ پر یہ فرمایا:

" كان اختلاف أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم مما نفع الله به، فما عملت منه من عمل لم يدخل نفسک منه شيء."

(حضرات صحابۂ رسول کا اختلاف ان امور میں سے ہے جن سے اللہ نے نفع پہنچایا؛ لہٰذا ان میں سے کسی بھی عمل کو تو اختیار کر لے تو

---

(۱) الفقيه و المتفقه: ۳۳۶/۲

(۲) حلية الاولياء: ۱۱۹/۷

تیرے نفس میں کوئی شک شبہ نہ داخل ہوگا۔)(۱)

اور یہی حال ان مسائل اجتہادی میں جمہور امت کا اب تک رہا ہے، اور اسی میں خیر بھی ہے، علامہ ابن تیمیہ رَحِمَهُ اللّٰهُ نے کس قدر واضح الفاظ میں اہل اسلام کا اس طرز عمل کا مقام مدح میں تذکرہ کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ:

" وأما من ترجح عنده فضل إمام على إمام أو شيخ على شيخ بحسب اجتهاده، كما تنازع المسلمون: أيهما أفضل الترجيع أو تركه؟ أو إفراد الإقامة أو تثنيتها؟ وصلاة الفجر بغلس أو الإسفار بها؟ والقنوت في الفجر أو تركه؟ والجهر بالتسمية أو المخافتة بها، أو ترك قراء تها؟ ونحو ذلک: فهذه مسائل الاجتهاد التي تنازع فيها السلف والأئمة ، فكل منهم أقرّ الآخر على اجتهاده، من كان فيها اصاب الحق فله أجران ، ومن كان قد اجتهد، فأخطأ فله أجر ، وخطؤه مغفور له ، فمن ترجح عنده تقليد الشافعي لم يُنكِر على من ترجح عنده تقليد مالک ، ومن ترجح عنده تقليد أحمد لم يُنكِر على من ترجح عنده تقليد الشافعي."

(اور رہا وہ شخص جس کے نزدیک اس کے اجتہاد سے ایک امام کا دوسرے امام سے افضل ہونا یا ایک عالم کا دوسرے عالم سے بہتر ہونا راجح قرار پایا، جیسے مسلمانوں نے اختلاف کیا ہے کہ اذان میں ترجیع

(۱) الفقيه والمتفقه: ۲/۳۳۴

افضل ہے یا اس کا ترک؟ یا اقامت میں کلمات کا دو دو بار کہنا یا ایک ایک مرتبہ؟ اور فجر کی نماز غلس میں بہتر ہے یا اسفار میں؟ اور فجر میں قنوت افضل ہے یا اس کا ترک؟ بسم اللہ میں جہر ہے یا آہستہ پڑھنا یا اس کا نہ پڑھنا؟ وغیرہ، یہ اجتہادی مسائل ہیں جن میں سلف اور ائمہ نے اختلاف کیا ہے؛ لہٰذا جو شخص ان میں سے دوسرے کو اس کے اجتہاد پر برقرار رکھے تو ان میں سے جو حق کو پا گیا اسے دو اجر ہیں اور جس نے اجتہاد کیا اور خطا کر گیا تو اسے ایک اجر ہے اور اس کی خطا معاف ہے، لہٰذا جس کے نزدیک امام شافعی رحمہ اللہ کی تقلید راجح ہوئی وہ امام مالک رحمہ اللہ کی تقلید کو راجح سمجھنے والے پر انکار نہ کرے اور جس کے نزدیک امام مالک رحمہ اللہ کی تقلید راجح قرار پائی وہ امام شافعی رحمہ اللہ کی تقلید کو راجح سمجھنے والے پر انکار نہ کرے۔)(۱)

لہٰذا ائمہ کے درمیان ہونے والے اختلاف کو اسی حد میں رکھنے کی کوشش ہونی چاہئے؛ لیکن اب بعض لوگوں نے اسی کو حق و باطل کا معیار قرار دے کر امت کے شیرازے کو منتشر کرنا شروع کر دیا ہے اور خود کے اختیار کردہ مسئلے و مسلک کو صحیح و درست اور دوسرے کے مسلک کو باطل قرار دینے کی مذموم کوشش کی جاتی ہے، یہاں تک کہ ائمہ فقہا کی توہین و تذلیل کو دین سمجھنے و سمجھانے کی فکر کی جاتی ہے، یہ غلو کی وہ صورت ہے جس سے امت میں انتشار کا رونما ہونا یقینی بات ہے۔ حالاں کہ ہمارے خلاف ایک جانب عیسائی مشنریاں سرگرم عمل ہیں اور مسلمانوں کو دین و ایمان سے محروم کرنے اور عیسائی بنانے کی زبردست پیمانے پر کوششیں کر رہی ہیں۔

(۱) مجموع الفتاوی: ۲۰/۲۹۲-۲۹۳

دوسری جانب قرآن وسنت اور اس کے علوم کو مٹانے کی سازشیں بھی مال و دولت کا ایک بڑا حصہ لگا کر کی جارہی ہیں، پھر ایک طرف دیکھو تو مختلف باطل عقائد و نظریات کے حامل مذاہب اپنے اپنے نظریات وعقائد کو پھیلانے میں لگے ہوئے ہیں، جس سے مسلمانوں کے عقائد برباد ہوتے جارہے ہیں، تو دوسری جانب تجدد پسندی وموڈرنیزم نے مسلمانوں میں کھلے عام اباحیت پسندی وآزادی فکر کے جراثیم پیدا کردئے ہیں، ان سب حالات کے تناظر میں اگر ہم اپنا جائزہ لیں تو کیا ہمارے لیے کوئی گنجائش اس کی ہوسکتی ہے کہ ہم فروعی واجتہادی مسائل میں جن میں خود صحابہ کے دور سے اختلاف چلا آرہا ہے، بحث ومباحثے کا دروازہ کھولیں اور ان اختلافات کو اس حد تک پہنچادیں جیسے کوئی کفر وایمان کا اختلاف ہو؟

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے اسی حالت زار پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

> ''میرے نزدیک اس جنگ وجدل کا ایک بہت بڑا سبب فروعی اور اجتہادی مسائل میں تحزب وتعصب اور اپنی اختیار کردہ راہ عمل کے خلاف کو عملاً باطل اور گناہ قرار دینا اور اس پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ایسا معاملہ کرنا ہے جو اہل باطل اور گمراہوں کے ساتھ کرنا چاہئے۔ اس پر تمام امت کا اتفاق بھی ہے اور عقلاً اس کے سوا کوئی صورت بھی دین پر عمل کرنے کی نہیں ہے کہ جو لوگ خود درجہ اجتہاد کا نہیں رکھتے وہ اجتہادی مسائل میں کسی امام مجتہد کا اتباع کریں اور جن لوگوں نے اپنے نفس کو آزادی و ہوا پرستی سے روکنے کے لیے دینی مصلحت سمجھ کر ایک امام مجتہد کا اتباع اختیار کرلیا ہے وہ قدرتی طور پر

ایک جماعت بن جاتی ہے، اسی طرح دوسرے امام مجتہد کا اتباع کرنے والے ایک دوسری جماعت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں، اگر جماعت بندی مثبت انداز میں صرف اجتہادی مسائل کی حد تک اپنی تعلیمی وعملی آسانیوں کے لیے ہو تو نہ اس میں کوئی مضائقہ ہے نہ کوئی تفرقہ، نہ ملت کے لیے اس میں کوئی مضرت۔ مضرت رساں اور تباہ کن ایک تو اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اپنی رائے اور اختیار سے اختلاف رکھنے والوں کے ساتھ جنگ و جدل اور دوسرے ان فروعی مسائل کی بحثوں میں غلو کہ سارا علم و تحقیق کا زور اور بحث و تمحیص کی طاقت اور عمر کے اوقات عزیز انہی بحثوں کی نذر ہو جائیں ...... آگے چل کر فرماتے ہیں کہ...... اسی کے ساتھ دوسری بھاری غلطی ان اجتہادی مسائل میں اختلاف کے حدود کو توڑ کر تفرق وتشتت اور جنگ و جدل اور ایک دوسرے کے ساتھ استہزا و تمسخر تک پہنچ جانا ہے، جو کسی شریعت وملت میں روا نہیں، افسوس کہ یہ سب کچھ خدمت علم دین کے نام پر کیا جاتا ہے اور جب یہ معاملہ ان علما کے متبعین عوام تک پہنچتا ہے تو وہ اس لڑائی کو جہاد قرار دے کر لڑتے ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ جس قوم کا جہاد خود اپنے ہی دست و بازو سے ہونے لگے اس کو کسی غنیم کی مدافعت اور کفر و الحاد کے ساتھ جنگ کی فرصت کہاں؟''(۱)

الحاصل اختلاف کی وہ قسم جس میں صرف فروعی و اجتہادی مسائل میں آراء مختلف ہوتی ہیں، اس میں نہ تشدد جائز ہے، نہ ایک دوسرے کو غلط قرار دینے کی کوشش

(۱) وحدت امت: ۱۷-۲۱

کوئی محمود کام ہے، بلکہ اس میں ہمیشہ سے امت کا یہی طرز عمل رہا اور ہونا چاہئے کہ ایک دوسرے کا احترام وادب، ان کی خدمات وکوششوں کا اعتراف، ان کی خدمات وکارناموں سے استفادہ جاری رہے، ورنہ یہ وہ غلو پسندی ہے جس کا وبال آج امت اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہی ہے۔

محض طریق کار کا اختلاف کوئی اختلاف نہیں

یہاں بطور تتمیم فائدہ ایک بات مزید عرض کر دینا مناسب ہے، وہ یہ کہ ایک اختلاف وہ ہوتا ہے جو محض کسی کام کے طریق کار کے لحاظ سے پیدا ہوتا ہے، کہ ایک شخص یا ایک جماعت یا ایک انجمن ایک دینی کام کے لیے اپنی سوچ وفکر سے کسی اپنی سہولت یا مصلحت یا ضرورت کے تقاضے سے ایک طریق کار منتخب کر لیتی ہے اور دوسرے لوگ یا دوسری جماعت اسی کام کے لیے ایک دوسرا طریق کار تجویز کر لیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس اختلافِ طریقِ کار کو حقیقت میں اختلاف ہی نہیں کہہ سکتے، یہ ظاہراً وصورۃً اختلاف ہے، حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں؛ اس لیے اس کو اختلاف نہیں؛ بل کہ تعدد سے تعبیر کرنا مناسب ہے، جیسے تعلیم کے لیے یا اصلاح وتربیت کے لیے یا دعوت وتبلیغ کے لیے مختلف صورتوں وشکلوں سے کام کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا ہے؛ مگر یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ یہ اختلاف مذاق در حقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے؛ لہٰذا ایسے اختلاف کو اختلاف قرار دے کر اپنے طریق کار سے الگ دوسرا طریق کار رکھنے والوں کو برا بھلا کہنا یا مطعون سمجھنا یا کرنا یا ان سے نفرت وکدورت ظاہر کرنا یہ سب غلو وتجاوز کی ناپاک شکلیں ہے، جس سے نہایت درجہ پرہیز کرنا چاہئے؛ مگر عجیب بات ہے کہ آج امت میں اس سلسلہ میں بے حد غلو وتجاوز کیا جا رہا

ہے، حتی کہ بعض لوگ محض اس طریق کار کے اختلاف وتعدد کو یہاں تک پہنچا دیتے ہیں کہ سلام و کلام تک ایک دوسرے سے بند ہو جاتا ہے اور دوسرے طریق پر کام کرنے والوں کے ساتھ وہ رویہ اپنایا جاتا ہے جو کسی ناجائز وحرام کام کے مرتکب لوگوں کے ساتھ ہوا کرتا ہے۔ اس قسم کی ذہنیت رکھنے والوں کو اولاً یہ سوچنا چاہیے کہ اگر دوسرا فریق بھی ان کے بارے میں یہی رویہ اختیار کرے تو کیا وہ اس کو گوارا کرتے ہیں؟ اور کیا دوسرے فریق کا یہ الزام کوئی حیثیت ان کے پاس رکھتا ہے کہ وہ ہمارے طریقہ پر کام نہیں کرتے؟ نہیں اور ہرگز نہیں، تو پھر ان حضرات کو اس کا جواز کہاں سے مل گیا کہ اپنے نظام عمل وطریق کار پر دوسروں کو اصرار کریں اور اس کے خلاف کسی اور طریق کار کو قبول و برداشت نہ کریں؟ کیا اسی کا نام غلو فی الدین نہیں؟ غور کیا جائے۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مفتی اعظم حضرت اقدس مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی ایک نہایت اہم تحریر جو اسی سلسلے میں ہے، اس کو اپنی اس کتاب کا جزو بنادوں اور اپنی تحریر کو اس سے زینت و رونق دوں؛ لہٰذا اس کو آپ کے رسالے ''وحدت امت'' سے نقل کرتا ہوں: و ھو ھذا:

> ''ہماری دینی جماعتیں جو تعلیمِ دین یا ارشادِ تلقین یا دعوت وتبلیغ اور اصلاحِ معاشرہ کے لیے قائم ہیں اور اپنی اپنی جگہ مفید خدمات بھی انجام دے رہی ہیں ان میں بہت سے علما وصلحا اور مخلصین کام کر رہے ہیں اگر یہی متحد ہو کر تقسیم کار کے ذریعہ دین میں پیدا ہونے والے تمام رخنوں کے انسداد کی فکر اور امکانی حد تک باہم تعاون کرنے لگیں اور اقامتِ دین کے مشترک مقصد کی خاطر ہر جماعت دوسری کو اپنا دست و بازو

سمجھے اور دسروں کے کام کی ایسی ہی قدر کریں جیسی اپنے کام کی کرتے ہیں تو یہ مختلف جماعتیں اپنے اپنے نظام میں الگ رہتے ہوئے بھی اسلام کی ایک عظیم الشان طاقت بن سکتی ہیں اور تقسیم عمل کے ذریعہ اکثر دینی ضرورتوں کو پورا کرسکتی ہیں۔''

مگر عموماً یہ ہو رہا ہے کہ ہر جماعت نے جو اپنے سعی وعمل کا ایک دائرہ اور نظامِ عمل بنایا ہے عملی طور پر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خدمتِ دین کو اسی میں منحصر سمجھ رہے ہیں، گو زبان سے نہ کہیں، دوسری جماعتوں سے اگر جنگ وجدل بھی نہیں تو بے قدری ضرور دیکھی جاتی ہے اس کے نتیجہ میں ان جماعتوں میں بھی ایک قسم کا تشتت پایا جاتا ہے، غور کرنے سے اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مقصد سب کا اگر چہ دین کی اشاعت، حفاظت اور مسلمان کی علمی، عملی، اخلاقی اصلاح ہی ہے؛ لیکن اس مقصد کے حاصل کرنے کے لیے کسی نے ایک دارالعلوم قائم کرکے تعلیمِ دین کی اہم خدمت انجام دی، کسی نے ایک تبلیغی جماعت بنا کر رشد وہدایت کا فرض ادا کیا، کسی نے کوئی انجمن بنا کر احکام دین کی نشر واشاعت کا تحریری انتظام کیا، کسی نے فتویٰ کے ذریعہ خلق خدا کو ضروری احکام بتانے کے لئے دارالافتاء قائم کیا، کسی نے اسلام کے خلاف ملحدانہ تلبیسات کے جواب کے لئے تصنیفات کا یا ہفتہ واری، ماہواری رسالہ واخبار کا سلسلہ جاری کیا، یہ سب کام اگر چہ صورت میں مختلف ہیں، مگر درحقیقت ایک مقصد کے اجزاء ہیں، ان مختلف محاذوں پر جو مختلف جماعتیں کام کریں گی یہ ضرور ہے کہ ہر ایک کا نظامِ عمل مختلف ہوگا اس لئے ہر جماعت نے بجا طور پر سہولت کے لئے اپنے اپنے مذاق اور ماحول کے مطابق ایک نظام عمل اور اس کے اصول وقواعد بنا رکھے ہیں اور ہر جماعت ان کی پابند ہے، یہ ظاہر ہے کہ اصل مقصد تو منصوص اور قطعی اور قرآن وسنت

سے ثابت ہے اس سے انحراف کرنا قرآن وسنت کے حدود سے نکلنا ہے؛ لیکن یہ اپنا بنایا ہوا نظامِ عمل اور اس کے تنظیمی اصول وقواعد نہ منصوص ہیں، نہ ان کا اتباع از روئے شرع ہر ایک کے لیے ضروری ہے؛ بل کہ جماعت کے ذمہ داروں نے سہولت عمل کے لئے ان کو اختیار کرلیا ہے ان میں حسبِ ضرورت تبدیلیاں وہ خود بھی کرتے رہتے ہیں اور حالات اور ماحول بدلنے پر اس کو چھوڑ کر کوئی دوسرا نظام عمل بنا لینا بھی کسی کے نزدیک ناجائز یا مکروہ نہیں ہوتا۔ مگر اس میں عملی غلو تقریباً ہر جماعت میں یہ پایا جاتا ہے کہ اپنے مجوزہ نظام عمل کو مقصد ومنصوص کا درجہ دیدیا گیا، جو شخص اس نظام عمل میں شریک نہیں اگرچہ مقصد کا کتنا ہی عظیم کام کررہا ہو اس کو اپنا بھائی، اپنا شریک کار نہیں سمجھا جاتا، اور اگر کوئی شخص اس نظام عمل میں شریک تھا، پھر کسی وجہ سے اس میں شریک نہ رہا تو عملاً اسے اصل مقصد اور دین سے منحرف سمجھ لیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ وہی معاملہ کیا جاتا ہے جو دین سے انحراف کرنے والوں کے ساتھ ہونا چاہئے، اگرچہ وہ اصل مقصد یعنی اقامت دین کی خدمت پہلے سے بھی زیادہ کرنے لگے، اس غلو کے نتیجہ میں وہی تحزب وتعصب اور گروہ بندی کی آفتیں اچھے خاصے دیندار لوگوں میں پیدا ہوجاتی ہیں، جو جاہلی عصبیتوں میں مبتلا لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ (۱)

اصولی اختلاف مذموم وممنوع ہے

اب دیکھئے اصولی اختلاف کا شرعی حکم کیا ہے؟ جس طرح فروعی اختلاف کو بعض لوگ اصولی اختلاف کے درجے میں رکھ کر اس کو حرام و ناجائز کہتے، اور ان آیات واحادیث سے استدلال کرتے ہیں جن میں اختلاف کی مذمت آئی ہے، اسی طرح بعض لوگ اصولی اختلاف کو فروعی اختلاف کا درجہ دیکر عجیب منطق سے کام

(۱) وحدت امت: ۲۲-۲۴

لیتے اور اس اختلاف کو بھی جائز و روا رکھتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ جس طرح فروعی اختلاف کو اصولی اختلاف کا درجہ دینا غلط و بے اعتدالی کی بات ہے اسی طرح اصولی اختلاف کو جزئی وفروعی اختلاف کا درجہ دیکر اس کو روا رکھنا بھی صحیح نہیں ؛ بل کہ ایک بنیادی غلطی ہے۔

کیوں کہ نصوص شرعیہ میں اصولی اختلاف کی دونوں قسموں کو مذموم وحرام قرار دیا گیا ہے اور اس قسم کے اختلاف پر قرآن و حدیث میں سخت وعید بھی آئی ہے۔ یہاں محض نمونے کے طور پر چند دلائل کی جانب اشارہ کرتا ہوں۔

پہلی قسم کے اختلاف کے بارے میں یہ آیت وارد ہوئی ہے:

﴿وَاِنَّ الَّذِیۡنَ اخۡتَلَفُوۡا فِی الۡکِتٰبِ لَفِیۡ شِقَاقٍ بَعِیۡدٍ﴾

(البقرۃ : ۱۷۶)

(اور بلا شبہ وہ لوگ جنھوں نے کتاب اللہ میں اختلاف کیا وہ بڑے دور کے جھگڑے میں پڑے ہوئے ہیں۔)

اسی طرح یہ آیت بھی اصولی اختلاف کے متعلق ہے:

﴿کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَ مُنۡذِرِیۡنَ وَ اَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ وَمَا اخۡتَلَفَ فِیۡہِ اِلَّا الَّذِیۡنَ اُوۡتُوۡہُ مِنۡۢ بَعۡدِ مَاجَآءَتۡہُمُ الۡبَیِّنٰتُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ فَہَدَی اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِہٖ وَاللّٰہُ یَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ﴾ (البقرۃ : ۲۱۳)

(لوگ ایک ہی امت تھے پھر اللہ نے حضرات انبیا خوش خبری دینے

وڈرانے والے ان کے پاس بھیجے اور ان کے ساتھ حق والی کتابیں نازل کی، تاکہ وہ لوگوں کے درمیان ان باتوں کا فیصلہ کریں جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں اور اس میں اختلاف نہیں کیا؛ مگر انہی لوگوں نے جن کو وہ کتاب دی گئی تھی، محض آپسی ضد کی وجہ سے جب کہ ان کے پاس واضح نشانیاں آچکی تھیں، پس اللہ نے وہ امر حق جس میں وہ اختلاف کرتے تھے ان لوگوں کو بتادیا جو ایمان والے تھے، اللہ جس کو چاہتا ہے اسے راہ راست کی ہدایت دیدیتا ہے۔)

نیز یہ آیت کریمہ بھی اسی اصولی اختلاف کی مذمت بیان کررہی ہے:

﴿وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ﴾ (البقرۃ: ۲۵۳)

(اور لیکن ان لوگوں نے اختلاف کیا، پس ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ لوگوں نے کفر کیا۔)

ان آیات میں ظاہر ہے کہ وہ اختلاف مراد ہے جس سے اسلام وکفر کا اختلاف پیدا ہوتا ہے، اللہ سے منع کیا گیا، اس پر وعید سنائی گئی، اس کا رد کیا گیا ہے۔

اور اصولی اختلاف میں سے دوسری قسم جس سے سنت و بدعت کا اختلاف پیدا ہوتا ہے وہ بھی مذموم ہے؛ اس سلسلے میں احادیث وارد ہیں اور وہ مشہور حدیث جو افتراق امت کے بارے میں آئی وہ سب کے سامنے ہے۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« افترقت اليهود على إحدى أو ثنتين وسبعين فرقةً وتفرقت النصارى على إحدى أو ثنتين وسبعين فرقةً

وتفترق أمتي على ثلاث و سبعين فرقةً.»

(یہود اکہتر یا بہتّر فرقوں میں بٹ گئے اور نصاریٰ بھی اکہتر یا بہتر فرقوں میں بٹ گئے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔)(۱)

(۲) حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« ليأتين على أمتي ما أتى على بني اسرائيل حذو النعل بالنعل حتى إن كان فيهم من أتى أمه علانية لكان في أمتي من يصنع ذلک، وإن بني اسرائيل تفرقت على ثنتين وسبعين ملة و تفترق أمتي على ثلاث و سبعين ملة ، كلهم في النار إلا ملة واحدة، قالوا: و من هي يا رسول اللّٰه! قال: ما أنا عليه و أصحابي.»

(ضرور بالضرور میری امت پر وہ زمانہ آئے گا جو بنی اسرائیل پر آیا تھا جس طرح جوتا جوتے کے برابر ہوتا ہے، یہاں تک کہ اگر ان لوگوں میں کوئی ایسا تھا جس نے اپنی ماں سے علانیہ منہ کالا کیا تھا تو میری امت میں بھی ایسا کرنے والا ہوگا، اور بلاشبہ بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، جن میں سے ایک کے سوا سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کونسا فرقہ ہے؟ فرمایا کہ وہ فرقہ جو میرے اور صحابہ کے

---

(۱) ابو داود: ۴۵۹۶، السنن الکبری بیھقی: ۱۰/ ۲۰۸، مستدرک: ۱/ ۲۱۷، السنة لابن ابی عاصم: ٦٦

طریقہ پر ہے۔)(۱)

(۳) حضرت انس ﷺ بن مالک سے روایت کیا گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« تفترق هذه الأمة على ثلاث و سبعين فرقة، كلهم في النار إلا واحدة، قالوا: وما هي تلك الفرقة؟ قال: ما أنا عليه و أصحابي. »

(یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی، سوائے ایک کے وہ سب کے سب جہنم میں جائیں گے۔ صحابہ نے معلوم کیا کہ وہ کونسا فرقہ ہے؟ تو فرمایا کہ جو میرے اور میرے صحابہ کے طریقہ پر قائم ہے۔)(۲)

(۴) حضرت امیر معاویۃ ﷺ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« ألا إن من كان قبلكم من أهل الكتاب افترقوا على ثنتين و سبعين ملة و إن هذه الأمة ستفترق على ثلاث و سبعين ملة، ثنتان و سبعون في النار و واحدة في الجنة وهي الجماعة. وفي رواية زيادة: و إنه سيخرج من أمتي أقوام تجارى بهم تلك الأهواء كما يتجارى الكلب لصاحبه، لا يبقى منه عرق، ولا مفصل إلا دخله. »

(خبردار رہو کہ تم سے پہلے جو اہل کتاب گزرے ہیں وہ بہتر فرقوں

---

(۱) ترمذی: ۲۶۴۱، مستدرک حاکم: ۱/۲۱۸

(۲) معجم اوسط طبرانی: ۵/۱۳۷، معجم صغیر طبرانی: ۲/۳۰

میں بٹ گئے تھے اور یہ امت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی بہتر جہنم میں جائیں گے اور ایک جنت میں اور وہ جماعت ہے......ایک روایت میں یہ اضافہ ہے......اور میری امت میں ایسے لوگ ظاہر ہوں گے جن میں یہ خواہشات اس طرح رچی وبسی ہوئی ہوں گی جیسے کہ کتے کاٹے کا زہر کہ کوئی رگ اور کوئی جوڑ ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری نہ گھس جائے۔)(۱)

نیز ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« اوصیکم بتقوی اللّٰہ، والسمع والطاعة، وان کان عبدا حبشیا ، فإنه من یعش منکم بعدی ، فسیری اختلافا کبیرا، فعلیکم بسنتي و سنة الخلفاء الراشدین المهدیین، تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجذ ، وإیاکم و محدثات الامور ، فإن کل محدثة بدعة ، و کل بدعة ضلالة. »

(میں تمہیں اللہ سے ڈرنے اور امیر کی سمع و طاعت کی وصیت کرتا ہوں، اگر چہ کہ وہ حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو، کیوں کہ میرے بعد تم میں سے جو رہے گا وہ بڑا اختلاف دیکھے گا، پس تم پر میری اور میرے ہدایت یافتہ خلفاء راشدین کا طریقہ لازم ہے، اس کو مضبوط تھام لو اور اپنے دانتوں سے کسکے پکڑ لو اور نئی نئی باتوں سے بچو، کیوں کہ (دین میں) ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔)(۲)

---

(۱) ابو داود: ۴۵۹۷، السنة لابن ابی عاصم: ۲، مسند الشامیین: ۲/ ۱۰۸، مسند احمد: ۱۶۹۷۹، مستدرک: ۱/ ۲۱۸، معجم کبیر طبرانی: ۱۴/ ۳۰۱

(۲) ابن ماجه: ۴۲، مسند بزار: ۴۲۰۱، مستدرک: ۳۲۹، مسند احمد: ۱۷۱۸۴، السنة للمروزی: ۶۹، معجم کبیر: ۱۵۰۲۱، السنة لابن ابی عاصم: ۵۴، شعب الایمان: ۱۱۰۷

اور امام احمد رحمہ اللہ وغیرہ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے اور امام ترمذی وامام بزار وامام ابویعلی رحمہم اللہ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے اور امام ابو یعلی رحمہ اللہ نے حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے اور ہم لوگ تقدیر کے بارے میں بحث کررہے تھے، پس آپ غصہ ہوگئے یہاں تک کہ آپ کا چہرہ ایسا سرخ ہوگیا گویا کہ آپ کے گالوں میں انار کے دانوں کا رس نچوڑ دیا گیا ہے۔ پس آپ نے فرمایا:

« أبهذا أمرتم، أم بهذا أرسلت إليكم؟ إنما هلك من كان قبلكم حين تنازعوا في هذا الأمر، عزمت عليكم، عزمت عليكم ألا تنازعوا فيه. »

(کیا اسی کا تمھیں حکم دیا گیا یا میں اسی کو دیکر تمہارے پاس بھیجا گیا ہوں؟ تم سے پہلے لوگ اسی وقت ہلاک ہوئے جب انھوں نے اس معاملے میں جھگڑا کیا، میں تم کو قسم دیتا ہوں، میں تم کو قسم دیتا ہوں کہ اس میں جھگڑا نہ کرو۔)(۱)

اور حضرت ابوسعید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ اللہ کے رسول کے دروازے کے پاس قرآن میں بحث کررہے، ایک ایک شخص ایک آیت نکال رہا تھا اور دوسرا دوسری آیت، پس آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر نکلے، (اور غصہ کی وجہ سے ایسے سرخ ہورہے تھے) گویا آپ کے گالوں میں انار کے دانے کا رس گھول دیا گیا ہو، پھر فرمایا کہ: کیا اے لوگو! کیا اسی لیے تم پیدا کیے گئے ہو یا اسی کا تم کو حکم دیا گیا ہے؟ میرے بعد کافر بن کر ایک دوسرے کی گردن نہ مارو۔(۲)

---

(۱) مسند احمد: ۶۸۴۵، ترمذی: ۲۱۳۳، مسند بزار: ۱۰۰۶۳، مسند ابو یعلی: ۳۱۲۱
(۲) معجم اوسط طبرانی: ۸/۲۲۵

ان احادیث میں جس اختلاف و افتراق کا ذکر ہے اس سے مراد وہ اختلاف ہے جس سے انسان سنت رسول وطریق اصحاب رسول کی شاہراہ سے کٹ جاتا اور خواہشات وبدعات کی دلدل میں گر جاتا ہے۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ اس قسم کے اختلاف کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ؛ بل کہ یہ ممنوع و مذموم ہے، جس سے بچنا واجب و لازم ہے ۔مگر یہاں بھی بعض لوگوں کا رو یہ انتہائی حیرت ناک یہ ہے کہ وہ اس قسم کے اختلاف کو ہلکا وخفیف ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں اوراس کوفروعی اختلاف کے درجے میں رکھتے ہیں۔

دعوت اتحاد سے وحدت ادیان تک

اس قسم کی ذہنیت ہمارے جدید تعلیم یافتہ طبقے میں یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ ایک مرتبہ بنگلور کی ایک مسلم کالج میں کسی تقریب کے موقعہ سے ایک مشہور ومعروف ہندو سادھو کو مدعو کیا گیا اور کالج کے طلبہ کے سامنے ان کی تقریر کرائی گئی، پھر کالج کے ایک ذمہ دار نے اپنے خطاب میں ان سے کہا کہ ''ہمارے مذہب اور آپ کے مذہب کے درمیان کوئی بنیادی فرق نہیں ہے،صرف عبادت کے طریقے کا فرق ہے''۔جب اس جلسے کی رپورٹ اخبارات میں شائع ہوئی تو احقر نے اسی وقت اس کا نوٹس لیا اور اس کا جواب لکھ کر اخبارات کو بھیجا،بعض اخبارات نے شائع کیا اور بعض جو اس قسم کی ذہنیت کے مؤید ہیں انھوں نے شائع نہیں کیا۔اس واقعہ سے اندازہ کیجیے کہ اس قسم کی ذہنیت اسلام وکفر کے مابین بھی اتحاد واتفاق کی قائل ہوگئی، کیا کوئی معمولی سے معمولی مسلمان سے بھی یہ بات پوشیدہ ہے کہ اسلام اور بتوں کی پرستش کا کوئی جوڑ واتحاد ممکن نہیں اور یہ کہ توحید ورسالت وآخرت اسلام کے وہ بنیادی عقائد ہیں جن کو مانے بغیر کوئی نجات کا تصور نہیں کرسکتا اور یہ بھی معلوم ہے کہ ہندو لوگوں میں ان عقائد کا کوئی تصور نہیں تو

پھر دونوں ایک کیسے ہو سکتے ہیں؟ یہ بات تو کوئی بے عقلی کا شکار مریض کہہ سکتا ہے یا کوئی دین اسلام سے یک لخت جہالت کا بیمار۔ بہ ہر حال اس سے اس قسم کے لوگوں کا غلو جو دین میں انتہائی درجہ کا فساد پیدا کرتا ہے، ظاہر ہوتا ہے۔

لہٰذا اس قسم کے اختلاف کو معمولی کہا جا سکتا ہے، نہ قابل قبول ٹھیرایا جا سکتا ہے؛ بل کہ یہ شدید وقبیح اختلاف ہے جس سے اختلاف کرنا واجب ولازم ہے، اسی لیے سلف صالحین نے ہمیشہ سے اس قسم کے اختلاف کا رد کیا، جس کی تفصیل میری کتاب ''امت میں اعتقادی وعملی بگاڑ اور علما کی ذمہ داری'' میں دیکھی جا سکتی ہے۔

کیا صحابہ وسلف صالحین میں اعتقادی اختلاف تھا؟

بعض حضرات کو ایک شدید غلط فہمی ہوئی ہے اور انھوں نے سلف صالحین میں بھی اعتقادی اختلاف ہونے کا دعوے کیا ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ سلف میں جو اختلاف تھا وہ صرف فروعی نہیں؛ بل کہ اصولی واعتقادی بھی تھا؛ لہٰذا یہ کہنا کہ ان میں اصولی اختلاف نہیں تھا اور پھر اصولی اختلاف کو غلط قرار دینا صحیح نہیں۔

ان حضرات نے سلف کے بعض اختلافات کا اس سلسلے میں ذکر کیا ہے، مثلاً یہ کہ صحابہ میں معراج کے بارے میں اختلاف تھا کہ وہ جسمانی تھی یا روحانی ومنامی؟ اسی طرح حضرات صحابہ کرام کا اس میں اختلاف ہوا کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کی رات اللہ کا دیدار کیا یا نہیں؟ اسی طرح سلف میں اس بارے میں اختلاف رہا ہے کہ کفار ومشرکین کی نابالغ اولاد جنت میں جائے گی یا دوزخ میں؟

علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کہتے ہیں:

''فإن أئمة السنة والحديث لم يختلفوا في شيء من

أصول دينهم." (۱)

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے:

"وقد تنازع الصحابة في كثير من مسائل الأحكام وهم سادات المؤمنين وأكمل الأمة إيمانا، ولكن بحمد الله لم يتنازعوا في مسئلة واحدة من مسائل الأسماء والصفات والافعال، بل كلهم على ثبات ما نطق به الكتاب والسنة كلمة واحدة من أولهم إلى آخرهم، الخ". (۲)

اصول میں اختلاف کرنے والوں کے ساتھ کیا رویہ ہو؟

جب یہ بات واضح ہوگئی کہ اصولی اختلاف مذموم ہے تو سوال یہ ہے کہ اصولی اختلاف کرنے والوں کے ساتھ ہمارا کیا سلوک ہونا چاہئے؟ کیا ان سے ہمنوائی کرتے ہوئے ان کے اختلاف کو معمولی قرار دینا چاہیے یا یہ کہ اس اختلاف کا نوٹس لینا چاہیے؟ اور یہ کہ رواداری کے حدود کیا ہیں؟

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک عقیدے و مسلک اہل سنت کا تعلق ہے، اس میں ہمارے اکابر و سلف نے کوئی تساہل و تغافل یا مداہنت کو روا نہیں رکھا، البتہ آپسی معاملات و معاشرت کی حد تک رواداری کو اس شرط کے ساتھ روا رکھا گیا کہ اس سے کوئی دینی نقصان نہ ہو۔ یہاں اجمالاً چند دلائل کی جانب اشارہ کردینا کافی ہوگا۔

اس سلسلے میں قرآن کریم نے ایک جگہ ارشاد فرمایا:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ

---

(۱) درء تعارض العقل والنقل: ۳۶۳/۵

(۲) اعلام الموقعین: ۴۹/۱

مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآئَهُمْ اَوْ اَبْنَآئَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ﴾ (المجادلۃ : ۲۲)

(جو لوگ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں آپ ان کو نہیں پائیں گے کہ وہ ایسوں سے دوستی رکھیں جو اللہ اور اس کے رسول کے مخالف ہیں، اگر چہ کہ وہ ان کے باپ یا بیٹے یا کنبے کے لوگ ہی کیوں نہ ہوں۔)

ایک جگہ فرمایا ہے کہ:

﴿وَلَا تَرْكَنُوْٓا اِلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ﴾ (ھود : ۱۱۳)

(اور مت جھکو ان لوگوں کی جانب جو ظالم ہیں، کہیں تم کو بھی دوزخ کی آگ نہ چھولے۔)

امام قرطبی رحمہ اللہ اس کے تحت لکھتے ہیں:

"والصحیح فی معنی الآیة أنها دالة علی هجران أهل الکفر والمعاصی من أهل البدع وغیرهم فان صحبتهم کفر أو معصیة اذ الصحبة لا تکون إلا عن مودة."

(اس آیت کی تفسیر کے سلسلے میں صحیح قول یہ ہے کہ یہ آیت اہل کفر و اہل معصیت، بدعتی وغیرہ لوگوں سے الگ رہنے پر دلالت کرتی ہے، کیوں کہ ان لوگوں کی صحبت یا تو کفر ہے یا معصیت؛ کیوں کہ کسی کی صحبت اس کی محبت کی وجہ ہی سے ہوتی ہے۔)[1]

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۹/۱۰۸

نیز احادیث میں اس کو ایمان کا کمال قرار دیا گیا ہے کہ محبت وبغض اللہ کے لیے رکھا جائے۔

حضرت ابو امامہ باہلی اور حضرت معاذ بن انس جہنی رضی اللہ عنہما سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« من أعطى لله ومنع لله وأحب لله وأبغض لله فقد استكمل إيمانه. »

(جو اللہ کے لیے دے اور اللہ ہی کے لیے منع کرے اور اللہ ہی کے لیے کسی سے محبت رکھے اور اللہ ہی کے لیے کسی سے بغض رکھے تو اس کا ایمان مکمل ہو گیا۔) (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« من مشى إلى صاحب بدعة ليوقره فقد أعان على هدم الاسلام. »

(جو شخص کسی بدعتی کے پاس اس کی تعظیم کرنے کے لئے جائے تو اس نے اسلام کے منہدم کرنے میں اس کی مدد کی۔) (۲)

ایک حدیث میں ہے کہ:

« لا تجالسوا اهل القدر ولا تفاتحوهم. » (۳)

---

(۱) ترمذی: ۵۲۱، ابو داود: ۴۶۸۱، حاکم: طبرانی معجم کبیر

(۲) مسند شاشی: ۱۳۹۰، معجم کبیر طبرانی: ۱۶۶۱۴، مسند الشامیین: ۴۱۳

(۳) ابو داود: ۴۷۱۲، مسند احمد: ۲۰۶، ابن حبان: ۷۹، ابو یعلی: ۲۴۵، سنن کبری بیهقی: ۲۰۴/۱۰

اسی سے ائمہ وعلما نے یہ اخذ کیا ہے کہ گمراہ و باطل عقائد رکھنے والوں اور بدعات وجاہلانہ امور کو دین قرار دینے والوں سے محبت نہ رکھنا چاہیے؛ بل کہ ایسے لوگوں سے بغض رکھنا چاہیے۔

امام دارالہجرۃ مالک بن انس رحمہ اللہ نے مذکورہ بالا آیت کریمہ سے قدریہ فرقے سے بغض وعداوت رکھنے اور ان سے میل ملاپ نہ رکھنے پر استدلال کیا ہے۔

امام اشہب رحمہ اللہ نے امام مالک رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: قدریہ سے مجالست نہ رکھو کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآئَهُمْ اَوْ اَبْنَآئَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ ﴾ (المجادلۃ : ۲۲)(۱)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ: روئے زمین پر میرے نزدیک قدریہ فرقے سے زیادہ مبغوض کوئی نہیں اور یہ صرف اس لیے کہ وہ اللہ کی قدر نہیں جانتے۔(۲)

یحییٰ بن یعمر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے عرض کیا کہ ایک قوم عراق میں پیدا ہوگئی ہے جو قرآن پڑھتی اور سمجھتی ہے، وہ لوگ کہتے ہیں کہ تقدیر کوئی چیز نہیں، ابن عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

”إذا لقيتموهم فقولوا: إن ابن عمر بَرِئٌ منهم، وأنهم مني برآء.“

---

(۱) تفسیر قرطبی: ۳۰۸/۱۷

(۲) الشريعة للآجری: ۲/۲

(جب ان سے تمہاری ملاقات ہو تو کہہ دینا کہ ابن عمر رضی اللہ عنہ ان سے اور وہ ابن عمر رضی اللہ عنہ سے بری ہیں۔)(۱)

ابوقلابۃ، حسن بصری، شعبی رحمہم اللہ وغیرہ سے مروی ہے:

"لا تجالسوا أصحاب الأهواء ولا تجادلوهم."

(ہوا پرستوں میں اٹھنا بیٹھنا نہ رکھو اور نہ ان سے بحث مباحثہ کرو۔)(۲)

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ: جو کسی بدعتی کی تعظیم کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو موت سے پہلے اندھا بنا دیتے ہیں۔(۳)

امام محی السنۃ بغوی رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

"وَ قَدْ مَضَتِ الصَّحَابَةُ وَالتَّابِعُوْنَ وَ أَتْبَاعُهُمْ وَعُلَمَاءُ السُّنَنِ عَلٰى هٰذَا مُجْمِعِيْنَ مُتَّفِقِيْنَ عَلٰى مُعَادَاةِ أَهْلِ الْبِدَعِ وَمُهَاجَرَتِهِمْ."

(حضرات صحابہ وتابعین وتبع تابعین اور علمائے اہل سنت سب کے سب اہل بدعت سے عداوت و دوری رکھنے پر متفق ومتحد ہیں۔)(۴)

امام شاطبی رحمۃ اللہ کہتے ہیں:

---

(۱) الشریعة للآجری: ۱/۴۸۱، اعتقاد اهل السنة لالکائی: ۴/۵۸۶، الإيمان لابن أبي شيبة: ۱۱۸، الاعتقاد للبیهقی: ۱۳۳

(۲) اصول السنةلابن ابی الزمنین: ۲۹۲، الاعتقاد للبیهقی: ۲۳۸، اعتقاد اهل السنة لالکائی: ۱/۱۳۳، و۴/۶۸۷

(۳) المجالسة: ۱/۴۱۳

(۴) شرح السنة: ۱/۲۲۷

" إنَّ فِرْقَةَ النَّجَاةِ وَ هُمْ أهْلُ السُّنَّةِ مَأمُوْرُوْنَ بِعَدَاوَةِ أهْلِ الْبِدَعِ، وَالتَّشْرِيْدِ بِهِمْ، وَالتَّنْكِيْلِ بِمَنْ انْحَاشَ إلٰى جِهَتِهِمْ، وَنَحْنُ مَأمُوْرُوْنَ بِعَدَاوَتِهِمْ، وَ هُمْ مَأمُوْرُوْنَ بِمُوَالاتِنَا، وَالرُّجُوْعِ إلَى الْجَمَاعَةِ ."

(نجات پانے والا فرقہ وہ اہل سنت ہیں، اہل بدعت سے عداوت رکھنے، ان سے علاحدگی اختیار کرنے اور جو لوگ ان کی جانب مائل ہیں ان کو سزا دینے کے مأمور ہیں اور ہمیں ان سے عداوت رکھنے کا اور ان کو ہم سے دوستی رکھنے اور اہل سنت والجماعت کی جانب رجوع کرنے کا حکم ہے۔)(۱)

امام ابوعثمان اسماعیل الصابونی رحمہ اللہ "عقیدۃ السلف" میں لکھتے ہیں:

"وَ اتَّفَقُوْا مَعَ ذٰلِکَ عَلَى الْقَوْلِ بِقَهْرِ أهْلِ الْبِدَعِ، وَإذْلالِهِمْ ، وَ إخْزَائِهِمْ، وَ إبْعَادِهِمْ، وَ إقْصَائِهِمْ، وَ التَّبَاعُدِ مِنْهُمْ، وَ مِنْ مُصَاحَبَتِهِمْ، وَ مُعَاشَرَتِهِمْ، وَالتَّقَرُّبِ إلَى اللّٰهِ تَعَالٰى بِمُجَانَبَتِهِمْ وَ مُهَاجَرَتِهِمْ. "

(اسی کے ساتھ اہل سنت نے اہل بدعت کے مقہور و ذلیل و رسوا کرنے اور اپنے سے دور کرنے، اور ان کو دور رکھنے، ان کے ساتھ مصاحبت و معاشرت اختیار نہ کرنے اور ان سے علاحدگی کے ذریعہ اللہ کا قرب پانے پر اتفاق کیا ہے۔)(۲)

---

(۱) الاعتصام: ۱/۱۲۰

(۲) عقیدۃ السلف: ۳۹

ابوالجوزاء رحمہ اللہ کہتے ہیں:

" لأن يجاورنى القردة والخنازير في دار أحبُّ إلى من أن يجاورني رجل من أهل الأهواء."

(بندر وخنزیر کسی گھر میں میرے ساتھ رہیں، یہ مجھے اس سے زیادہ پسند ہے کہ میرے ساتھ ہوا پرست بدعتیوں میں سے کوئی آدمی رہے۔)(۱)

یحییٰ بن ابی کثیر رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ:

"إذا لقيت صاحب بدعة فى طريق فخذ فى طريق آخر".

(اگر کسی بدعتی سے راستے میں ملاقات ہوجائے تو تو دوسرا راستہ اختیار کرلینا۔)(۲)

حضرت فضیل رحمہ اللہ نے فرمایا:

"علامة البلاء أن يكون خدن الرجل صاحب بدعة."

(بلاء میں مبتلاء ہونے کی علامت یہ ہے کہ آدمی کے دوست احباب بدعتی ہوں۔)(۳)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے فرمایا:

"جو اختلاف ایسے امر دینی میں ہو جو اصول میں سے ہے اور کفر و

---

(۱) اعتقاد لالکائی: ۱/۱۳۱، الابانة لابن بطة: ۲/۴۶۷

(۲) شعب الایمان بیهقی: ۱۲/۵۷

(۳) شعب الایمان: ۱۲/۶۲

اسلام کے درجہ میں ہے، اس کا حکم ظاہر ہے کہ اہل اسلام کو کفر کے ساتھ اختلاف کرنا اور بلاضرورت شدیدہ یا بلا مصلحت شرعیہ اختلاط و ارتباط کرنا محمود مطلق و واجب ہے......قرآن مجید میں جا بجا اہل حق کو اہل باطل کے ساتھ دینی اختلاف کرنے کا حکم مؤکد وارد ہے۔''

کقوله تعالی: ﴿ولا تتبع اهوائهم عما جاء ک من الحق﴾ و کقوله: ﴿ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار﴾ وغیرهما من الآیات. (۱)

نیز اصولی اختلاف کی دوسری قسم یعنی جس سے سنت و بدعت کا اختلاف پیدا ہوتا ہے، اس کے بارے میں حضرت کہتے ہیں:

''جو اختلاف ایسے امر دینی میں ہو جو اصول میں سے ہے اور سنت و بدعت کے درجہ میں ہے، اس اختلاف کا حکم بھی باستثناء احکام مخصوصہ بالکفار وہی ہے جو اوپر ذکر کیا گیا۔''(۲)

اس کے ساتھ اسلاف سے یہ بھی ملتا ہے کہ بعض فرق باطلہ کے لوگوں سے رواداری معاشرت و اخلاق کی حد تک جائز رکھا، جس کی مثالیں بھی تاریخ نے ضبط کی ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک مسلک کا معاملہ ہے، اس میں اسلاف نے کبھی کوئی مداہنت و رواداری کو قبول نہیں کیا، ہاں جہاں تک معاشرت و اخلاقی تعلقات ہیں، اس حد تک رواداری فرمائی، ایک دوسرا کا لحاظ فرمایا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل کفر و شقاق سے محبت نہیں رکھی جا سکتی؛ بل کہ ان

---

(۱) بوادر النوادر: ۲/۶۷۴

(۲) بوادر النوادر: ۲/۶۷۵

سے بغض رکھنا لازمی ہے۔ زیادہ سے زیادہ ان کے ساتھ معاملات ومعاشرات میں رواداری واخلاق کا برتاؤ رکھا جائے گا۔

اسی لیے علما اہل سنت نے تصریح کی ہے کہ اہل بدعت و گمراہ لوگوں کے ساتھ دوستانہ تعلقات کی گنجائش نہیں۔

ان تمام حوالجات سے مسلک اہل سنت کی یہ وضاحت سامنے آ گئی کہ اصولی اختلاف رکھنے والوں سے اختلاف کیا جائے گا اور اس سے اتفاق کرنا جائز نہیں؛ بلکہ قرآن وحدیث کے خلاف ہے۔

اختلاف تو ہو مگر بطریق احسن

البتہ یہاں ایک اور بات پر توجہ دلانا ضروری سمجھتا ہوں، وہ یہ کہ مختلف فرقوں اور ان کے باطل و غلط نظریات سے اختلاف کرنا اور اس سے اتفاق نہ کرنا تو لازم ہے؛ لیکن اس تردید واختلاف میں وہ صورت اختیار کرنا چاہیے جو قرآن وسنت نے ہمیں تعلیم دی ہے اور اسوۂ نبوی نے فراہم کیا ہے؛ کیوں کہ قرآن کریم نے ہمیں ایسے وقت کے لئے ''وَ جَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ أَحْسَنُ'' کی تعلیم دی ہے کہ اگر بحث ومباحثہ ومناظرہ کی نوبت آ جائے تو اچھے انداز سے مناظرہ ومباحثہ کرو۔ اس آیت کی تفسیر میں علمائے تفسیر نے لکھا ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ مباحثہ نرمی و خیرخواہی اور عمدہ خطاب سے ہونا چاہئے۔

مفسر قرآن علامہ ابوحیان رَحِمَہُ اللہ نے ''البحر المحیط'' میں اس کی تفسیر ان الفاظ سے لکھی ہے:

''وجادلهم بالتي هي أحسن طرق المجادلة من الرفق واللين من غير فظاظة ولا تعنيف.''

(اوران سے مباحثہ کرو اس عمدہ و بہتر طریقہ سے جس میں بغیر سختی و درشتی کے نرمی و ملاطفت ہو۔)(۱)

اور یہی بات علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے بھی مزید وضاحت سے اس کی تفسیر میں بیان کی ہے، وہ لکھتے ہیں:

"بالطريقة التي هي أحسن طرق المجادلة من الرفق واللين وإيثار الوجه الأيسر والمقدمات التي هي أشهر فإن ذلک أنفع في تسكين لهبهم و تبيين شغبهم."

(اوران سے مباحثہ کرو اس عمدہ و بہتر طریقہ سے جس میں نرمی و ملاطفت ہو اور آسان صورت اور مشہور مقدمات اختیار کئے جائیں؛ کیوں کہ یہ ان (مخالف لوگوں) کے بھڑکاؤ کی تسکین اور ان کے ہنگامے کو واضح کرنے میں زیادہ نفع بخش ہے۔)(۲)

الغرض اصولی اختلاف کرنے والوں سے اختلاف تو کیا جانا چاہیے؛ مگر ایسا نہیں کہ ان کو گالی دی جائے یا طعن و تشنیع سے کام لیا جائے یا گری ہوئی زبان استعمال کی جائے؛ بل کہ قرآن اور انبیا کی تعلیم کے مطابق نرمی و سنجیدگی، علمی دلائل و محکم براہین سے کام لیا جائے، ورنہ یہ بھی ایک قسم کا غلو فی الدین ہوگا۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان

---

(۱) البحر المحیط: ۶/۶۱۳

(۲) تفسیر البیضاوی: ۳/۴۲۷

ربیع الاول

کے مروجہ جلوس کا شرعی حکم

بسم اللہ الرحمن الرحیم
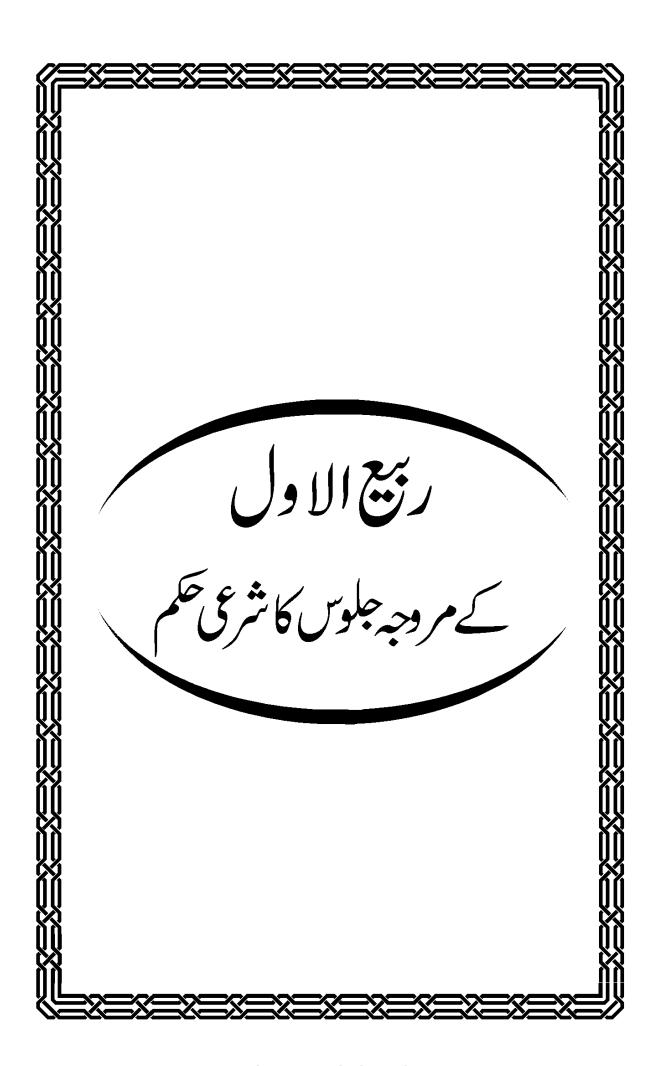
پیش لفظ

زیرِ نظر تحریر دراصل ایک سوال کا جواب ہے، جس کا تعلق ''ربیع الاول'' میں نکلنے والے جلوس سے ہے، جو آج تقریباً ہر بڑے چھوٹے شہر میں اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے نام پر رائج ہے اور اس موقعے پر جلوس کے ساتھ متعدد امور خلافِ شرع انجام دیے جاتے ہیں۔ جیسے: گانا بجانا، تصویر کشی، پٹھاخے چھوڑنا وغیرہ اور ان کو خلافِ شرع سمجھنے کے بہ جائے دین وشریعت کے نام سے ان کی انجام دہی ہوتی ہے؛ لہٰذا اس صورتِ حال کے بارے میں ایک سوال ''الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور'' کے دارالافتا کو موصول ہوا، تو سوال کا جواب یہاں سے کچھ تفصیل وتوضیح کے ساتھ لکھا گیا؛ تا کہ عوام الناس کو واضح طور پر مسئلے کی حقیقت سے واقف کرایا جائے۔

اسی کو اب ضرورت کے پیشِ نظر اور افادۂ عام کے لیے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا جارہا ہے۔

محمد شعیب اللہ خان

(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ربیع الاول کے مروجہ جلوس کا شرعی حکم

بہ خدمت حضرت مفتی صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

سوال:

آج کل بہت سے بڑے شہروں میں ایک رواج یہ چل پڑا ہے، کہ ۱۲/ ربیع الاول کے موقعے پر جلوس نکالا جاتا ہے اور اس کو لوگ ''جلوسِ محمدی'' کے نام سے یاد کرتے ہیں اور لوگوں کو اس میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے اور بڑے اہتمام سے اس کو نکالا جاتا ہے اور یہ جلوس شہر کے مختلف علاقوں سے گزارا جاتا ہے اور اس کو حضرت رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق و محبت کی علامت سمجھا جاتا ہے، اس جلوس کا شرعی حکم کیا ہے؟ کیا یہ جلوس کا طریقہ قرآن و حدیث سے یا سیرتِ رسول یا اسوۂ صحابہ سے ثابت ہوتا ہے؟ یاد رہے کہ اس جلوس میں مندرجہ ذیل کام شامل ہوتے ہیں:

- قوالی اور گانا بجانا ہوتا ہے۔
- بعض لوگ ناچتے وتھرکتے بھی نظر آتے ہیں۔
- پٹھاخے چھوڑے جاتے ہیں۔
- بعض لوگ حضرت ٹیپو سلطان یا کسی اور کا کردار ادا کرتے ہیں اور

حضرت ٹیپو رحمہ اللہ وغیرہ کی بڑی بڑی تصاویر بنا کر ان تصاویر سے خود کو ان کا روپ دینے کی کوشش کرتے ہیں اوران کی نقل اتارتے ہیں۔

❁ بعض لوگ اپنے منہ سے آگ کا شعلہ نکالتے یا اور کوئی کرتب وتماشا دکھاتے ہیں۔

❁ نیز اس جلوس کے موقعے پر یہ سارے لوگ درمیان میں آنے والی نماز کا کوئی اہتمام نہیں کرتے؛ بل کہ نمازوں کو ترک کرتے ہیں۔

سوال یہ ہے، کہ اس قسم کے جلوس کا شرعی حکم کیا ہے، قرآن وحدیث اور فقہاء کرام کے اقوال کی روشنی میں اس کا جواب دیکر ممنون ومشکور فرمائیں۔

فقط

بدیع الزماں

9036943480

الجواب ومنہ الصواب:

الحمد لولیه والصلاة والسلام علی نبیه : أما بعد

موجودہ دور میں امتِ مسلمہ میں جو کمزوریاں دین وایمان کے لحاظ سے رونما ہوچکی ہیں، ان کے پیشِ نظر آپ کا یہ سوال ایک ضرورت کا سوال ہے؛ لہٰذا ہم کسی قدر تفصیل سے اس کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں؛ تاکہ امت کے سامنے واضح طور پراور مدلل طریقے سے بات آجائے۔

ایمان کا تقاضا-محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم

اس بات میں کوئی شک نہیں، کہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت ومحبت ہر مسلمان کی جان وایمان ہے اور دنیوی واخروی سعادتوں کا سب

سے بڑا اور اولین زینہ ہے اور اسی لیے ان پر یہ فرض بھی ہے، اس کے بغیر ایمان کا کوئی تصور نہیں ہوسکتا۔

مگر اسی کے ساتھ یہ بھی جان لینا چاہیے کہ مسلمانوں کے لیے ہر معاملے میں راہِ عمل وہی ہے، جو اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن و حدیث میں متعین فرما دیا ہے اور پھر اس کی روشنی میں حضراتِ علما و ائمہ دین نے واضح کیا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی اور راہ صلاح و فلاح کی ہے، نہ ہوسکتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کے سلسلے میں بھی ہمیں وہی راہ اختیار کرنا چاہیے، جو اللہ تعالیٰ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے متعین فرمائی ہے۔ اس بارے میں بھی کوئی من گھڑت طریقہ یا کسی اور قوم کا طریقہ اختیار کرنا روا نہیں ہوسکتا۔

محبتِ رسول کا تقاضا - اطاعتِ رسول

اور یہ بات قرآن و حدیث سے واضح ہے کہ ایک مسلمان کے لیے اللہ و رسول سے محبت کا طریقہ یہی ہے کہ دین و شریعت کی تعلیمات کو دل و جان سے قبول کیا جائے اور ان پر عمل کیا جائے، پھر ان کو دنیا میں عام و رائج کرنے کے لیے محنت و مجاہدہ کیا جائے، ان کی دعوت و تبلیغ کی جائے اور لوگوں کو اس کی ترغیب دی جائے۔

کتبِ احادیث میں یہ روایت آئی ہے کہ ایک صحابی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! آپ میرے نزدیک میری ذات سے زیادہ محبوب ہیں اور میری اولاد سے بھی زیادہ محبوب ہیں اور میں جب گھر میں ہوتا ہوں اور آپ کی یاد آجاتی ہے، تو میں اس وقت تک صبر نہیں کرسکتا، جب تک کہ آپ کی خدمت میں آکر آپ کو دیکھ نہ لوں اور میں جب آپ کی وفات اور میرے

مرنے کا تصور کرتا ہوں، تو میں سمجھتا ہوں کہ آپ جنت میں نبیوں کے ساتھ بلند مقامات پر پہنچا دیے جائیں گے اور میں جنت میں جا کر بھی اندیشہ کرتا ہوں کہ آپ کی زیارت نہ کر پاؤں گا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا؛ یہاں تک کہ حضرت جبریل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَ الصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَ الصّٰلِحِيْنَ وَ حَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ (۱)

(اور جو اللہ و رسول کی اطاعت کرتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ رہیں گے، جن پر اللہ نے انعام کیا ہے یعنی انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ رہیں گے اور یہ لوگ بڑے اچھے رفیق ہیں۔) (۲)

بعض روایات میں ہے کہ حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے، وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انتہائی محبت رکھتے تھے اور آپ کو دیکھے بغیر ان کو صبر نہیں آتا تھا، یہاں تک کہ اپنی موت کے بعد اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہ ہونے کے اندیشے سے ان کا جسم نحیف اور رنگ متغیر ہو گیا تھا، انھوں نے اس اندیشے کا ذکر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کیا، تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۳)

ایک حدیث میں ہے کہ ایک انصاری صحابی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

---

(۱) النساء: ۶۹

(۲) الدر المنثور: ۴/ ۵۲۸، روح المعاني: ۵/ ۷۵

(۳) روح المعاني: ۵/ ۷۵

میں آئے اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! مجھے آپ کی ذات خود مجھ سے میری اولاد سے، میرے گھر والوں اور میرے مال و دولت سے زیادہ محبوب ہے، اگر میں آپ کے پاس آکر آپ کی زیارت نہ کرلوں؛ تو مجھے گمان ہوتا ہے کہ میں مرجاؤں گا۔

یہ عرض کرکے وہ صحابی رونے لگے۔ آپ نے فرمایا کہ کیوں روتے ہو؟

انھوں نے عرض کیا کہ میں نے آپ کی وفات اور میرے مرنے کا خیال کیا، پھر آپ کے جنت میں انبیا کے ساتھ بلند مقامات پر جانے کا تصور کیا، تو رونا آگیا۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا کہ یہ آیت نازل ہوئی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان صحابی سے فرمایا کہ لو خوش خبری سن لو۔ (۱)

ایک حدیث میں ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپس میں کہا کہ حضرت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں ہم دیکھتے ہیں؛ لیکن آخرت میں آپ کے درجات بلند ہوں گے؛ تو ہم آپ کو نہ دیکھ سکیں گے، اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (۲)

اسی طرح اور بھی متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے اسی قسم کی بات مروی ہے اور ان روایات کو علمائے تفسیر نے اپنی تفاسیر میں درج کیا ہے۔

ان روایات میں غور کیجیے، تو ایک بات یہ سمجھ میں آتی ہے کہ حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کس قدر انتہا درجے کی محبت رکھتے تھے؛ حتی کہ ان کو یہ اندیشہ تھا کہ جنت میں آپ کے بلند ترین درجات کی وجہ سے شاید ہم آپ کی زیارت سے محروم رہ جائیں گے، اس اندیشے کی وجہ سے وہ بے قرار و بے چین ہو جاتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ ان حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم نے جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی

---

(۱) الدر المنثور: ۴/۵۲۹

(۲) تفسیر الطبري: ۸/۵۳۴

محبت کا اظہار کیا اور اس سلسلے میں اپنی بے تابی و بے قراری کا تذکرہ کیا، تو ان کو جو جواب عطا ہوا اس میں یہ بتایا گیا کہ جو اللہ و رسول کی اطاعت کرتا ہے؛ اس کو آپ کی صحبت و معیت جنت میں بھی عطا ہوگی۔ اس سے اس قدر بات واضح ہوگئی کہ محبت کے اظہار کا اصل راستہ و طریقہ یہ ہے کہ اللہ و رسول کی اطاعت کی جائے۔ اور تیسری بات یہ معلوم ہوئی کہ جو اطاعت کا راستہ اختیار کرتا ہے؛ اس کو آخرت میں انبیا و اولیاء اللہ کی صحبت و معیت و زیارت کا شرف حاصل ہوتا رہے گا۔

لہٰذا ہمیں بھی محبتِ الٰہی و عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے سلسلے میں یہی کام کرنا چاہیے کہ تمام امور میں اللہ و رسول کی اطاعت و فرماں برداری کریں اور اس کے علاوہ کسی اور چیز سے محبت کا اظہار اسلامی طریقہ نہیں ہے۔

اس مختصر تمہید کے بعد سوالِ مذکور کے جواب کی طرف توجہ کیجیے کہ اس جلوس میں متعدد امور وہ ہیں، جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت میں حرام و ناجائز ہیں، ان کا ارتکاب کسی بھی موقعے پر جائز نہیں، چہ جائے کہ خود اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و میلاد کے نام پر ان کا ارتکاب کیا جائے؟ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، ایک مسلمان کے لیے عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے اظہار کا طریقہ صرف وہی ہے، جو خود اللہ و رسول نے بتا دیا ہے۔ اور وہ ہے اللہ و رسول کی اطاعت و فرماں برداری۔

ہائے افسوس! کہ آپ کی اطاعت و فرماں برداری کے بہ جائے خود آپ کی شریعت کے خلاف کام کر کے لوگ محبت کو ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے؟

غور کیجیے کہ جب اس میں بہت سے ایسے کام بھی لوگوں نے شامل کر لیے ہیں جو سراسر دین و شریعت کے خلاف ہیں۔ جیسے: گانا بجانا، ناچنا، پٹھاخے چھوڑنا، وغیرہ تو

اس کی قباحت و برائی میں اور خلافِ شرع ہونے میں کس مسلمان کو شبہ ہوسکتا ہے؟

گانا بجانا حرام ہے

اس جلوس میں جو جو باتیں خلافِ شریعت ہوتی ہیں، ان میں سے ایک گانا بجانا ہے اور ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ اسلام میں گانا بجانا ناجائز ہے اور اس پر سخت وعید سنائی گئی ہے۔ اس سلسلے میں متعدد احادیث وارد ہوئی ہیں، ان میں سے دو احادیث نقل کرتا ہوں۔

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يُمْسَخُ قَوْمٌ مِّنْ أُمَّتِي فِيْ آخِرِ الزَّمَانِ قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ، قَالُوْا : يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ! وَيَشْهَدُوْنَ أَنَّکَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ، وَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ ، قَالَ: نَعَمْ وَيُصَلُّوْنَ وَيَصُوْمُوْنَ وَيَحُجُّوْنَ ، قَالُوْا : فَمَابَالُهُمْ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ!؟ قَالَ اِتَّخَذُوْا الْمَعَازِفَ وَالْقِيْنَاتِ وَ الدُّفُوْفَ وَيَشْرَبُوْنَ هٰذِهِ الْأَشْرِبَةَ ، فَبَاتُوْا عَلٰى لَهْوِهِمْ فَأَصْبَحُوْا قِرَدَةً وَخَنَازِيْرَ. »(۱)

(حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کیا ہے کہ آخری زمانے میں میری امت کے کچھ لوگ بندر اور خنزیر کی شکل میں مسخ ہوجائیں گے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا وہ توحید و رسالت کا اقرار کرتے ہوں گے؟ فرمایا: ہاں، وہ (برائے

(۱) حلية الأولياء:۳/۱۱۹، كتاب الملاهي لابن أبي الدنيا، كما في نيل الأوطار:۲/۸۶، عون المعبود:۱۱/۵۹، سنن سعيد بن منصور ، كما في المحلىٰ لابن حزم الظاهرى:۷/۵۶۴

نام) نماز، روزہ اور حج بھی کریں گے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ! پھر ان کا یہ حال کیوں ہوگا؟ فرمایا: وہ آلاتِ موسیقی، رقاصہ عورتوں اور طبلہ اور سارنگی وغیرہ کے رسیا ہوں گے اور شرابیں پیا کریں گے (بالآخر) وہ رات بھر مصروفِ لہو ولعب رہیں گے اور صبح ہوگی تو بندر اور خنزیروں کی شکل میں مسخ ہو چکے ہوں گے۔)(معاذ اللہ)

(۲) حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: بلا شبہ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہدایت دینے والا اور مومنین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا ہے اور اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ گانے بجانے کے آلات واسباب، صلیب اور جاہلی رسومات کو ختم کر دوں اور مٹادوں۔(۱)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام میں گانا بجانا کس قدر برا ہے؟ ایک بات تو یہ معلوم ہوئی کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا میں بھیجے جانے کا ایک مقصد یہی ہے کہ گانے بجانے کے آلات اور جاہلی رسومات کو ختم کیا جائے، دوسرے یہ معلوم ہوا کہ جو مسلمان بہ ظاہر نمازی بھی ہوں گے، روزہ کے پابند بھی ہوں گے اور حج پر حج بھی کریں گے؛ مگر اسی کے ساتھ گانے بجانے ناچنے نچانے اور ڈھول باجے اور میوزک وموسیقی کے دلدادہ اور شراب کے عادی اور رسیا ہوں گے، ان کو اللہ تعالیٰ خنزیر اور بندر کی شکل میں مسخ کر دیں گے، یہ لوگ رات بھر مصروفِ لہو ولعب رہ کر سوئیں گے اور جو صبح اٹھیں گے تو مسخ شدہ اٹھیں گے۔

اور یاد رہے کہ قوالی میں اور عام گانے بجانے میں حکم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں؛ بل کہ غور کیا جائے تو عام گانوں سے زیادہ قباحت وشناعت قوالی میں ہے؛

(۱) مسند أحمد: ۲۲۳۶۱، مسند الطیالسي: ۱۲۳۰، المعجم الکبیر للطبراني: ۷/ ۲۱۷

کیوں کہ عام گانوں کو لوگ دین نہیں سمجھتے اور قوالی کو جو کہ غیر اسلامی؛ بل کہ خلافِ اسلام چیز ہے، اس کو لوگ دین سمجھتے ہیں اور غیرِ دین اور خلافِ دین کو دین سمجھنا بدترین جرم ہے اور یہی وہ چیز ہے، جس کی وجہ سے یہود و نصاریٰ گمراہ ہوئے۔

جاندار کی تصویر ناجائز ہے

جلوس میں ہونے والا دوسرا ناجائز کام جاندار کی تصویر ہے اور یہ بھی ہر مسلمان کو معلوم ہے کہ جاندار کی تصویر لینا بھی حرام ہے اور دیکھنا دکھانا بھی حرام ہے۔ چناں چہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

« سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ — صلی اللہ علیہ وسلم — يَقُوْلُ : إِنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَذَاباً يَّوْمَ الْقِيَامَةِ الْمُصَوِّرُوْنَ. »(۱)

(میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب تصویر بنانے والوں کو ہوگا۔)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے ایک تصویر ساز کو تصویر سازی کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا:

« سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ — صلی اللہ علیہ وسلم — يَقُوْلُ : وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ ذَهَبَ يَخْلُقُ كَخَلْقِيْ , فَلْيَخْلُقُوْا حَبَّةً ، فَلْيَخْلُقُوا ذَرَّةً . »(۲)

(میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا

---

(۱) البخاري:۵۹۵۰،مسلم:۵۶۵۹،سنن النسائي:۵۳۶۴،مسند أحمد:۳۵۵۸

(۲) البخاري:۵۴۹۷،مسلم:۳۹۴۷،مسند أحمد:۶۸۶۹،مصنف ابن أبي شيبة:۵/۲۰۰

کہ اس سے زیادہ کون ظالم ہوگا، جو میری (یعنی اللہ کی) طرح تخلیق کرنے لگا (وہ کسی جاندار کو تو کیا پیدا کرے گا) ذرا ایک دانہ یا ایک ذرہ ہی بنا کر دکھا دے۔)

نوٹ: تصویر کی حرمت پر دنیا بھر کے علما اور مختلف مسلک کے علما، (دیو بندی و بریلوی و جماعت اسلامی و اہل حدیث وغیرہ) کے فتاوی ہم نے اپنی کتاب ''حرمتِ تصویر - علمائے عرب و عجم کے فتاویٰ'' میں جمع کر دیے ہیں، اس میں دیکھنے سے اندازہ ہوگا کہ آج جو علما تصویر کشی کا ارتکاب کرتے ہیں، وہ دراصل ان کی کوتاہی ہے، خواہ وہ کسی بھی مکتبِ فکر سے تعلق رکھتے ہوں، کسی عالم کے حرام کام کر لینے سے وہ جائز نہیں ہو جاتا، ہاں! وہ عالم خود شریعت کی نگاہ میں گر جاتا ہے۔ بعض دیو بندی علما اور خود دیو بند سے آنے والے علما کی تصاویر آئے دن اخبارات میں شائع ہوتی رہتی ہیں، یہ اگر ان کے علم کے بغیر اخبار والوں کی جانب سے ہو رہا ہے، تو ہم ان کو معذور کہیں گے؛ لیکن اگر ان حضرات کے علم سے شائع ہوتی ہیں یا وہ اس سے راضی ہیں، تو سمجھنا چاہیے کہ یہ لوگ بھی شریعت کے حکم کو توڑ رہے ہیں، ناجائز کام دیو بندی کرے یا بریلوی کرے، اپنا کرے یا غیر کرے سب کا حکم ایک ہے اور ان لوگوں کے عمل کو دیو بندی یا بریلوی مسلک قرار دینا بھی صحیح نہیں، جب کہ خود ان کے اکابر علما نے پوری تحقیق سے مسئلہ واضح کر دیا ہے؛ لہٰذا ان کے اس عمل کو جواز کی دلیل بنانا سو فیصد غلط ہے۔

آتش بازی جائز نہیں

اس جلوس میں ایک کام یہ ہوتا ہے کہ لوگ پٹھاخے چھوڑتے ہیں، معلوم ہونا چاہیے کہ یہ آتش بازی کی رسم بھی غیروں کی رسم ہونے کی وجہ سے اس میں ایک تو غیر

قوموں سے تشبہ ہے اور غیروں سے تشبہ حرام ہے اور اس سلسلے میں احادیث کے اندر وعید بھی وارد ہوئی ہے، جیسا کہ آگے ہم احادیث پیش کریں گے۔ نیز اس میں اسراف اور مال کی تضییع بھی ہے اور یہ بھی حرام ہے کہ مال کو فضول اڑایا جائے اور اس کو ضائع کیا جائے۔

قرآن میں ہے:

﴿ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ، إِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا إِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِرَبِّهٖ كَفُوْرًا ﴾ (۱)

(اور بے موقعہ خرچ نہ کرو؛ کیوں کہ بے موقعہ خرچ کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں اور شیطان اپنے رب کا بڑا ناشکرا ہے۔)

اور حدیث میں حضرت مغیرہ بن شعبہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَ عَلَيْكُمْ عُقُوْقَ الْأُمَّهَاتِ وَ وَأْدَ الْبَنَاتِ، وَ مَنْعَ وَهَاتَ، وَ كَرِهَ لَكُمْ قِيْلَ وَ قَالَ ، وَ كَثْرَةَ السُّوَالِ ، وَ إِضَاعَةَ الْمَالِ. » (۲)

(اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی حق تلفی، لڑکیوں کو زندہ درگور کرنے اور حق کی ادائیگی سے منع کرنے اور ناحق کسی سے لینے کو حرام قرار دیا ہے اور بحثا بحثی کو، کثرت سوال کو اور مال کے ضائع کرنے کو مکروہ و ناپسند کیا ہے۔)

---

(۱) الإسراء: ۲۶-۲۷

(۲) الصحيح للبخاري: ۲۴۰۸

اور تیسرا اس میں جانی و مالی خطرات بھی ہیں، جیسا کہ سب لوگ جانتے ہیں، کہ اس سے بسا اوقات بڑے بڑے جانی و مالی حوادث پیش آتے ہیں، جانیں تباہ ہوجاتی ہیں اور مال و املاک کا شدید نقصان ہو جاتا ہے اور یہ ظاہر کہ اسلام جیسے معقول و پاکیزہ مذہب میں اس کی کیا گنجائش ہوسکتی ہے، کہ اپنا یا کسی اور کا جانی و مالی نقصان کیا جائے؟

الغرض پٹھاخے چھوڑنا بھی اسلام کی رو سے ناجائز ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں: ایک غیروں کی مشابہت، دوسرے اسراف وتبذیر اور تیسرے مال کی اضاعت اور چوتھے جانی و مالی خطرات کا اندیشہ، ان میں سے ایک وجہ بھی اس کے ناجائز ہونے کے لیے کافی ہے، جب کہ یہاں چار چار وجوہات جمع ہیں۔

محترم شخصیات کا روپ دھارنے کا حکم

اور رہا معاملہ حضرت ٹیپو سلطان رَحِمَہُ اللہُ وغیرہ محترم شخصیات کا روپ اختیار کرنا اور ان کی نقالی کرنا، تو اس میں ظاہر ہے کہ ان شخصیات کے ساتھ گستاخی و استہزا ہے۔ غور کیجیے کہ کیا کوئی مسلمان اس کو اچھا خیال کرسکتا ہے، کہ ہمارے ان بڑوں کی توہین و مذاق کیا جائے؟ اسی لیے علما نے اللہ کے رسول صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یا صحابہ رَضِیَ اللہُ عَنْہُم کے ساتھ اس طرح کرنے کو بہ اتفاق ناجائز قرار دیا ہے۔

نیز یہ بھی اس جگہ بہت قابل غور بات ہے کہ عموماً یہ روپ دھارنے والے ایسے ویسے ہی لوگ ہوتے ہیں، جن کا دین وشریعت سے زیادہ تعلق نہیں ہوتا، نماز روزے سے بھی دور اور شرعی احکامات سے لاپرواہ ہوتے ہیں۔ کیا اس قسم کے لوگوں کا محترم شخصیات کی اداکاری کوئی معنے رکھتی ہے؟ کیا اس سے ان بزرگوں کے مقام ومنزلت، ان کی عظمت وجلالت میں فرق نہیں آتا؟ الغرض یہ بات بھی اس جلوس کے ناجائز

ہونے میں ایک وجہ کا اضافہ کرتی ہے۔

نماز کا ترک، بدترین گناہ ہے

پھر جلوس کے موقعے پر لوگ نمازوں کو ترک کر کے جلوس میں گانے بجانے میں مصروف رہتے ہیں، یہ تو سب سے بڑا اور بدترین گناہ ہے۔کون مسلمان اس سے ناواقف ہوگا، کہ نماز اہم العبادات و اہم الفرائض ہے اور اس کو جان بوجھ کر ترک کرنے پر اسلام میں سخت وعید وارد ہوئی ہے؟

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"إِنَّ بَيْنَ الرَّجُلِ وَ بَيْنَ الشِّرْكِ وَ الْكُفْرِ تَرْكَ الصَّلَاةِ." (۱)

(بے شک آدمی اور کفر و شرک کے درمیان فرق کرنے والی چیز نماز کا چھوڑنا ہے۔)

ایک حدیث میں حضرت ام ایمن رضی اللہ عنہا سے ایک لمبی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ تَرَكَ الصَّلَاةَ مُتَعَمِّداً فَقَدْ بَرِئَتْ مِنْهُ ذِمَّةُ اللّٰهِ.» (۲)

(جس نے جان بوجھ کر نماز چھوڑ دیا، اس سے اللہ کی امان اٹھالی جاتی ہے۔)

مگر کس قدر افسوس کی بات ہے کہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا

---

(۱) الصحيح لمسلم: ۲۵۶، واللفظ له، الجامع للترمذي: ۲۶۱۹، سنن أبي داود: ۴۶۸۰، سنن ابن ماجه: ۱۰۷۸، سنن النسائي: ۴۶۴

(۲) سنن البيهقي: ۷/۳۰۴

دعوی بھی کرتے ہیں اور نماز جیسی اہم عبادت کا برابر ترک کرتے رہتے ہیں اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ اسی کو محبت و عشق کی علامت قرار دیتے ہیں۔ اللہ کے لیے اور رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کے لیے ذرا ٹھنڈے دل سے سوچیے کہ کیا ہماری یہ روش صحیح ہے اور کیا اس سے اللہ و رسول کی خوش نودی میسر ہو جائے گی، جب کہ ہم ان کے احکام کو پامال کرتے جاتے ہیں؟

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی! کیں رہ کہ تو می روی بتر کستان است

(مجھے خوف ہے او بدوی کہ کعبے کو نہیں پہنچ سکتا؛ اس لیے کہ یہ راستہ کعبے کی دوسری جانب ترکستان کی طرف جاتا ہے۔)

دین کو کھیل بنانا یہود و نصاری کا کام ہے

ان سب سے ہٹ کر اور سب سے بڑھ کر ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ اس ساری کارروائی کا جو انداز ہوتا ہے وہ ایک کھیل تماشے کا ہوتا ہے، جیسے اس جلوس میں منہ سے آگ کے شعلے نکالنے اور دوسری طرح کے کرتب و تماشے دکھانے کا بھی ایک رواج ہے اور اس سے ایسا لگتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک دین اسی کھیل تماشے کا نام ہے۔ نہ نمازوں کا اہتمام، نہ دین کے احکام و تعلیمات کا لحاظ؛ بل کہ سب کو پامال کرتے ہوئے کچھ من مانی باتوں اور کھیل تماشوں کو دین و شریعت کے نام سے اور اللہ کے نبی صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کی محبت کے نام سے کرتے ہیں۔

کیا یہ صورتِ حال وہی تو نہیں، جس کا ذکر قرآن نے یہود و نصاری کے بارے میں کیا ہے اور ہمیں اس سے بچنے اور دور رہنے کا حکم دیا ہے؟

قرآن پاک میں ایک جگہ اللہ تعالیٰ نے کفار کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے:

﴿ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّ غَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ

الدُّنیَا ﴾ (۱)

(جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا دیا اور ان کو دنیوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔)

ایک جگہ اہلِ اسلام و ایمان کو ان لوگوں سے دوستی کرنے سے منع کیا گیا ہے، جو اپنے دین کو کھیل تماشا بناتے ہیں:

﴿ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَکُمْ ھُزُوًا وَّ لَعِبًا مِّنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَالْکُفَّارَ اَوْلِیَآءَ وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴾ (۲)

(اے ایمان والو! تم اپنا دوست نہ بناؤ! ان لوگوں کو جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا ہے، ان لوگوں میں سے جو تم سے پہلے کتاب دیے گئے اور کافر لوگوں میں سے اور اللہ سے ڈرتے رہو، اگر تم ایمان والے ہو۔)

ایک دوسرے موقعے پر ان لوگوں سے باز رہنے کا حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے:

﴿ وَ ذَرِ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا دِیْنَھُمْ لَعِبًا وَّ لَھْوًا وَّغَرَّتْھُمُ الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا ﴾ (۳)

(اور ان لوگوں کو چھوڑو، جنھوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا لیا ہے اور ان کو دنیوی زندگی نے دھوکہ میں ڈال دیا ہے۔)

---

(۱) الاعراف: ۵۱

(۲) المائدۃ: ۵۷

(۳) الانعام: ۷۰

یہ ساری آیات بتا رہی ہیں کہ دین کو کھیل و تماشا نہیں بنایا جا سکتا اور جن لوگوں نے ایسا کیا، ان سے دوستی بھی نہیں کی جا سکتی اور ان سے دور رہنا ضروری ہے۔ جب یہود و نصاریٰ کی اس روش کو اللہ تعالیٰ نے پسند نہیں کیا، تو کیا ہم کو اس کی اجازت ہو سکتی ہے؟ کہ ہم دین کے نام پر کھیل کود کو رائج کریں اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے نام پر ناجائز امور کا ارتکاب کریں؟

بے دینی کی بات کو دین سمجھنا بڑی گمراہی ہے

اب تک جو بھی عرض کیا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ اگر ہم جلوس کو فی نفسہ صحیح مان لیں؛ تو بھی ان امور کی وجہ سے اس کو محبتِ رسول کا نام دینا شریعت سے کھلی بغاوت ہے؛ کیوں کہ جو کام اللہ و رسول کو ناراض کرنے والے ہیں اور جن کو اللہ و رسول نے حرام و ناجائز قرار دیا ہے، ان کو دین کا کام سمجھنا بڑی گمراہی کی بات ہے۔

کیا اس سے بھی بڑی کوئی گمراہی اور دین سے اور اللہ و رسول سے بغاوت ہو سکتی ہے، کہ دین کے خلاف باتوں کو دین سمجھ لیا جائے اور اس کو دین کے عنوان سے کیا جائے اور اللہ و رسول کی محبت کا ان کو نام دیا جائے، جب کہ خود اللہ و رسول نے اس کو حرام و ناجائز قرار دیا ہے؟

خدارا غور کیجیے کہ آج امت کہاں جا رہی ہے اور گمراہی کے کس غار میں گری جا رہی ہے؟

جلوس-دین میں نیا طریقہ ہے

اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی سمجھنے کی ہے کہ اگر جلوس ان ناجائز امور سے جن کا اوپر ذکر ہوا خالی ہوتا؛ تب بھی جلوس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کی محبت وعقیدت اور عظمت کے اظہار کا طریقہ نہ قرآن وحدیث سے ثابت ہے، نہ صحابہ وتابعینِ کرام کے قرونِ خیر میں اس کا کوئی وجود ملتا ہے اور نہ ائمۂ اسلاف نے ہمیں بتایا ہے۔ اگر یہ طریقہ مشروع ہوتا؛ تو اس کا ذکر قرآن یا حدیث یا صحابہ کے اقوال یا افعال یا کم از کم ائمۂ کرام کے قول وفعل سے ثابت ہوتا؛ لیکن جب ایسا نہیں ہے، تو معلوم ہوا کہ یہ طریقہ دین میں ایجاد واحداث ہے۔

بدعت کی مذمت

اور اسلام میں بدعت اور دین میں اپنی جانب سے نئی بات ایجاد کرنے کی مذمت آئی ہے۔ ایک حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« مَنْ أَحْدَثَ فِيْ أَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ . » (۱)

(جس نے ہمارے اس امر یعنی دین میں کوئی ایسی چیز پیدا کی، جو اس میں سے نہیں ہے، تو وہ مردود ہے۔)

اور ایک حدیث میں حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ ایک بار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں کھڑے ہوکر خطبہ دیا اور ایسا بلیغ خطبہ دیا کہ دل کانپنے اور آنکھیں بہنے لگیں۔ آپ سے کہا گیا کہ یا رسول اللہ! آپ نے ایسا خطبہ دیا، جیسے کوئی رخصت ہونے والا خطبہ دیتا ہے؛ لہٰذا ہم سے کوئی عہد فرمائیے۔

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« عَلَيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ ، وَ السَّمْعِ ، وَ الطَّاعَةِ ، وَ إِنْ عَبْداً حَبَشِيًّا ، وَ سَتَرَوْنَ مِنْ بَعْدِيْ اخْتِلَافاً شَدِيْداً ، فَعَلَيْكُمْ

(۱) البخاري:۲۶۹۷، مسلم:۴۵۸۹، سنن أبي داود:۴۶۰۸، سنن ابن ماجة:۱۴

بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ ، عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ ، وَإِيَّاكُمْ وَالأُمُوْرَ الْمُحْدَثَاتِ ؛ فَإِنَّ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلالَةٌ . » (۱)

(تم پر اللہ سے ڈرنا، امیر کی بات سننا اور اس کی اطاعت کرنا لازم ہے، اگر چہ کہ وہ امیر کوئی حبشی غلام ہی کیوں نہ ہو اور تم میرے بعد بہت سخت اختلاف دیکھو گے؛ لہٰذا تم پر میری سنت اور خلفائے راشدین مہدیین کی سنت لازم ہے اور تم ان کو دانتوں سے مضبوط پکڑ لو اور دین میں نئی نئی باتوں سے بچے رہو؛ کیوں کہ ہر بدعت گم راہی ہے۔)

ایک حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إِنَّ أَصْدَقَ الْحَدِيْثِ كِتَابُ اللّٰهِ ، وَ أَحْسَنَ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ، وَ شَرَّ الْأُمُوْرِ مُحْدَثَاتُهَا ، وَ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ ، وَ كُلَّ بِدْعَةٍ ضَلالَةٌ ، وَ كُلَّ ضَلالَةٍ فِي النَّارِ . » (۲)

(سب سے سچی بات اللہ کی کتاب ہے اور سب سے بہترین طریقہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے اور سب سے بدترین کام دین میں پیدا کی گئی نئی باتیں ہیں اور دین میں پیدا کی گئی ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گم راہی ہے اور ہر گم راہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔)

لہٰذا جلوس نکال کر اللہ کے رسول سے محبت و عظمت کے اظہار کا یہ طریقہ، چوں کہ

---

(۱) سنن أبي داود:۴۶۰۷،سنن ابن ماجة:۴۲،مسندأحمد:۱۷۱۸۴، مسند بزار: ۴۲۰۱،المستدرک للحاکم:۱/۱۷۴

(۲) سنن النسائي:۱۵۷۸،صحيح ابن خزيمة :۳/۱۴۳)

نہ قرآن سے ثابت ہے، نہ حدیث سے اور نہ صحابہ وتابعین وائمۂ کرام سے ثابت ہے؛ اس لیے یہ ایک بدعت ہے، جس کی شریعت میں اجازت نہیں ہے۔

جلوس میں غیروں سے مشابہت ہے

دوسری بات یہ ہے کہ اس میں غیروں کی مشابہت بھی ہے؛ کیوں کہ جلوس کا طریقہ غیروں کی نقالی میں اپنایا گیا ہے اور اسلام میں غیروں کی مشابہت اختیار کرنے سے منع کیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ.» (۱)

(جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ ان ہی میں سے ہوگا۔)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَا تَشَبَّهُوْا بِالْيَهُوْدِ وَلَا بِالنَّصَارٰى ؛ فَإِنَّ تَسْلِيْمَ الْيَهُوْدِ الْإِشَارَةُ بِالْأَصَابِعِ، وَ تَسْلِيْمَ النَّصَارٰى الْإِشَارَةُ بِالْأَكُفِّ. » (۲)

(وہ ہم میں سے نہیں جو غیروں سے مشابہت اختیار کرے، تم یہود سے مشابہت نہ کرو اور نہ نصاری سے، یہود کا سلام انگلیوں کے اشارے سے اور نصاری کا سلام ہتھیلیوں کے اشارے سے ہوتا ہے۔)

اور ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ڈاڑھی کے بارے میں مشرکین ومجوس کی مخالفت کرنے کا حکم دیا، کہ وہ ڈاڑھی نہیں رکھتے یا چھوٹی

---

(۱) سنن أبي داود: ۴۰۳۱

(۲) الجامع للترمذي: ۲۶۹۵

رکھتے ہیں؛ لہٰذا تم ڈاڑھی کو بڑھاؤ۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

" خَالِفُوْا الْمُشْرِكِيْنَ وَفِّرُوْا اللِّحٰى وَ أَحْفُوْا الشَّوَارِبَ"(۱)

(مشرکین کی مخالفت کرو، اپنی ڈاڑھیوں کو بڑھاؤ اور مونچھوں کو پست کرو۔)

اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« جُزُّوْا الشَّوَارِبَ وَ أَرْخُوا اللِّحٰى، خَالِفُوْا الْمَجُوْسَ.» (۲)

(مونچھوں کو کٹاؤ اور ڈاڑھی کو بڑھاؤ اور مجوسیوں کی مخالفت کرو۔)

نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشورا کے دن روزے کے بارے میں جب یہود کو دیکھا، کہ وہ بھی رکھتے ہیں؛ تو فرمایا کہ اگر میں اگلے سال زندہ رہا؛ تو نویں تاریخ کا روزہ اس کے ساتھ ملاؤں گا۔ (۳)

ایک حدیث میں ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«صُوْمُوْا يَوْمَ عَاشُوْرَاءَ ، وَ خَالِفُوا الْيَهُوْدَ ، صُوْمُوْا قَبْلَه يَوماً أَوْ بَعْدَهٗ يَوْماً .» (۴)

---

(۱) البخاري:۵۷۹۲،و اللفظ له،مسلم:۶۲۵،شرح السنة:۳۱۹۴،سنن البيهقي:۱/۱۵۰

(۲) مسلم:۶۲۶،معرفة السنن للبيهقي:۱/۴۴۰،مسند أبي عوانة:۱/۱۶۱

(۳) مسلم:۲۷۲۲،سنن أبي داود:۲۴۴۷،السنن للبيهقي:۴/۲۸۷

(۴) صحيح ابن خزيمة:۳/۲۹۰،واللفظ له،الطحاوي: ۲/۸۷، شعب الإيمان: ۳۲۹/۵، مصنف ابن عبد الرزاق:۴/۲۸۷

(عاشورا کے دن روزہ رکھو اور یہود کی مخالفت کرو اور اس کے ایک دن پہلے یا ایک دن بعد بھی روزہ رکھو۔)

غور کیجیے کہ جب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو عبادات تک میں یہ گوارا نہیں تھا کہ غیروں سے مشابہت ہو جائے؛ تو ہم غیروں ہی کی چیز کو اختیار کریں، تو آپ کو کب گوارا ہو سکتا ہے؟ اور پھر اس ناپسندیدہ کام کو "محبتِ نبوی" ہی کے نام پر کیا جائے، تو کیا یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش نودی کا باعث ہو سکتا ہے؟

خلاصۂ کلام

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اولاً تو جلوس کے ذریعے محبتِ رسول و عشقِ رسول کے اظہار کا یہ طریقہ، نہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے اور نہ صحابہ و تابعین اور ائمۂ سلف سے اس کا کوئی ثبوت ملتا ہے۔ لہٰذا یہ طریقہ دین میں ایجاد و بدعت ہے۔ ہمیں اس کی جگہ دین و شریعت پر گامزن ہونے اور اللہ کے دین کو خود پر اور دنیا والوں پر نافذ کرنے کی کوشش کر کے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا ثبوت دینا چاہیے، پھر چوں کہ اس جلوس میں متعدد امور خلافِ شرع داخل و شامل ہیں؛ اس لیے اگر فی نفسہٖ بھی یہ جائز ہوتا؛ تب بھی ان امور کی وجہ سے وہ ناجائز ہے؛ لہٰذا اس طریقے سے بچنا اور امت کو اس سے بچانا چاہیے۔

دینی بھائیوں سے ایک گزارش

آخر میں میں تمام اہلِ اسلام کو دعوت غور و فکر دیتا ہوں کہ خدارا ذرا سنجیدگی کے ساتھ سوچیں اور غور کریں کہ اللہ و رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کا تقاضا کیا ہے؟ اور آپ کی یاد منانے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟ افسوس کہ ہم نے اللہ و رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کو کس قدر سستا سمجھ لیا ہے کہ اللہ و رسول سے محبت کے اظہار کے لیے ہماری تمام تر کوششیں و کاوشیں صرف چند ظاہری رسموں اور رکھو کھلے

مظاہروں تک محدود ہو گئی ہیں، جن میں روح نامی کوئی چیز نہیں؛ بل کہ اس سے بڑھ کر کھیلوں اور تماشوں اور خلافِ شرع باتوں تک کو دین وشریعت اور اللہ ورسول سے محبت کا نام دے کر ہم نے دین سے کھلواڑ کرنا شروع کر دیا ہے اور ہم خود کو اس دھوکے میں رکھے ہوئے ہیں کہ ہم نے اللہ ورسول سے محبت وعشق کا حق ادا کر دیا۔

کیا ہم نے کبھی یہ سوچنے کی زحمت گوارا کی کہ ان کھیل تماشوں اور خلافِ شرع کاموں سے کیا اللہ ورسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خوش نودی حاصل ہوتی ہے؟ کیا اللہ ورسول کے احکامات ہمارے لیے یہی ہیں؟ کیا ہم نمازوں کی پابندی کرتے ہیں ؟ کیا دین وشرع کا لحاظ کرتے ہیں، حلال وحرام کی تمیز میں ہمارا کیا حال ہے؟ سنتوں کی پابندی کہاں تک کرتے ہیں؟ ہماری معاشرت ، ہمارے اخلاق ، ہمارے معاملات کہاں تک قرآن وسنت کے دائرے میں ہوتے ہیں؟

لہٰذا ہمیں حقیقت کی طرف رجوع کرنا چاہیے اور سیرتِ نبوی سے اپنی زندگیوں کو معمور ومنور کرنا چاہیے اور ان تمام باتوں سے دور ونفور ہونا چاہیے، جو اللہ ورسول کو ناپسند ہیں اور جن کو شریعت نے حرام وممنوع قرار دیا ہے۔ اور اپنے عمل وکردار سے بھی اور اپنی زبان سے بھی سیرت وشریعت کے پیغام کو عام کرنا چاہیے ۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کا حقیقی وواقعی تقاضا یہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کے راستے پر گامزن فرمائے اور اللہ و رسول کی سچی و پکی محبت وعظمت سے ہمارے قلوب کو معمور فرمائے اور بدعات و خرافات سے بچائے۔ آمین !یا رب العالمین !!۔

محمد شعیب اللہ خان
الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور
۲/ ربیع الاول/۱۴۳۴ھ

عید کا مصافحہ
اور راہِ اعتدال

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض حال

آج کل ''مصافحہ بعدِ عید'' کا عنوان عوام وخواص کی توجہات کا مرکز بنا ہوا ہے، کچھ حضرات نے عوام کے احوال کے پیشِ نظر اس کے بدعت ہونے کا فتوی دیا ہے اور ابھی نہیں؛ بل کہ بہت پہلے سے بہت سے علمائے اکابرین (جن کا ذکر اس رسالے میں ہے) کا یہی فتوی ہے۔ان اکابرین کی اقتدا میں احقر نے بھی اسی کو اختیار کیا اور اپنی بعض کتب میں اس کو لکھا ہے اور کچھ حضرات شروع ہی سے اس کے برخلاف مصافحہ ٔمروجہ کے جواز واستحسان کے قائل رہے ہیں اور ہر ایک اپنی اپنی جگہ اپنی اپنی رائے کے مطابق اعلان و بیان کرتا اور عمل اختیار کرتا رہا ہے؛ مگر اب یہ ہوا کہ ایک طرزِ عمل و رائے کے حاملین نے دوسرے نظریئے والوں پر افتراق وانتشار پھیلانے اور بے علمی و جہالت کے طعنے دینے شروع کر دیے، جو علم کے میدان میں ایک معیوب بات ہے۔ حالاں کہ سب جانتے ہیں کہ فقہ وفتوے کی روشنی میں قائم رائے کو پیش کرنا؛ بالخصوص جب کہ اکابر کی بھی وہی رائے وفتوی ہو،کوئی غلط بات نہیں؛ بل کہ حق ہے۔

زیرِ نظر تحریر میں اسی صورتِ حال کو سامنے رکھتے ہوئے اس سلسلے میں فقہا کے

مسالک، ان کے کلام کی تشریح وتوضیح اور اس سے حاصل ہونے والے نتائج اور افراط وتفریط سے بچتے ہوئے، ہر نقطہ نظر کے حاملین کی دلیل کو مرتب کرنے اور اس مسئلے میں ''راہِ اعتدال'' پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ میں علما سے اس پر سنجیدگی سے نظر کرنے اور کوئی بات قابلِ اشکال ہو، تو علمی پیرائے میں پیش کرنے کی گزارش کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں افراط وتفریط سے بچتے ہوئے راہِ حق کو اپنانے کی توفیق عطا فرمائے۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان
(مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور)
۲/شوال المکرّم/۱۴۳۱ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عید کا مصافحہ اور راہِ اعتدال

عید کے موقعے پر مصافحے کا رواج بہت سے علاقوں میں پایا جاتا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہت پہلے سے بعض علاقوں میں اس کا رواج چلا آ رہا ہے، جس طرح بعض جگہ جمعے میں اور بعض جگہ نمازِ فجر و عصر کے بعد اس کا رواج ہے۔ اس خاص مصافحے کا کیا حکم ہے؟ اس کے بارے میں فقہا کے کلام میں بہ ظاہر اختلاف نظر آتا ہے۔

مصافحہ بعدِ نماز کے بارے میں پہلا قول

فقہا کا ایک طبقہ وہ ہے، جو یہ کہتا ہے کہ عیدین یا کسی نماز کے ساتھ مصافحے کو مخصوص کرنا مکروہ و بدعت ہے؛ کیوں کہ ان خاص مواقع پر مصافحے کا کوئی ثبوت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ و تابعین سے نہیں ہے؛ بل کہ مصافحہ تو اصل میں ملاقات یا رخصت کے وقت مشروع ہے۔

فقہ حنفی کے مشہور شارح و محقق علامہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ نے لکھا ہے:

”وقد صرح بعض علمائنا وغيرهم بكراهة المصافحة المعتادة عقب الصلوات مع أن المصافحة سنة، و ما ذاک إلا لكونها لم تُؤثَر في هذا الخصوص ، فالمواظبة

عليها فيه توهم العوام بأنها سنة ." (۱)

(ہمارے بعض علما (احناف) اور دیگر علما نے نمازوں کے بعد کے رواجی مصافحے کے مکروہ ہونے کی تصریح کی ہے، حال آں کہ مصافحہ تو سنت ہے ،اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ خاص ان موقعوں پر مصافحہ منقول نہیں ہے؛ لہٰذا اس کی پابندی عوام کو اس وہم میں ڈالتی ہے کہ یہ سنت ہے۔)

اسی طرح علامہ ملا علی قاری رحمہ اللہ نے " مرقاة شرح مشكاة" میں امام نووی رحمہ اللہ کے نمازِ فجر وعصر کے بعد مصافحے کو جائز قرار دینے پر رد کرتے ہوئے لکھا ہے:

" أن عمل الناس في الوقتين المذكورين ليس على وجه الاستحباب المشروع ، فإن محل المصافحة المشروعة أول الملاقاة ، قد يكون جماعةٌ يتلاقون من غير مصافحة ويتصاحبون بالكلام ومذاكرة العلم وغيره مُدّةً مديدةً ، ثم إذا صَلّوا يتصافحون . فأين هذا من السُنّة المشروعة . ولهذا صرح بعض علمائنا بأنها مكروهة . وحينئذ أنها من البدع المذمومة ." (۲)

(بلا شبہ لوگوں کا یہ عمل ان دو مذکورہ اوقات میں مشروع ومستحب طریقے پر نہیں ہے؛ کیوں کہ مشروع مصافحے کا موقعہ اول ملاقات ہے

(۱) الشامي:۳/۱۴۱

(۲) مرقاة المفاتيح:۹/۷۴

اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کچھ لوگ بغیر مصافحے کے ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں اور باتوں اور علمی مذاکرے وغیرہ میں ایک لمبی مدت تک مشغول رہتے ہیں، پھر جب نماز پڑھ لیتے ہیں، تو مصافحہ کرنے لگتے ہیں۔ یہ کہاں سے سنتِ مشروعہ ہوا؟ اسی لیے ہمارے بعض علمانے تصریح کی ہے کہ یہ مکروہ ہے اور اس صورت میں یہ مذموم بدعات میں سے ہے۔)

اور حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ ''أشعة اللمعات'' میں لکھتے ہیں:

''آں کہ بعضے مردم مصافحہ میکنند بعد از نماز یا بعد از جمعہ چیزے نیست و بدعت است از جہت تخصیص وقت۔''(۱)

(بعض لوگ جو نماز کے بعد یا جمعہ کے بعد مصافحہ کرتے ہیں، یہ کوئی چیز نہیں اور وقت کی تخصیص کی وجہ سے بدعت ہے۔)

اور سنن ابن ماجہ کے محشی علامہ فخر الحسن دہلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے:

'' اعلم أن المصافحة سنة عند كل لقاءٍ و محلها أول الملاقاة ، فما اعتاده الناس بعد صلاة الصبح والعصر لا أصل له في الشرع ؛ بل يكون هذه المصافحة مكروهة ؛ لأنها ليس في محلها المشروع.'' (۲)

(جاننا چاہیے کہ مصافحہ ہر ملاقات کے وقت سنت ہے اور اس کا

---

(۱) أشعة اللمعات:۴/۱۲، بہ حوالہ: راہِ سنت:۱۳۳

(۲) حاشية ابن ماجه :۲/۲۶۳

موقعہ اول ملاقات ہے؛ لہٰذا لوگوں نے جو نمازِ فجر وعصر کے بعد اس کی عادت بنالی ہے، اس کی شریعت میں کوئی اصل نہیں ؛ بل کہ یہ مصافحہ مکروہ ہے؛ کیوں کہ یہ اس کے مشروع موقعہ پر نہیں ہے۔)

علمائے حنفیہ کے علاوہ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے بھی یہی لکھا ہے، ان سے جب کسی نے سوال کیا کہ نماز کے بعد مصافحہ سنت ہے یا نہیں؟ تو جواب لکھا کہ نماز کے بعد مصافحہ سنت نہیں ؛ بل کہ بدعت ہے۔(۱)

اسی طرح مشہور اہل حدیث عالم علامہ شمس الحق عظیم آبادی رحمہ اللہ نے ابو داود کی شرح ''عون المعبود'' میں لکھا ہے:

''قلت: و كذا المصافحة، و المعانقة بعد صلاة العيدين من البدع المذمومة المخالفة للشرع.'' (۲)

(میں کہتا ہوں کہ اسی طرح عید کی نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ قابلِ مذمت ومخالفِ شریعت، بدعات میں سے ہے۔)

بل کہ اس سے آگے بعض حضرات نے اس خاص قسم کے مصافحہ پر باز پرس کرنے اور سزا دینے تک کی بات کہی ہے۔ چناں چہ علامہ شامی نے بہ حوالہ ''تبيين المحارم'' ملتقط سے نقل کیا ہے:

'' إنه تكره المصافحة بعد أداء الصلاة بكل حال؛ لأن الصحابة - رضي الله عنهم - ما صافحوا بعد أداء الصلاة، و لأنها من سنن الروافض. ثم نقل عن ابن حجر - رحمه الله - من

---

(۱) فتاوی ابن تیمیہ:۵/۳۳۶

(۲) عون المعبود:۱۱/۲۴۸

الشافعية : أنها بدعة مكروهة ، لا أصل لها في الشرع و أنه يُنَبَّهُ فاعلُها أولًا و يُعَزَّرُ ثانياً ". (۱)

(نماز کے بعد مصافحہ ہر صورت میں مکروہ ہے؛ کیوں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے نماز کے بعد مصافحہ نہیں کیا اور اس لیے کہ یہ روافض کے طریقوں میں سے ہے۔ پھر ابن حجر شافعی رحمہ اللہ سے نقل کیا کہ یہ بدعتِ مکروہہ ہے، جس کی شریعت میں کوئی اصل و دلیل نہیں اور یہ کہ اس کام کے کرنے والے کو اولاً تنبیہ کی جائے گی اور پھر (بھی نہ مانے تو) سزا دی جائے گی۔)

بعض اکابر کے فتوے

ان عباراتِ فقہیہ میں نمازوں کے بعد یا جمعے کے بعد مصافحے کی تخصیص کو بدعت ومکروہ قرار دیا گیا ہے، اسی کے پیشِ نظر بڑے بڑے اکابر علمانے عید کے مصافحے کو بھی اسی تخصیص کی بنا پر بدعت قرار دیا ہے۔ یہاں چند اکابر علما کے فتوے نقل کرتا ہوں۔

(۱) قطب عالم حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''معانقہ ومصافحہ بہ وجہ تخصیص کے اس روز میں اس کو موجب سرور اور باعث مودت اور ایام سے زیادہ مثل ضروری کے جانتے ہیں، بدعت اور مکروہ تحریمی اور علی الاطلاق ہر روز مصافحہ کرنا سنت ہے، ایسا ہی بہ شرائطِ خود یوم العید کے ہے............کوئی تخصیص اپنی طرف سے کرنا بدعت ہے۔''(۲)

---

(۱) الشامي:۹/۵۴۷

(۲) فتاوی رشیدیہ:۴۴۳

(۲) حضرت علامہ عبد الحی لکھنوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے لکھا ہے:

''مصافحہ و معانقہ تو ابتدائے ملاقات کے وقت ہوا کرتا ہے، نمازِ عید کے بعد مسنون نہیں، بعض علما نے اس کو بدعتِ مباح کہا ہے اور بعض حضرات نے بدعت مکروہ، بہ ہر حال اس کا ترک اولیٰ ہے۔''(۱)

(۳) حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ عیدین میں مصافحے و معانقے کے بارے میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''قاعدہ کلیہ ہے کہ عبادات میں حضرت شارع علیہ السلام نے جو ہیئت و کیفیت معین فرمادی ہے، اس میں تغیر وتبدل جائز نہیں اور مصافحہ چوں کہ سنت ہے؛ اس لیے عبادات میں ہے، تو حسبِ قاعدۂ مذکورہ اس میں ہیئت و کیفیتِ منقولہ سے تجاوز جائز نہ ہوگا اور شارع علیہ السلام سے صرف اولِ لقا کے وقت بالاجماع یا وداع (رخصت) کے وقت بھی علی الاختلاف منقول ہے وبس، اب اس کے لیے ان دو وقتوں کے سوا اور کوئی محل و موقع تجویز کرنا تغیر عبادات ہے، جو ممنوع ہے؛ لہٰذا مصافحہ بعدِ عیدین یا بعدِ نمازِ پنج گانہ مکروہ و بدعت ہے۔''(۲)

حضرت تھانوی رَحِمَہُ اللّٰہُ ہی ایک اور موقعہ پر اسی کے بارے میں فارسی میں لکھتے ہیں:

''مصافحہ کردن مطلقاً سنت است، بہ وقتے خاص مخصوص نیست، پس تخصیصِ آں بروز جمعہ و عیدین و بعد نماز پنج گانہ وتراویح بے اصل

---

(۱) مجموعہ فتاوی عبد الحی: ۱/ ۹۸

(۲) امداد الفتاوی: ۱/ ۷۰۸

است ، ہاں اگر در ہمیں اوقات بہ کسے بعد مدتے ملاقات شود بہ اُو مصافحہ کردن مضائقہ نہ دارد، نہ ایں کہ از خانہ یا مسجد یا عیدگاہ ہمراہ آئند و، پس از نماز مصافحہ کنند۔"(۱)

(مطلقاً مصافحہ کرنا سنت ہے، کسی خاص وقت کے ساتھ مخصوص نہیں؛ لہٰذا اس کی تخصیص جمعہ وعیدین کے دن کے ساتھ اور پنج گانہ نماز وتراویح کے بعد کے ساتھ کرنا بے اصل ہے، ہاں اگر ان ہی اوقات میں ایک مدت کے بعد کسی سے ملاقات ہو تو اس سے مصافحہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، یہ نہیں کہ گھر سے یا مسجد سے یا عیدگاہ سے ساتھ ساتھ آئیں اور نماز کے بعد مصافحہ کرنے لگیں۔)

(۴) مفتیٔ اعظم حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب دہلوی رحمہ اللہ سے کسی نے سوال کیا ہے کہ نماز جمعہ وعیدین کے بعد مصافحہ و معانقہ جائز ہے یا نہیں؟ پھر مصافحے کی فضلیت میں وارد بعض احادیث اور علامہ نووی رحمہ اللہ کا قول کہ "بعد نمازِ فجر وعصر مصافحہ میں کوئی حرج نہیں" نقل کیا ہے۔اس کے جواب میں علامہ موصوف نے لکھا ہے :

"عیدین یا جمعے کی تخصیص سے مصافحہ و معانقہ کرنا کئی وجہ سے مکروہ اور بدعت ہے— پھر آگے لکھتے ہیں کہ — مصافحے کا مسنون وقت ملاقات کا وقت ہے، احادیث سے بہ وقتِ ملاقات مصافحہ ثابت ہوتا ہے۔امام نووی رحمہ اللہ نے بھی زیادہ سے زیادہ لفظ "لا باس به" کا استعمال کیا ہے اور بدعت مباحہ ہونا بتلایا ہے، ان کے قول سے

(۱) امداد الفتاوی:۵/۲۶۰

بھی مسنون یا مستحب ہونا ثابت نہیں ہوتا، پھر یہ جواز کا قول ان کا خیال ہے؛ ورنہ محققین شوافع کا یہی مذہب ہے کہ یہ تخصیص بدعت ہے؛ بل کہ ابن حجر رحمہ اللہ پہلی مرتبہ تنبیہ کرنے اور دوسری مرتبہ تعزیر (سزا) کا حکم دیتے ہیں اور یہی مذہب مالکیہ اور محققین حنفیہ کا ہے۔"(۱)

(۵) حضرت مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہ اللہ (سابق مفتی اعظم دارالعلوم دیوبند) نے اس رسم کو بدعت قرار دینے والے علما کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے:

"ملا علی قاری رحمہ اللہ نے "مرقات شرح مشکوۃ"، شیخ عبد الحق محدث دہلوی رحمہ اللہ نے " أشعة اللمعات" میں، "مجالس الابرار"، "فتاوی رشیدیہ"، "امداد الفتاوی"، "فتاوی ابن حجر مکی"، "فتاوی دار العلوم دیوبند" میں اس تخصیص کو بدعت قرار دے کر اس سے منع کیا ہے۔"(۲)

(۶) حضرت مولانا مفتی عبد الرحیم لاجپوری رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ عید اور رمضان وغیرہ مبارک مہینوں کا چاند دیکھ کر ایک دوسرے کو مبارک باد دیتے ہوئے مصافحہ کرتے ہیں؛ نیز جمعہ اور بالخصوص خطبۂ عید کے بعد مصافحہ کیا جاتا ہے، اس کا کیا ثبوت ہے؟ اس کے جواب میں آپ لکھتے ہیں:

"مصافحہ فی نفسہ سنت ہے؛ مگر نیا چاند دیکھ کر مبارک بادی کے وقت کی خصوصیت اور نمازِ جمعہ اور عیدین کے خطبہ کے بعد کی تخصیص بے اصل اور بے دلیل ہے۔ لہٰذا فقہائے کرام مذکور رسم کو مکروہ اور بدعت

---

(۱) کفایت المفتي: ۲۲/۱

(۲) فتاوی محمودیہ: ۱۴۵/۳

تحریر فرماتے ہیں۔“(۱)

(۷) حضرت مولانا مفتی نظام الدین صاحب رحمہ اللہ (سابق مفتی دار العلوم دیوبند) لکھتے ہیں:

”مصافحہ و معانقہ اول ملاقات میں مشروع ہوا ہے؛ لہٰذا عیدین کی نماز کے بعد مصافحہ کرنا، اس مشروعیت کے خلاف ہے؛ بل کہ محققین نے فرمایا ہے کہ یہ طریقہ روافض کا ہے، اس کو ترک کرنا ضروری ہے۔“(۲)

(۸) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم نے اس مصافحہ کا حکم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

”دو مسلمانوں کی ملاقات کے وقت مصافحہ مسنون ہے؛ نیز کوئی شخص سفر سے آئے، تو اس سے معانقہ کرنا بھی سنت سے ثابت ہے، ان دونوں مواقع کے علاوہ سنت نہیں؛ لیکن اگر سنت سمجھے بغیر اتفاقاً کبھی کر لے تو گناہ بھی نہیں اور سنت سمجھ کر کرے، تو بدعت ہے۔ ہمارے زمانے میں چوں کہ فرض نمازوں کے بعد مصافحہ اور عیدین کے بعد معانقے کو سنت سمجھا جانے لگا ہے، حالاں کہ یہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں؛ اس لیے علما نے اس کو بدعت قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے؛ لیکن کہیں اعتقادِ سنت کی یہ علت نہ ہو، تو مباح ہے۔“(۳)

---

(۱) فتاوی رحیمیہ: ۱/۲۸۰

(۲) نظام الفتاوی: جلدِ اول، قسطِ دوم: ۱۲۹

(۳) فتاوی عثمانی: ۱/۱۱۶

احقر نے اپنی بعض تحریروں میں ان ہی فقہا و علما کے کلام کی بنیاد پر اس کو مکروہ و بدعت لکھا تھا اور ہمارے مشائخ و اساتذہ میں سے بھی متعدد حضرات نے اسی کو اختیار کیا ہے اور اس کی دلیل یہی ہے کہ مصافحے کا اصل موقعہ ملاقات یا رخصت کا وقت ہے اور عیدین یا نمازوں کے بعد مصافحہ مشروع نہیں؛ کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ وسلف سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

فقہا کا دوسرا قول

دوسرا طبقہ فقہا کا یہ کہتا ہے کہ عید کی نماز کے بعد مصافحہ سنت یا مستحب ہے، صاحب "درر الحكام شرح غرر الأحكام"، اور صاحب "مجمع الأنهر شرح ملتقى الأبحر" وغیرہ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

چناں چہ "درر الحكام" اور "مجمع الأنهر" دونوں میں عید کے مستحبات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

"والتهنئة بـ" تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَ مِنْكُمْ" لا تُنْكَرُ كما في البحر، وكذا المصافحة ، بل هي سنةٌ عقب الصلوات كلها، وعند كل لُقي."(۱)

(" تَقَبَّلَ اللّٰهُ مِنَّا وَمِنْكُمْ "کے الفاظ سے مبارک بادی دینا قابل نکیر نہیں ہے، جیسا کہ "بحر الرائق" میں ہے، اسی طرح مصافحہ بھی قابل نکیر نہیں؛ بل کہ وہ تمام نمازوں کے بعد اور ملاقات کے وقت سنت ہے۔)

اور علامہ طحطاوی رحمہ اللہ نے بھی " حاشية مراقي الفلاح" میں عید کے

---

(۱) درر الحكام:۲/۱۴۹،واللفظ له ، مجمع الأنهر:۲/۵۹

مستحبات میں لکھا ہے:

"و تُطْلَبُ المصافحةُ ، فهي سنة عقب الصلاة كلها و عند كل لقاء." (۱)

(اور مصافحہ مطلوب ہے، پس وہ تمام نمازوں کے بعد اور ملاقات پر سنت ہے۔)

ان حضرات نے نمازِ عید کے بعد مصافحے کو سنت یا مستحب قرار دیا ہے اور اس کو عید کے مستحبات میں شمار کیا ہے۔

فقہا کا تیسرا قول

اور تیسرا طبقہ فقہا کا وہ ہے، جو نمازوں کے بعد مصافحے کو مباح و جائز کہتا ہے اور حنفیہ کے عام متون میں بھی اسی کو اختیار کیا گیا ہے۔ درمختار میں لکھا ہے:

" و إطلاق المصنف تبعاً للدرر و الكنز و الوقاية و النقاية والمجمع و الملتقى و غيرها يُفيد جوازَها مطلقاً و لو بعد العصر . و قولُهم : إنه بدعة ، أي بدعة مباحة ......" (۲)

(اور مصنف "المنار" کا دُرَر، کنز، وقایہ، نقایہ، مجمع اور ملتقی وغیرہ کتابوں کی اتباع میں مصافحہ کا مطلق جواز بیان کرنا اس کے مطلقاً جائز ہونے کا فائدہ دیتا ہے، اگر چہ وہ مصافحہ عصر کے بعد کیا جائے۔ رہا علما کا یہ کہنا کہ یہ "بعدِ عصر مصافحہ" بدعت ہے، اس سے مراد بدعتِ مباحہ ہے۔)

---

(۱) الطحطاوي على المراقي:۵۳۰

(۲) الدر المختار مع الشامي:۹/ ۵۴۷

اور بیشتر شوافع حضرات نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے، امام عز الدین بن عبد السلام رَحِمَہُ اللّٰہُ نے " قواعد الأحکام " میں اسی کو اختیار کرتے ہوئے اس کو بدعتِ مباحہ کی مثال میں شمار کیا ہے۔(۱)

اور علامہ نووی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اسی کی اتباع میں" المجموع شرح المهذب"، وغیرہ میں لکھا ہے:

"وأما هذه المصافحة المعتادة بعد صلاتي الفجر والعصر فقد ذكر الشيخ الإمام أبو محمد بن عبد السلام: أنها من البدع المباحة ، ولا تُوْصَفُ بكراهة ولا استحباب . وهذا الذي قاله حسن. والمختار أن يُقَالَ: إن صافح من كان معه قبل الصلاة فمباحة كما ذكرنا، وإن صافح من لم يكن معه قبل الصلاة عند اللقاء فسنةٌ بالإجماع للأحاديث."(۲)

(اور وہ مصافحہ جو بعد فجر وعصر عادۃً کیا جاتا ہے، اس کے بارے میں شیخ امام ابو محمد بن عبد السلام رَحِمَہُ اللّٰہُ نے کہا کہ یہ مباح بدعات میں سے ہے اور اسے نہ تو کراہت سے متصف کیا جا سکتا ہے اور نہ استحباب سے۔ اور انھوں نے جو کہا ہے یہ اچھی بات ہے اور اس سلسلے میں مختار قول یہ ہے کہ اگر نماز کے بعد مصافحہ ان لوگوں سے کرتا ہے، جو اس کے ساتھ نماز سے پہلے سے موجود تھے، تو یہ مباح ہے اور جو لوگ پہلے سے

---

(۱) قواعد الأحکام:۲/۳۸۴

(۲) المجموع:۳/۴۸۸

نہیں تھے، ان سے بعد نماز ملاقات کے وقت مصافحہ کرتا ہے، تو یہ احادیث کی وجہ سے بالاجماع سنت ہے۔)

اور امام رملی شافعی رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ نماز کے بعد مصافحہ جو کیا جاتا ہے، کیا یہ سنت ہے؟ تو جواب دیا کہ لوگ جو نماز کے بعد مصافحہ کرتے ہیں "لا أصل لها ولكن لا بأس بها" (اس کی کوئی اصل نہیں؛ لیکن اس میں کوئی حرج بھی نہیں)۔ (۱)

اسی طرح شوافع کی کتب میں سے "تحفة المحتاج شرح المنهاج"، "مغني المحتاج" وغیرہ میں بھی لکھا ہے کہ اس کی اصل یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ سے ثبوت نہیں ہے، تاہم اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

اس بحث سے یہ اندازہ تو ہو گیا کہ اس بارے میں حضراتِ فقہائے کرام کے مابین اختلاف ہوا ہے کہ نمازوں کے بعد مصافحہ کا جو رواج بعض لوگوں میں پایا جاتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟ بعض نے اس کو مکروہ و بدعت قرار دیا ہے اور بعض نے سنت یا مستحب کہا ہے اور بعض نے صرف مباح و جائز لکھا ہے۔ مگر اس اختلاف کو حقیقی اختلاف کہنا تو مشکل ہے؛ کیوں کہ اگر کسی تاویل سے فقہا کے کلام کو اختلاف سے نکالا جا سکتا ہو، تو اس کو اختلاف سے نکالنا چاہیے اور اس کے لیے ان کے کلام کا عمدہ محمل و محل سیاق و سباقِ کلام سے تلاش کرنا چاہیے۔ چناں چہ یہاں بھی یہ اختلاف محض صوری و ظاہری ہے اور حقیقت میں ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مصافحہ بعدِ نماز سنت نہیں

اس کی تفصیل یہ ہے کہ یہ بات تو تقریباً سب ہی فقہا مانتے ہیں کہ خواہ عید

---

(۱) فتاوى الإمام الرملي: ۱/۳۸۶

کی نماز ہو یا کوئی اور نماز بالتخصیص ان کے بعد مصافحے کا کوئی رواج زمانۂ رسالت یا زمانۂ صحابہ میں نہیں تھا، جیسا کہ اوپر ''شامی'' کے حوالے سے ہم نے ''ملتقط'' کی عبارت نقل کی ہے کہ صحابۂ کرام نے بعد نماز مصافحہ نہیں کیا۔ نیز امام شامی رَحِمَہُ اللّٰہُ مصافحہ بعد نماز کے بارے میں بعض حضرات کا یہ قول نقل کرنے کے بعد کہ ''یہ مباح و جائز ہے'' کہتے ہیں:

''ان کا ظاہر کلام یہی بتاتا ہے کہ ان مواقع پر سلف میں سے کسی نے مصافحہ نہیں کیا''۔(۱)

جب یہ معلوم ہوا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یا صحابہ و سلف میں سے کسی نے ان مواقع پر بالتخصیص مصافحہ نہیں کیا، تو اس سے اس قدر بات واضح ہوگئی کہ یہ معروف معنے کے لحاظ سے ''سنت'' نہیں ہے؛ کیوں کہ ''سنت'' اس کام کو کہتے ہیں کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم یا صحابہ کا اس پر مسلسل عمل رہا ہو، یہاں مسلسل تو الگ بات، ایک دفعہ کا بھی کوئی ثبوت اس خصوصیت کے ساتھ یہاں نہیں پایا جاتا؛ لہٰذا اس کو ''سنت'' نہیں کہا جا سکتا۔

فقہا کے کلام میں سنت سے مراد؟

ہاں! جن فقہا نے اس کو ''سنت'' کہا ہے جیسے صاحبِ ''درر الحکام'' و صاحبِ ''مجمع الأنھر'' وغیرہ نے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ حضرات ان تخصیصات کے ساتھ اس کو سنت قرار دیتے ہیں؛ بل کہ وہ اس کو عمومی سنتِ ملاقات ہونے کی وجہ سے اس موقعہ پر بھی ''سنت'' کہتے ہیں، اس سے قطعِ نظر کہ خاص کر عید کی سنت سمجھتے ہوئے یا اس خاص موقع پر اہتمام و التزام کرتے ہوئے اس کو

(۱) الشامي: ۹/۵۴۷

کرنے کا کیا حکم ہے؟ لیکن اگر ان تخصیصات کے ساتھ، اس موقع پر اس کا اہتمام و التزام کیا جائے تو وہ اس کو ''سنت'' نہیں کہتے۔

اس کی فقہی مثال یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض نمازوں میں بعض خاص سورتوں کے پڑھنے کا معمول آیا ہے؛ اس لیے فقہا نے اس کو سنت یا مستحب قرار دیا ہے۔ جیسے: جمعہ کی فجر میں ﴿سُورَةِ السَّجْدَةِ و سُورَةِ الْإِنْسَانِ﴾ اور وتر میں ﴿سُورَةِ الْأَعْلَىٰ ، الْكَافِرُونَ و الْإِخْلَاصِ﴾؛ مگر اسی کے ساتھ خود حضراتِ فقہا نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کا التزام مکروہ ہے۔ یہاں سنت یا مستحب ہونے کا حکم ایک عمومی حکم ہے، اس سے قطعِ نظر سے التزام و تخصیص کی جائے اور اس کے مکروہ ہونے کا حکم التزام و اہتمام و تخصیص کی وجہ سے ہے۔ چناں چہ ''الدر المختار'' میں لکھا ہے کہ وتر میں سنت یہ ہے کہ ﴿سُورَةِ الْأَعْلَىٰ ، سُورَةِ الْكَافِرُونَ اور سُورَةِ الْإِخْلَاصِ﴾ پڑھا جائے اور ''ھدایۃ'' وغیرہ کتبِ فقہ میں لکھا ہے کہ نمازوں میں خاص سورتوں کو مقرر کر لینا مکروہ ہے۔

یہ دو باتیں آپس میں مختلف نہیں ہیں؛ بل کہ سنت ہونے کا حکم اصل اعتبار سے ہے اور کراہت کا حکم التزام و تخصیص کی وجہ سے ہے۔ علامہ ''ابن نجیم مصری'' رحمہ اللہ نے ''البحر الرائق'' میں اور ان ہی کے حوالے سے علامہ شامی رحمہ اللہ نے ''الدر المختار'' کے حاشیے میں لکھا ہے:

'' لكن في النهاية: أن التعيين على الدوام يفضي إلى اعتقاد بعض الناس أنه واجب، وهو لا يجوز، فلو قرأ بما ورد به الآثار أحياناً بلا مواظبة يكون حسناً.''(۱)

---

(۱) الشامي:۲/۴۴۱،البحر الرائق:۲/۶۷

(لیکن ''نہایہ'' (کتاب) میں لکھا ہے کہ دائمی طور پر ان سورتوں کا مقرر کر لینا بعض لوگوں کو اس بات کے اعتقاد کی طرف لے جاتا ہے کہ یہ واجب ہے اور یہ اعتقاد جائز نہیں، پس اگر احادیث میں وارد سورتوں کو بغیر پابندی کے کبھی کبھی پڑھ لے تو یہ بات مستحسن ہوگی۔)

اور کراہت کے قول پر علامہ ''ابن الہمام'' رحمہ اللہ نے ''فتح القدیر'' میں اور علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ نے ''البحر الرائق'' میں لکھا ہے کہ اگر مخصوص سورتوں کو اتباعِ سنت کے لیے پڑھے تو مکروہ نہیں؛ بہ شرطے کہ کبھی کبھی دوسری سورتیں بھی پڑھے؛ تاکہ ناواقف لوگ ان مخصوص سورتوں کے علاوہ دوسری سورتوں کے پڑھنے کو ناجائز نہ سمجھ لیں۔ (۱)

الغرض اس سے معلوم ہوا کہ فقہا نے ایک بات کو سنت بھی لکھا ہے اور اسی کو مکروہ بھی قرار دیا ہے؛ وجہ یہ ہے کہ وہ سنت ہے اپنے عموم کے لحاظ سے اور مکروہ ہے التزام و پابندی کے لحاظ سے؛ کیوں کہ اس سے ایک شرعی محذور لازم آتا ہے۔ اسی طرح یہاں نمازِ عید کے بعد مصافحے کے سنت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عید ہو یا غیر عید عمومی طور پر مصافحہ سنتِ ملاقات ہے؛ لیکن اگر اس کی تخصیص والتزام و پابندی کی جائے، تو وہ بھی مکروہ ہو جائے گا؛ لہٰذا ان فقہا نے سنت جو لکھا ہے، وہ اصل ملاقات کے مصافحے کو لکھا ہے، خواہ وہ کسی بھی وقت میں ہو، نہ کہ اس مروجہ مصافحے کو۔

اور یہاں یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے ان کی مراد ''سنتِ رسول یا سنتِ صحابہ'' نہیں ؛ بل کہ اس سے مراد ''سنت المسلمین'' ہو، کہ ان حضرات نے جب دیکھا کہ بعض علاقوں میں مسلمانوں میں اس کا رواج پایا جاتا ہے، تو انھوں نے اس کو سنت بہ معنی ''سنة المسلمین'' قرار دیا۔

---

(۱) فتح القدیر: ۱/ ۳۳۷، البحر الرائق: ۱/ ۳۶۳

اس کی نظیر بعض جگہ لفظِ سنت کا " سنة المشائخ" کے معنے میں وارد ہونا ہے جیسے بعض فقہا نے نماز کے لیے زبان سے نیت کے الفاظ کہنے کو "سنت" کہا ہے اوراس سے مراد " سنة المشائخ " ہے، کیوں کہ سنتِ رسول یا سنتِ صحابہ سے اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے، چناں چہ مشہور حنفی فقیہ علامہ شرنبلالی رَحِمَہُ اللّٰہُ اس موقع پر واردلفظ "سنت" کی مراد بتاتے ہوئے "مراقي الفلاح" میں لکھتے ہیں:

"فمن قال من مشائخنا:" إن التلفظ بالنية سنةٌ " لم يُرِدْ به سنةَ النبي-صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم - ؛ بل سنة بعض المشائخ." (۱)

(ہمارے مشائخ میں سے جنھوں نے نیت کے الفاظ کہنے کو سنت کہا ہے،اس سے انھوں نے سنتِ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم مراد نہیں لیا ہے؛ بل کہ بعض مشائخ کی سنت مراد لی ہے۔)

جس طرح "سنت" کا لفظ "سنت مشائخ" کے لیے استعمال ہوا ہے،اسی طرح غالبًا ان فقہا نے یہاں "سنت" کا لفظ "سنتِ اہلِ اسلام" کے معنے میں استعمال کیا ہے؛ ورنہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ سنتِ رسول وصحابہ نہیں ہے اوراس صورت میں اس کو مباح و جائز کا درجہ حاصل ہوگا۔لہٰذا جن فقہا کے کلام میں اس مصافحے کو سنت کہا گیا ہے،ان کے قول میں اوراس کو مباح قرار دینے والوں کے قول میں در حقیقت کوئی اختلاف نہیں ہے؛ بل کہ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے۔

اب دوقول پیشِ نظر رہ جاتے ہیں: ایک اس مروجہ مصافحے کے مباح ہونے کا اوردوسرا:اس کے مکروہ ہونے کا۔اوراگرغور وفکر سے کام لیا جائے؛ تو ان میں بھی فی الواقع کوئی اختلاف نہیں۔

---

(۱) مراقي الفلاح :۸۳

مصافحہ بعدِ عید کو بدعت کہنے والوں کی دلیل

بات یہ ہے کہ جن فقہانے لوگوں کے طرزِ عمل سے یہ محسوس کیا کہ وہ نمازوں کے بعد کے اس مصافحے کو نماز کی یا عید کی مستقل سنت اور اس موقعے کا ایک اہم و خاص ولازمی کام سمجھتے ہیں، انھوں نے اس کو بدعت ومکروہ قرار دے دیا؛ کیوں کہ کسی غیر ضروری کام کو ضروری قرار دے لینا اور مستقل سنت کا درجہ دے دینا دین میں ایک اضافہ ہے اور اس کو فقہا بدعت کہتے ہیں۔ شامی نے اسی لیے علما کے حوالے سے اس کو مکروہ و بدعت لکھا ہے کہ اس کو لوگ مستقل سنت جان لیں گے، ان کے یہ الفاظ ہم نے اوپر نقل کیے ہیں:

'' فالمواظبة عليها فيه توهم العوام بأنها سنة ''

(اس پر پابندی میں عوام کو اس خیال میں ڈالنا ہے کہ یہ سنت ہے۔)

نیز شامی ہی نے جوازِ مصافحہ بعدِ نماز کا قول نقل کرنے کے بعد لکھا ہے:

''لكن قد يُقَالُ: إن المواظبة عليها بعد الصلوات خاصةً قد يُؤدّي الجهلةَ إلى اعتقاد سُنيَّتِها في خصوص هذه المواضع ، و أن لها خصوصيةً زائدةً على غيرها مع أن ظاهر كلامهم أنه لم يفعلها أحد من السلف في هذه المواضع .'' (۱)

(لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ خاص طور پر نمازوں کے بعد اس مصافحے کی پابندی ناواقف عوام کو ان خاص مواقع میں اس کے سنت ہونے اور دوسرے مواقع کے مقابلے میں ان خاص مواقع پر اس کو ایک زائد

(۱) الشامي:۹/۵۴۷

خصوصیت حاصل ہونے کے اعتقاد تک پہنچاتا ہے؛ حالاں کہ ان کے
کلام سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سلف میں سے کسی نے ان خاص موقع پر
اس کو نہیں کیا۔)

حاصل یہ کہ اس مصافحے کا رواج اور اس کی پابندی سے عوام الناس یہ اعتقاد کر بیٹھیں گے کہ یہ سنت ہے اور یہ سمجھ لیں گے کہ اس کو ان مواقع میں ایک خصوصیت حاصل ہے، جو اور مواقع پر اس کو حاصل نہیں اور یہ ظاہر ہے کہ اس طرح کا عقیدہ خلافِ شرع ہونے کی وجہ سے اس کو مکروہ و بدعت کہا جاتا ہے۔

اور دوسری وجہ ان حضرات کے مطابق یہ معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اس مصافحے کو اس قدر اہمیت دیتے ہیں، جو سنت سے ثابت نہیں اور اس کے بالمقابل ملاقات کے وقت اس کو ترک کر دیتے ہیں، حالاں کہ ملاقات کے وقت مصافحہ اصل سنت ہے، تو گویا مصافحے کا جو اصل موقعہ شریعت نے تجویز کیا ہے، اس کو تو ترک کر دیتے ہیں اور جو موقعہ سنتِ رسول سے ثابت نہیں، اس پر اپنی جانب سے زور دیتے ہیں۔

اسی لیے ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا کہ لوگ بغیر مصافحہ ملتے ہیں اور بات چیت و مباحثے میں مشغول بھی ہو جاتے ہیں؛ مگر جوں ہی نماز سے فارغ ہوتے ہیں، ایک دوسرے سے مصافحہ شروع کر دیتے ہیں۔ (ان کی اصل عبارت اوپر گزری ہے)

الغرض جن حضرات نے اس کو بدعت و مکروہ کہا ہے، ان کے پیشِ نظر عوام الناس کا یہ حال و خیال ہے کہ وہ اس کو ضروری سمجھتے اور بالآخر بدعقیدگی میں مبتلا ہوتے ہیں؛ کیوں کہ یہ لازم ہے کہ دین کا ہر کام و عمل اس کی حدود میں رہے، جائز کو جائز سمجھا جائے، ناجائز کو ناجائز سمجھا جائے، سنت کو سنت اور واجب کو واجب باور کیا جائے۔ ایسا نہ ہو کہ واجب کو غیر واجب، سنت کو غیر سنت اور غیر سنت کو سنت اور غیر

واجب کو واجب سمجھ لیا جائے، یہ بات دین میں ایک نئی بات اور بدعت ہے۔

اور دوسری بات یہ ہے کہ مصافحے کے اصل موقعے کو ترک کر کے اپنی جانب سے ایک دوسرے موقعے کو اس کے لیے خاص کرتے اور اہمیت دیتے ہیں۔ اور یہ بھی صحیح نہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی طالب علم درس گاہ میں داخل ہوتے ہوئے، تو استاذ اور اپنے ساتھیوں کو سلام نہیں کرتا اور بغیر سلام درس گاہ میں داخل ہوتا ہے، حالاں کہ ابھی درس شروع بھی نہیں ہوا ہے؛ مگر جب استاذ سبق پڑھا کر فارغ ہوتا ہے، تو استاذ کو بھی اور اپنے ساتھیوں کو بھی سلام کرنے لگتا ہے۔ ظاہر ہے اس صورتِ حال پر اس کو یہی کہا جائے گا، کہ سلام کا جو اصل موقعہ تھا، اس میں تو سلام نہیں کیا اور سبق کے بعد سلام کرتا ہے، تو یہ بے موقع بات ہے، اگر چہ سلام خود کوئی بری چیز نہیں؛ مگر اس کو اصل موقعے کے بہ جائے بے موقعہ کرنا ایک خود ساختہ عمل ہے۔ یہ ہے ان حضرات کا نظریہ جو اس مصافحہ بعدِ نماز کو بدعت کہتے ہیں۔

اوقات و کیفیات کی من مانی تخصیص درست نہیں

اوپر جو عرض کیا گیا کہ عید کے مصافحے میں بے موقع اس کی تخصیص ہوتی ہے جو روا نہیں، اس کی وضاحت ضروری ہے، وہ یہ کہ اگر کوئی عبادت مشروع ہو؛ تو اس کو بھی اپنی جانب سے کسی وقت یا کیفیت کے ساتھ مخصوص کرنا شریعت میں جائز نہیں۔

علما نے اس اصولی مسئلے پر اپنی اصولی کتابوں میں بھی اور دیگر مواقع پر بھی بڑی تفصیل سے لکھا ہے، یہاں ایک دو حوالے پیش کر دینا کافی ہے۔ علامہ شاطبی رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "الاعتصام" میں لکھا ہے:

" فإذا ندب الشرع مثلاً إلى ذكر الله فالتزم قوم الاجتماعَ على لسان واحد و بصوت واحد أو في وقت

معلوم مخصوص عن سائر الأوقات لم يكن في ندب الشرع ما يدل على هذا التخصيص الملتزم بل فيه ما يدل على خلافه ، لأن التزام الأمور غير اللازمة شرعاً شأنها أن تفهم التشريع." (۱)

(جب شریعت کسی بات کی ترغیب دے اور کچھ لوگ اس کا التزام کریں کہ جمع ہو کر ایک زبان ہو کر یا ایک آواز ہو کر یا اوقات میں سے کسی خاص وقت میں ذکر کریں، تو شریعت کی وہ ترغیب اس تخصیص و التزام پر دلالت نہیں کرتی؛ بل کہ اس کے خلاف پر دلالت کرتی ہے؛ کیوں کہ جو امور شرعاً غیر لازم ہوں، ان کے التزام کی شان یہ ہے کہ اس کو شریعت سمجھ لیا جاتا ہے۔)

اور علامہ ابن نجیم مصری حنفی رحمہ اللہ " البحر الرائق " میں عید الفطر میں نمازِ عید سے پہلے "تکبیرات" کی بحث میں فرماتے ہیں:

"ولأن ذكر الله تعالى إذا قصد به التخصيص بوقتٍ دون وقتٍ أو بشيءٍ دون شيءٍ لم يكن مشروعاً حيث لم يرد به الشرعُ ؛ لأنه خلاف المشروع." (۲)

(اور اس لیے کہ ذکر اللہ کی تخصیص اگر کسی ایک وقت یا کسی چیز کے ساتھ کرنے کا قصد کر لیا جائے، تو وہ مشروع نہیں رہتا؛ کیوں کہ اس تخصیص کے ساتھ وہ شریعت میں وارد نہیں؛ اس لیے کہ وہ خلاف

(۱) الاعتصام:۱/۱۹۰

(۲) البحر الرائق:۲/۲۷۹

مشروع ہے۔)

اور علامہ ابن دقیق العید رحمہ اللہ اپنی کتاب "إحکام الأحکام" میں شیعوں کی من گھڑت عید "عید الغدیر" کے بدعت قرار دینے کے بعد لکھتے ہیں:

"و قریب من ذلک أن تکون العبادۃ من جهة الشرع مرتبةً علی وجهٍ مخصوصٍ ، فیرید بعض الناس أن یحدث فیها أمراً آخر لم یرد به الشرع زاعماً أنه یدرجه تحت عموم . فهذا لا یستقیم ؛ لأن الغالب علی العبادات التعبد و مأخذها التوقیف."(۱)

(اسی کے قریب یہ ہے کہ شریعت کی جانب سے کوئی عبادت ایک خاص طریقے پر ثابت ہو اور بعض لوگ اس میں ایک اور بات جو شرع میں وارد نہیں، اس خیال سے جاری کر دیں کہ یہ بھی اسی عبادت کے عموم کے تحت داخل ہے، تو یہ بات صحیح نہ ہوگی ؛ کیوں کہ عبادات میں تعبد غالب ہے اور اس کا ماخذ توقیف یعنی اللہ و رسول کا حکم ہے۔)

اس سے معلوم ہوا کہ اپنی جانب سے کسی مشروع کام میں بھی وقت یا کیفیت کی تخصیص کرنا درست نہیں۔

فقہا کے کلام میں " بعد الصلاۃ " کا معنے

یہاں یہ وضاحت بھی ضروری ہے کہ ان حضراتِ فقہا کے کلام میں بعض جگہ "عقب الصلاۃ" اور بعض جگہ " بعد الصلاۃ " (نماز کے بعد) کے الفاظ آئے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ خواہ فوری بعد یہ مصافحہ کیا جائے یا اس سے فارغ ہو کر دعاو

(۱) إحکام الأحکام:۱/۲۸۱

خطبے کے بعد کیا جائے ، دونوں کو یہ حکم شامل ہے اور اس سے مراد صرف یہ نہیں کہ سلام پھیرتے ہی فوراً مصافحہ کیا جائے ؛ تو وہ بدعت ہے، اور اگر دعا و خطبہ ہو جانے کے بعد مصافحہ کیا جائے ،تو وہ بدعت کی زد میں نہیں آتا۔ یہ تاویل ان حضرات کے کلام پر منطبق نہیں ہوتی ؛ کیوں کہ یہ حضرات ''مصافحہ بعدِ نماز'' کو جس دلیل سے مکروہ و بدعت کہتے ہیں بعینہ وہی دلیل ''بعدِ دعا و بعد خطبہ مصافحہ'' پر بھی منطبق ہوتی ہے اور دلیل وہی ہے، جو ابھی عرض کی گئی کہ ان مواقع پر خصوصیت کے ساتھ اس کا ثبوت نہیں۔لہٰذا جس طرح نماز کے بعد فوراً مصافحہ ثابت نہیں ،اسی طرح بعدِ دعا و بعدِ خطبہ بھی خصوصیت کے ساتھ ثابت نہیں ؛ لہٰذا فقہا کے کلام میں ''مصافحہ بعد ِ نماز'' اور ''مصافحہ بعدِ دعا و خطبہ'' دونوں کا ایک ہی حکم ہے اور '' عقب الصلاۃ'' (بعدِ نماز) کا اطلاق محاورے میں ''فوری نماز کے بعد'' اور ''دعا و خطبے کے بعد'' کی دونوں صورتوں پر ہوتا ہے۔ جیسے: احادیث میں فرض نماز کے بعد وارد اذکار کو ہمارے علمانے فرض وسنن ونوافل کے بعد پر محمول کیا ہے؛ کیوں کہ یہ بھی بعدِ فرض ہی شمار ہوتا ہے۔

اور اس کی ایک دلیل خود ان ہی فقہا کے کلام میں موجود ہے؛ کیوں کہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا، بعض حضرات نے اس مصافحے کو سنت کہا ہے اور اس جگہ بھی وہی لفظ ''عقب الصلاۃ ''استعمال ہوا ہے،جس کا مطلب یہ ہوا کہ ان فقہا کے نزدیک عید کی نماز کے فوری بعد، دعا سے پہلے مصافحہ سنت ہے، حال آں کہ یہ مطلب خود اس مصافحے کے قائلین کے نزدیک بھی درست نہیں ،معلوم ہوا کہ اس لفظ سے یہ مراد لینا، اس جگہ درست نہیں کہ نماز کے فوری بعد مصافحہ ہو اور عام محاورے میں مثلاً کہتے ہیں کہ ''نمازِ ظہر کے بعد کھانا کھایا''، اس میں نمازِ ظہر کے بعد کا مطلب ہرگز یہ نہیں

کہ نماز کے فوری بعد وہیں مصلے پر مصلیوں کے بیچ، دعا سے بھی پہلے کھالیا؛ بل کہ ظاہر ہے کہ یہ کھانا نماز سے واپس گھر آ کر کھایا گیا ہے۔ اس لیے فقہا کے کلام کا حاصل یہ ہے کہ نماز کے فوری بعد ہو یا بعدِ دعا و خطبہ ہو، ایک لازمی وضروری امر سمجھ کر مصافحہ کرنا بدعت ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ فوری بعد ہو، تو مکروہ ہے اور بعدِ دعا ہو؛ تو جائز، یہ تاویل منشائے کلام ہی کے خلاف ہے؛ کیوں کہ دلیل کی رو سے ان دو صورتوں میں بنیادی وجوہری کوئی فرق نہیں۔ (کما لا یخفی علی أولی النُهیٰ)

اس وضاحت سے معلوم ہو گیا کہ فقہا کے کلام کی مذکورہ تاویل صحیح نہیں اور جن حضرات نے فقہا کے کلام کا یہ معنی لیا ہے کہ ''مصافحہ خواہ نماز کے فوری بعد ہو یا دعا وخطبہ وغیرہ کے بعد ہو، ہر صورت میں مکروہ و بدعت ہے، جب کہ یہ ملاقات کا مصافحہ نہ ہو''، یہی بات صحیح ہے؛ لہٰذا یہ کہنا کہ ان حضرات نے فقہا کے کلام کو نہیں سمجھا، یہ بات صحیح نہیں؛ کیوں کہ فقہا کے کلام کا یہی معنی حضرت مولانا اشرف علی تھانوی ومولانا مفتی کفایت اللہ صاحب وغیرہ رحمہما اللہ بلند پایہ فقیہ حضرات نے بھی لیا ہے اور اسی پر اپنے فتاوی کی بنیاد رکھی ہے اور اسی لیے ان حضرات نے اپنے زمانے میں اس مروجہ مصافحہ کو جو دعا وخطبہ وغیرہ کے بعد ہی ہوا کرتا تھا، اس کو بدعت قرار دیا ہے؛ ورنہ نمازِ عید کے فوری بعد مصافحہ، جس کا کوئی رواج ان حضرات کے دور میں نہیں تھا، اس پر یہ حضرات کیوں بدعت ہونے کا حکم لگاتے؟ ظاہر ہے کہ جس کا کوئی رواج ہی نہ ہو، اس پر بدعت ہونے کا حکم لگانا خلاف عقل بات ہے۔

اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تو اس کی تصریح کر دی ہے کہ جمعہ وعیدین کے دن کی تخصیص بھی بے اصل ہے، ان کی یہ فارسی عبارت اوپر نقل کر دی گئی ہے کہ ''تخصیصِ آں بروز جمعہ وعیدین وبعد نماز پنج گانہ وتراویح بے اصل است''۔

اسی طرح مفتی عبد الرحیم لاجپوری رحمہ اللہ نے بھی اس کی تصریح کر دی ہے کہ خطبے کے بعد مصافحہ کیا جائے، تو بھی وہی حکم ہے، جیسا کہ ہم نے اوپر ان کا فتوی نقل کیا ہے اور اس سے بھی صریح ان کا ایک اور فتوی ہے، ان سے کسی سائل نے یہ معلوم کیا کہ آپ کا فتوی ہے کہ نماز جمعہ وعید کے بعد مصافحہ بدعت ہے، یہ بدعت ہونا عید گاہ یا مسجد تک محدود ہے یا عام ہے؟ اس کا جواب مفتی صاحب رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے:

''مسنون مصافحہ و معانقہ عید گاہ وغیرہ ہر جگہ جائز ہے، ممنوع نہیں اور جو مصافحہ و معانقہ بدعت کی حد میں آتا ہے، وہ ہر جگہ ممنوع ہے، عید گاہ و مسجد کی قید نہیں، عید کی مبارکبادی زبان سے دینا مستحب ہے، اس کے لیے مصافحہ شرط نہیں اور چوں کہ یہ روافض کا طریقہ ہے؛ اس لیے بھی احتراز کرنا چاہیے، لوگ ساتھ ساتھ نماز پڑھتے ہیں اور سلام کے بعد ساتھ ساتھ جاتے ہیں، ساتھ کھڑے ہوتے ہیں اور خطبہ سنتے ہیں اور جب کھڑے ہوتے ہیں؛ تو مصافحہ و معانقہ کرتے ہیں، یہ کونسا موقع ہے؟''(۱)

اس سے معلوم ہوا کہ اصل مقصد یہ ہے کہ مصافحے کو عید کی تخصیص کے ساتھ التزام و اہتمام سے جو کیا جاتا ہے، وہ مصافحہ خواہ نماز کے فوری بعد دعا سے پہلے ہو یا بعدِ دعا و خطبہ ہو یا اس کے بھی بعد عید گاہ سے باہر جا کر ہو، بہ ہر حال یہ بدعت ہے۔ ہاں اگر مصافحہ کا مقصد ملاقات کی سنت ادا کرنا ہو، تو اس کی ہر جگہ اجازت ہے، خواہ عید گاہ ہی میں کیوں نہ ہو۔

---

(۱) فتاوی رحیمیہ: ۱۰/ ۱۲۶

مروجہ مصافحے کو مباح کہنے والوں کی دلیل

اور جو حضرات اس کو مباح و جائز قرار دیتے ہیں ان کے پیش نظر صرف یہ بات ہے کہ مصافحہ تو ایک نیک عمل ہے اور لوگوں کا مذکورہ حال و خیال ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ غالبًا ان حضرات کے زمانے یا علاقے میں یہ رواج اس حد تک نہیں تھا کہ وہ ایک مستقل سنت اور ایک لازمی عمل کی حیثیت اختیار کر لیتا؛ بل کہ سادگی کے ساتھ بلا التزام و اہتمام کر لیا جاتا تھا، نہ اس کو کوئی تقرب و عبادت کا درجہ دیا جاتا تھا، نہ لازم و ضروری سمجھا جاتا تھا۔

اس کی مثال میں شادی کے موقعے پر یا غمی کے موقعے پر مصافحے و معانقے کے رواج کو پیش کیا جا سکتا ہے، جسے نہ کوئی لازم سمجھتا ہے، نہ کوئی سنت و عبادت، اسی طرح مدارس کے طلبا سند یا انعام لیتے ہوئے اساتذہ و بزرگوں سے مصافحہ کیا کرتے ہیں اور یہاں بھی اس کو نہ عبادت سمجھتے ہیں، نہ سنت و واجب۔ اسی لیے اس مصافحے پر نکیر کی جاتی ہے، نہ بدعت کا حکم لگایا جاتا ہے۔ غالبًا وہاں یہی صورتِ حال عید کے مصافحے میں تھی؛ لہٰذا یہ فرمایا گیا کہ یہ کوئی قابلِ نکیر بات نہیں ہے؛ بل کہ سنت یعنی ''سنت المسلمین'' ہے؛ لہٰذا اس کو اختیار کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ اور مسلمانوں میں کوئی بات اس طرح رائج ہو جائے کہ اس سے کوئی محذورِ شرعی لازم نہ آئے، تو اس کے جائز و مباح ہونے میں کیا اشکال و شبہ ہو سکتا ہے؟

حاصلِ بحث

خلاصہ یہ کہ جن حضرات نے اس مصافحہ بعد العید سے منع کیا، انھوں نے اس کو لازم و سنت کی حیثیت دینے یا دے دیے جانے کے اندیشے کی وجہ سے منع کیا ہے اور جن حضرات نے اجازت دی ہے، انھوں نے بغیر التزام و اہتمام یا سنت و لازم سمجھے

بغیر کرنے کی صورت مراد لی ہے؛ لہٰذا ان حضرات میں کوئی حقیقی اختلاف نہیں؛ بل کہ صرف صورۃً اختلاف ہے۔ اگر پہلے طبقے کے سامنے یہ صورت پیش کی جاتی کہ لوگ اس کو سنتِ لازمہ نہیں سمجھتے، تو وہ بھی اس کو ضرور جائز قرار دیتے اور دوسرے طبقے کے سامنے یہ صورت رکھی جاتی کہ لوگ اس کو سنتِ لازمہ ومستقلہ سمجھتے ہیں؛ تو وہ بھی ضرور اس کو قابلِ نکیر قرار دیتے۔

اس تحقیق سے معلوم ہوا کہ فقہا کے کلام میں فی الواقع کوئی تضاد و اختلاف نہیں ہے؛ لہٰذا ہمیں اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ فقہا نے جو محذور اس کو بدعت قرار دینے کا بیان کیا ہے، وہ یہاں ہمارے علاقوں کے رواج میں پایا جاتا ہے یا نہیں؟ اگر پایا جاتا ہو؛ تو ہمیں ماننا چاہیے کہ یہ رواج حسب فقہائے کرام قابلِ نکیر و قابلِ ترک ہے اور امت کو صحیح صورتِ حال سے واقف کرانے کے لیے لوگوں کو یہ بتانا چاہیے کہ غیر سنت کو سنت قرار دینا اور اس پر اس قدر مضبوطی کے ساتھ عمل کرنا، جیسے کسی سنتِ ثابتہ پر بھی نہیں کرتے؛ بل کہ ثابت شدہ موقعے پر تو نہ کرنا اور اپنے تجویز کردہ موقعے پر اصرار و اہتمام و التزام کرنا، صحیح نہیں۔ اور اگر یہ بات کھل جائے کہ ہمارے علاقوں میں مصافحہ بعد العید میں وہ محذور موجود نہیں ہے، جو فقہا نے بیان کیا ہے، تو پھر سب کو یہ ماننا لازم ہے کہ یہ مصافحہ بعد العید صحیح ہے، جائز و درست ہے؛ کیوں کہ کوئی شرعی خرابی پائی نہیں جاتی۔

عامۃ الناس کے حال کی جانچ

البتہ اس بات کے طے کرنے میں ہوسکتا ہے کہ موجودہ و معاصر علما و مفتیانِ کرام کے نظریات میں اختلاف واقع ہو، کسی عالم و مفتی کو عوام الناس کی حالت اور ان کے طرزِ عمل سے یہ معلوم ہوتا ہو کہ لوگ بعد العید اس مصافحے کو سنتِ مستقلہ و

لازمہ سمجھتے اور دین کی حیثیت سے اس کو لازم خیال کرتے ہیں؛ اس لیے وہ اس کو بدعت کہتا ہو، جیسا کہ فقہا کے ایک طبقے نے اسی بات کو بنیاد بنا کر اس کو بدعت و مکروہ قرار دیا ہے اور کسی دوسرے عالم کو اس کے برخلاف یہ سمجھ میں آئے کہ لوگ اس کو نہ سنتِ مستقلہ سمجھتے ہیں، نہ دین کے لحاظ سے لازم و ضروری قرار دیتے ہیں؛ بل کہ محض اپنے خوشی و مسرت کے جذبات کا اظہار کرنے کے لیے مصافحہ کرتے ہیں اور اس کو دنیا کے بہت سے مباح و جائز کاموں کی طرح اختیار کیا جاتا ہے؛ لہٰذا اس میں نہ دین میں کوئی اضافہ ہے اور نہ کوئی تغیر و تبدیلی ہے۔ اور اس وجہ سے وہ اس کو بعض دوسرے فقہا کی طرح جائز و مباح قرار دیتا ہو۔ لہٰذا دونوں نظریات کی گنجائش ہے اور یہ لوگوں کے طرزِ عمل کی بنیاد پر قائم کیے جاتے ہیں۔

حضرت امیر شریعت کی رائے گرامی

امیر شریعت حضرت اقدس مولانا مفتی اشرف علی صاحب دامت برکاتہم کے جو بیانات ابھی اخبارات میں شائع ہوئے ہیں، ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ حضرت والا کی نظر میں یہاں کے لوگوں کا طرزِ عمل پہلی صورت کا نہیں؛ بل کہ دوسری صورت کا ہے، کہ وہ صرف ایک خوشی و مسرت کا اظہار کرنے کے لیے مصافحہ کرتے ہیں، اس کو دین کے لحاظ سے اختیار نہیں کرتے اور نہ ضروری و واجب یا سنتِ مستقلہ سمجھتے ہیں۔ بعض اور علما بھی اسی طرح کی بات فرماتے ہیں۔

عرب کے معروف عالم علامہ ابن العثیمین نے بھی اپنے فتاوی میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ چناں چہ ایک صاحب نے ان سے سوال کیا کہ ''عید کی نماز کے بعد مصافحہ و معانقہ اور مبارکبادی دینے کا کیا حکم ہے؟ آپ نے اس کا جواب یہ دیا:

'' هذه الأشياء لابأس بها، لأن الناس لايتخذونها على

سبيل التعبد والتقرب إلى اللّٰه عزّوجلّ، و إنما يتخذونها على سبيل العادة والإكرام والاحترام ، و ما دامت عادةً لم يرد الشرع بالنهي عنها ؛ فإن الأصل فيها الإباحة." (۱)

(ان امور میں کوئی حرج نہیں؛ کیوں کہ لوگ ان کو عبادت و تقرب الی اللہ کے طور پر نہیں اختیار کرتے؛ بل کہ عادت اور ایک دوسرے کے اکرام و احترام میں کرتے ہیں اور جب تک کوئی چیز عادت رہے، شریعت اس کو منع نہیں کرتی؛ کیوں کہ اشیا میں اصل مباح و جائز ہونا ہے۔)

لہذا حضرت امیر شریعت کی بات اس اعتبار سے لائق قبول ہے اور یہ خوشی و مسرت کے موقعے پر مصافحہ -- جیسا کہ پہلے بھی عرض کر چکا ہوں -- ایسا ہی ہوگا جیسے مدارس میں طلبہ انعام پاتے ہیں یا سند لیتے ہیں، تو اپنے اساتذہ اور بزرگوں سے مصافحہ کرتے ہیں، جو بلا نکیر رائج ہے، اسی طرح نکاح کے بعد نوشے سے لوگ مصافحہ کیا کرتے ہیں، یہ محض اظہار مسرت کے لیے ہوتا ہے۔

نا قابل فراموش دوسرا پہلو

لیکن یہاں ایک بات فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ جو حضراتِ علما اس کے خلاف عوام میں یہ محسوس کرتے ہیں، کہ وہ حدود سے تجاوز کر رہے ہیں اور اس مصافحے پر اصرارِ شدید اور اس کے ترک پر انکارِ عنید ہوتا ہے اور اس کو بھی ایک عبادت کی حیثیت دے دی گئی ہے، تو وہ بھی اس رائے کے قائم کرنے میں حق بہ جانب ہیں، کہ اس صورت میں یہ بدعت و مکروہ ہے۔ اور اسی لیے ہمارے اکابر علما جن کی نظر میں

(۱) فتاوی الشیخ ابن العثیمین:۱۶/ ۱۲۸

وسعت وگیرائی بھی تھی اور دقت وگہرائی بھی اور امت کے حالات کا اندازہ کرنے کی خوب مہارت بھی پائی تھی، انھوں نے اس رواج پر نکیر کی ہے اور اس کو بدعت قرار دیا ہے، جیسا کہ اوپر بعض اکابر کے فتاوی اس سلسلے میں نقل کیے گئے ہیں۔

اور احقر یہ محسوس کرتا ہے کہ ہمارے علاقوں کے اندر عوام الناس میں دونوں قسم کے رجحانات پائے جاتے ہیں، کچھ معتدل مزاج وطبیعت کے لوگ اس کو اپنے حدود میں رکھتے ہوئے صرف ایک اظہارِ مسرت کا سامان سمجھتے اور اس کو اپناتے ہیں؛ لیکن ایک بڑا طبقہ ہر بات میں حدود سے تجاوز کا عادی اور انتہا پسندانہ مزاج کا حامل بھی ہے، جو اس معاملے میں بھی بے اعتدالی کا شکار ہو جاتا ہے، جیسا کہ عوام الناس کے حالات سے واضح ہے۔ چناں چہ بسا اوقات مشاہدہ ہوتا ہے کہ لوگ نہ سلام کرتے ہیں، نہ کوئی بات چیت؛ بل کہ چلتے چلتے سامنے آنے والے سے صرف اور صرف مصافحہ کر لیتے ہیں، حتی کہ تہنیت ومبارکبادی کا بھی ایک جملہ نہیں کہتے، گویا اس وقت کا صرف یہی ایک اہم ترین کام ہے اور اس کو کسی بھی صورت میں نمٹا دینا چاہتے ہیں؛ بل کہ اس کے ساتھ مسئلے میں اس وقت اور نزاکت پیدا ہو جاتی ہے، جب کہ علما کی جانب سے بھی اس کی ترغیب وتحریص کا سلسلہ جاری ہو۔ ابھی اسی عید کے موقعے پر بنگلور کے متعدد عیدگاہوں میں اس مصافحے کی اہمیت پر بیانات دیے گئے اور ایک مشہور عیدگاہ ''عیدگاہ قدوس صاحب'' میں خطیب نے اپنے بیان میں کہا کہ عید کے بعد مصافحہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تمام صحابہ کا معمول تھا۔ اب غور کیجیے کہ جب خطیب اس من گھڑت بات سے لوگوں میں اس رواج کی سنیت کا عقیدہ پیدا کرنا چاہتا ہے، تو خود اس کی نظر میں اس کی کس قدر اہمیت ہوگی اور جب علما کا یہ حال ہو، تو عوام کا کیا حال ہو سکتا ہے، اس کا اندازہ ہر

صاحبِ بصیرت آدمی لگا سکتا ہے۔

اور عوام الناس کی اس حالت و کیفیت کا اندازہ بعض بڑے بڑے صاحبِ بصیرت حضرات نے لگانے کے بعد اپنے فتاوی میں اس عمل کو بدعت و مکروہ قرار دیا ہے؛ لہٰذا اس کے پیشِ نظر علامہ شامی و ملا علی قاری، علامہ ابن تیمیہ، شیخ عبد الحق دہلوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا تھانوی، مولانا مفتی کفایت اللہ دہلوی، مولانا مفتی محمود حسن گنگوہی، مفتی نظام الدین صاحب رحمہم اللہ وغیرہم (جن کے فتاوی اوپر نقل کیے گئے ہیں) کا نقطۂ نظر اختیار کرتے ہوئے جن حضراتِ علما نے اس کو بدعت کہا ہے، وہ بھی ضرور اپنے قول کے لیے وجہِ جواز اور دلیل رکھتے ہیں۔

نہ بے دلیل، نہ باعثِ انتشار

لہٰذا ان حضرات کی اس "مروجہ مصافحہ" پر نکیر کو بے دلیل کہنا اور عوام میں انتشار کا سبب قرار دینا صحیح نہیں اور فقہی و علمی دنیا میں ایک قابل حیرت بات ہے؛ کیوں کہ علم کے میدان میں اس طرح کے نظریاتی اختلافات رونما ہوا ہی کرتے ہیں، اگر اس میں ایک نظریہ کا حامل دوسرے نظریئے کے حامل کو الزام دے کہ یہ انتشار و اختلاف و نزاع پیدا کر رہا ہے، جب کہ اس کے پاس معقول دلیل، حدیث یا فقہ کی روشنی میں موجود بھی ہو؛ تو علم کی راہیں مسدود ہو جائیں گی اور علما جمود و تعطل کا شکار ہو کر رہ جائیں گے۔ کیا فقہی کتابوں میں بے شمار مسائل میں علما کا اختلاف موجود نہیں ہے؟ کیا یہ باعثِ انتشار ہے؟ اگر نہیں تو یہ مسئلہ بھی ان ہی کتب سے منقول ہوا ہے اور اس مصافحے کے بدعت ہونے کا حکم بھی ان ہی کتب میں موجود ہے۔ اس کو باعث انتشار و افتراق اور باعثِ فساد و نزاع قرار دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟ کیا مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا عبد الحی لکھنوی، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی کفایت

اللہ صاحب ومولانا مفتی محمود حسن گنگوہی رحمہم اللہ وغیرہم اکابر نے اس مصافحے کے بدعت ہونے کا حکم وفتوی دے کر امت میں انتشار وفساد پھیلایا تھا ؟ کیا ان کا فتوی بے دلیل تھا؟ یا فقہا کے کلام کو ان حضرات نے سمجھا نہیں تھا اور کیا یہ حضرات کم علم وبد فہم تھے؟ لہٰذا علمی دیانت وامانت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر مختلف نظریات دلائل کے ساتھ موجود ہوں، تو سب کا احترام کیا جائے اور اگر کسی کے قول ونظریئے کو قبول نہ کیا جائے ؛ تو کم از کم اسے اپنی بات کہنے کا حق تو دیا جائے۔

مسئلے میں راہ اعتدال

جب یہ واضح ہوگیا کہ دونوں طرف دلائل موجود اور اس میں اختلاف رائے کی گنجائش بھی ہے اور خود ہمارے فقہا کے کلام میں دونوں قسم کے اقوال بھی پائے جاتے ہیں اور ہر قول کا منشا و مقصد اور ہر بات کا محل ومحمل بھی ان کے کلام سے معلوم ہوتا ہے؛ تو راقم سطور کے نزدیک انتشار واختلاف سے امت کو بچانے اور اتحاد قائم کرنے کی ایک ہی صورت ہوسکتی ہے کہ دونوں قسم کے نظریات کے حامل علما، اس کی کوشش کریں کہ امت کو فقہا کی اس سلسلے میں لکھی ہوئی تمام باتوں سے آگاہ کریں، ان کو یہ بتائیں کہ مصافحے کا اصل وقت ملاقات یا رخصت ہے، عید یا نماز سے اس کا تعلق نہیں ؛ لہٰذا ملاقات کے وقت مصافحے کا اہتمام کیا جائے ، تاہم اگر عید وغیرہ کے موقعے پر محض اظہارِ مسرت کے لیے کیا جائے ، سنت یا واجب وضروری نہ سمجھا جائے، تو اس کی گنجائش ہے؛ لیکن اگر عید کے موقعے پر مصافحے کو سنیت وعبادت کا درجہ دیا جائے گا، تو وہ حسبِ فقہا بدعت ہو جاتا ہے؛ لہٰذا جو حضرات اس کے بدعت ہونے کا فتوی دیتے ہیں یا بتاتے ہیں، ان کے کلام کا یہی حاصل ہے : لہٰذا اس کو عقیدۃً یا عملاً ضروری نہ قرار دیا جائے ، اس کو اس وقت کی خاص سنت نہ سمجھا جائے

اور دوسری جانب یہ کیا جائے کہ خود بھی اس پر ایسا زور اور اس کی ایسی ترغیب نہ دی جائے، جس سے اس کے سنت وضروری ہونے کا خیال عوام میں پیدا ہو، جیسا کہ آج کل علما کا ایک طبقہ اسے مستقل سنت قرار دینے اور عوام کو اس کی ترغیب وتحریص میں مشغول نظر آتا ہے۔

حضرت مولانا مفتی تقی عثمانی دامت برکاتہم نے اپنے فتوے میں جو کہا:

''اس مصافحے کو سنت سمجھ کر کرے تو بدعت ہے۔ ہمارے زمانے میں چوں کہ فرض نمازوں کے بعد مصافحہ اور عیدین کے بعد معانقے کو سنت سمجھا جانے لگا ہے، حال آں کہ یہ آں حضرت صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم سے ثابت نہیں؛ اس لیے علما نے اس کو بدعت قرار دیا ہے اور اس سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے؛ لیکن کہیں اعتقادِ سنت کی یہ علت نہ ہو، تو مباح ہے۔''

ہمیں اسی طرح کی معتدل بات کہنا مناسب ہے۔

اور ملا علی قاری رَحِمَهُ اللهُ نے بڑی عمدہ بات فرمائی ہے، آپ نے نمازوں کے بعد کے اس مروجہ مصافحہ کو بدعتِ مذمومہ قرار دینے کے بعد فرمایا ہے:

'' ومع هذا إذا مد مسلم يده للمصافحة فلا ينبغي الإعراض عنه بجذب اليد لما يترتب عليه من الأذى يزيد على مراعاة الأدب. فحاصله أن الابتداء بالمصافحة حينئذ على الوجه المشروح مكروه لا المجابرة وإن كان قد يقال : فيه نوع معاونة على البدعة. ''(۱)

(۱) مرقاة المفاتيح : ۷۴/۹

(اس کے بدعتِ مکروہہ ہونے باوجود اگر کوئی مسلمان اپنا ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھائے، تو اس سے ہاتھ کھینچتے ہوئے روگردانی مناسب نہیں؛ کیوں کہ اس پر ادب کی رعایت کے مقابلے میں زیادہ اذیت مرتب ہوتی ہے، پس حاصل یہ ہے کہ مذکورہ طریقے پر مصافحہ کی ابتدا کرنا تو مکروہ ہے، نہ کہ دوسرے کی دل داری میں، اگر چہ کہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں بدعت کی ایک طور پر ہمت افزائی ہے۔)

اس طرح فقہا کے کلام کا احترام بھی باقی رہے گا اور اس کے مطابق عمل کی صحیح شکلیں بھی نکل آئیں گی اور ایک دوسرے کی تائید بھی ہوگی اور امت انتشار سے بچ بھی جائے گی۔ھذا ما عندي ، واللّٰه أعلم بالصواب .

العبد:

محمد شعیب اللہ خان

۲/شوال/۱۴۳۱ھ

اسلام اور نفقۂ مطلقہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اسلام اور نفقۂ مطلقہ

تمہید

یہ بات اسلامی قانون سے واقف کار کسی بھی شخص سے پوشیدہ نہیں ہے کہ اسلام میں مطلقہ عورتوں کا نان ونفقہ جو مرد پر لازم کیا گیا ہے، وہ صرف عدت تک محدود ہے، عدت کے بعد نفقہ دینا مرد پر لازم نہیں، اس میں کسی دور میں دو رائیں نہیں پائی گئیں؛ بل کہ یہ مسئلہ مسلمانوں کا ایک متفق علیہ مسئلہ ہے، جس پر اسلام کی پوری چودہ سو سالہ تاریخ گواہ ہے اور ہر دور اور ہر صدی کے علماءِ شریعت یہی فتویٰ اور فیصلہ دیتے رہے ہیں۔

چودہ سو سال کے بعد اب سے پندرہ ماہ پیشتر اس متفقہ قانونِ اسلامی میں سب سے پہلے سپریم کورٹ نے تشکیک کی راہ اختیار کی اور پھر اس کی تائید میں ایسے لوگوں نے اسلامی قانون میں مداخلت کی اور کر رہے ہیں جو قرآن وحدیث کی تعلیمات سے یکسر نابلد اور شرعی علوم سے بالکل ناواقف ہیں اور غیر اسلامی علوم اور غیر تہذیب وتمدن سے مغلوب ومتأثر ہیں۔

سپریم کورٹ کا اور ان لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کا نان ونفقہ مرد کے ذمہ اس وقت تک لازم ہے، جب تک ان عورتوں کا دوسرا نکاح نہ ہوجائے۔ ان لوگوں نے قرآن کی اس آیت سے استدلال کیا ہے:

﴿وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ﴾

(البقرۃ : ۲۴۱)

(اور مطلقہ عورتوں کے لیے قاعدہ کے موافق کچھ فائدہ پہنچانا ہے، یہ بات پرہیز گار لوگوں پر لازم کی گئی ہے۔)

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس آیت میں مطلقہ عورتوں کو اچھے طریقے پر نفقہ دینے کا ذکر کیا گیا ہے؛ لہٰذا مطلقہ عورت کو تا نکاحِ ثانی یا تا حیات نفقہ دینا چاہیے، تا کہ وہ نکاحِ ثانی تک اچھے طریقے سے گذارا کر سکے اور اگر نکاح نہ ہوا تو تا حیات آرام سے رہ سکے۔ اسی طرح ان لوگوں نے بعض دوسری آیات کا حوالہ بھی دیا ہے اور ان لوگوں نے اس بات کا بھی برملا اعلان کیا ہے کہ مطلقہ کے نفقہ کو عدت تک محدود کرنا قرآنی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا۔

ایسے لوگوں کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ قرآنِ مجید حدِّ اعجاز کو پہنچا ہوا ایک ایسا متن ہے، جس کو سمجھنے کے لیے بہت سارے علوم میں مہارت اور کمال شرط ہے، یہاں نہ محض عربی زبان دانی کافی ہوسکتی ہے اور نہ تراجم کا دیکھ لینا کشفِ حقائق کے لیے مفید ہوسکتا ہے ؛بل کہ اس کے لیے عربی زبان کے علوم: نحو، صرف، معانی، بیان اور بدیع کے علاوہ حدیث، اصولِ حدیث، اصولِ فقہ، اصولِ تفسیر اور عقائد کا بھی وسیع و عمیق علم ضروری اور شرط ہے، یا نہیں تو پھر ان علوم میں ماہر و کامل اشخاص کی پیروی لازم ہے۔

ہم اس مختصر تحریر میں اسی آیت کی تفسیر نقل کرتے ہوئے سپریم کورٹ کے مخترعہ قانون کا جائزہ لینا چاہتے ہیں، تا کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اس آیت سے اس مخترعہ قانون کا کوئی تعلق نہیں اور یہ قانون، قرآن و حدیث اور اسلام کے قانون کے بالکل خلاف ہے۔

زیر بحث آیت کی تفسیر

سپریم کورٹ کے جج صاحبان نے مطلقہ عورتوں کے لیے تا نکاح ثانی اور اگر نکاح نہ ہوا تو تا حیات نفقہ دینے کے سلسلے میں اپنے استدلال کی بنیاد سورۂ البقرۃ کی اس آیت کریمہ پر رکھی ہے:

﴿ وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ﴾

(البقرۃ :۲۴۱)

(اور مطلقہ عورتوں کے لیے قاعدہ کے موافق کچھ فائدہ پہنچانا ہے، یہ بات پرہیز گار لوگوں پر لازم کی گئی ہے۔)

اس آیتِ شریفہ میں مطلقہ عورتوں کے لیے ''متاع'' کا ثبوت ہے، یہاں یہ دیکھنا ہے کہ لفظِ ''متاع'' کے کیا معنے ہیں اور اس سے یہاں کیا مراد ہے؟ پھر اس مخترعہ قانون کا اس سے ثبوت ہوتا ہے یا نہیں؟ یہ دیکھنا ہوگا۔

لفظِ متاع کی تحقیق وتفسیر

لغت میں لفظِ ''متاع'' ایسی اشیاء کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کا نفع وقتی اور ہنگامی ہو، پائیدار اور دیر تک رہنے والا نہ ہو؛ اسی لیے قرآن نے دنیاوی ساز و سامان کو متاع کے لفظ سے تعبیر کیا ہے کہ دنیوی مال و اسباب نہ پائدار ہوتے ہیں اور نہ ہی دیر تک قائم رہتے ہیں اور نکاحِ متعہ بھی اسی سے لیا گیا ہے، کیوں کہ متعہ میں عورت سے کچھ دیر تک کے لیے تعلق قائم کر کے فائدہ اٹھایا جاتا ہے، اس میں عورت سے مستقل اور دائمی طور پر استمتاع نہیں ہوتا۔ الغرض متعہ اور متاع ''النفع الحاضر'' یعنی وقتی نفع اور فائدہ کو کہا جاتا ہے۔

اس متاع سے کیا مراد ہے؟ اس بارے میں ہمیں علمائے مفسرین کے تین

اقوال ملتے ہیں اور لفظ ''متاع'' میں تینوں اقوال کی گنجائش ہے:

(۱) اس سے مراد زوجۂ مطلقہ کی عدت کا نفقہ ہے اور یہ واجب ہے، اسی قول کو صاحبِ مدارک نے اختیار فرمایا ہے اور صاحبِ تفسیر مظہری نے بھی اس قول کا ذکر کیا ہے۔ (۱)

(۲) اکثر مفسرین نے اس قول کو اختیار کیا کہ اس سے مراد متعۂ طلاق ہے جو نفقۂ عدت کے علاوہ مطلقہ کو بصورتِ نقد یا اناج یا کپڑے کا جوڑا دیا جائے گا اور یہ مستحب ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعہ کی تفسیر میں منقول ہے کہ تین کپڑے ہیں، ایک کرتہ، ایک دوپٹہ اور ایک چادر۔ (۲)

(۳) اس سے مراد مطلق متعہ ہے جو واجب و مستحب دونوں کو شامل ہے؛ لہٰذا اس میں مطلقہ کا مہر اور متعۂ طلاق دونوں شامل ہیں، اور پھر مہر خواہ پورا ہو یا نصف ہو یا مہرِ مثل ہو سب اس میں داخل ہیں۔ (۳)

پہلے دو قولوں پر لفظِ متاع کی مراد خاص ہے اور آخری قول پر اس میں عموم ہے اور دوسرے اور تیسرے قول کی بنا پر اس آیت کا نفقۂ مطلقہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ہاں البتہ پہلے قول پر اس کا نفقۂ مطلقہ سے تعلق ہے؛ مگر ہم چوں کہ اس آیت کی تفسیر لکھ رہے ہیں؛ اس لیے تینوں قولوں کی تفصیل کریں گے۔

قولِ اول کی تفصیل:

پہلے قول کی بنا پر چوں کہ یہ آیت نفقۂ مطلقہ سے متعلق ہے؛ اس لیے اس میں پہلی

---

(۱) مدارک: ۱/۱۱۸، بیضاوی: ۱/۵۴۰، تفسیر ابوالسعود: ۱/۲۳۷، روح المعاني: ۲/۱۶۰، صاحبِ تفسیر مظهري: ۱/۳۴۱

(۲) تفسیر قرطبي :۳/۲۰۱،تفسیر الطبري:۲/۵۴۲،فتح القدیر : ۱/۳۹۳

(۳) بیضاوي: ۱/۵۴۰،تفسیر ابوالسعود: ۱/۲۳۷،روح المعاني:۲/۱۶۰،کشاف: ۱/۱۴۴

بحث تو یہ اٹھتی ہے کہ مطلقہ عورت کو نفقہ کب تک دیا جائے گا؟ دوسری بحث یہ پیدا ہوتی ہے کہ کس قسم کی مطلقہ کے لیے نفقہ دیا جائے گا؟ ہر قسم کی مطلقہ اس کی حقدار ہے یا کوئی خاص قسم؟

مطلقہ کو نفقہ کب تک؟

اب لیجئے پہلی بحث کہ نفقۂ مطلقہ مرد پر کب تک لازم ہے؟ اس سوال کے جواب کے لیے اس پر غور کیجئے کہ قرآن نے ہمیں اس سلسلے میں کیا ہدایت کی ہے؟ قرآن نے اس جگہ مطلقہ کو ''متاع'' کی حق دار قرار دیتے ہوئے ''بالمعروف'' کی قید لگائی ہے جو عرف سے ماخوذ و مشتق ہے، عرف کے معنی جاننے اور پہچاننے کے ہیں، اسی سے معروف اسم مفعول کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں ''جانا پہچانا ہوا'' اور یہ لفظِ ''معروف'' دراصل موصوفِ محذوف کی صفت واقع ہوا ہے اور وہ موصوف ''الطریق'' یا اس جیسا کوئی لفظ ہوگا، پس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کے لیے جانے پہچانے ہوئے طریقے سے نفقہ دینا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ معروف سے مراد شرع میں جانا پہچانا ہوا طریقہ ہے یا مسلمانوں میں معروف طریقہ ہے۔ لہٰذا آیت نے یہ بتلا دیا کہ نفقۂ مطلقہ شرعی طریقے پر اور مسلمانوں کے مابین معروف قاعدہ سے دیا جائے گا، نہ کہ غیر اسلامی قانون و قاعدے کے مطابق۔ اب یہ دیکھنا ہے کہ شریعت میں مطلقہ عورتوں کے لیے نفقہ دینے کا طریقہ اور اصول کیا ہے؟

واضح رہے کہ شرعی احکام کے مآخذ تین ہیں: اول قرآنِ مجید، دوسرے حدیثِ شریف، تیسرے اجماعِ امت اور ان تینوں کے بعد چوتھا ماخذ قیاسِ صحیح ہے، جو ان تینوں ہی سے مستنبط ہوگا؛ لہٰذا نفقۂ مطلقہ کا شرعی طریقہ کار اور اصول بھی ان چار اصول میں سے کسی سے بھی ثابت کیا جا سکتا ہے۔

اصل اول: قرآن

اول قرآنِ پاک کی طرف آیئے، سورۂ طلاق میں ہمیں یہ آیت نظر آتی ہے:

﴿ وَاِن كُنَّ اُولاتِ حَمْلٍ فَاَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ ﴾ (الطلاق: ٦)

(اور اگر وہ (مطلقہ عورتیں) حمل والی ہوں تو تم ان کو نفقہ دو یہاں تک کہ وہ اپنا حمل وضع کرلیں)

اس آیت میں مردوں کو حکم دیا گیا ہے کہ ان حاملہ عورتوں کو نفقہ دو، جو طلاق یافتہ ہیں اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا نفقہ مرد پر وضعِ حمل تک ہے، وضعِ حمل کے بعد نہیں؛ کیوں کہ حتی انتہاءِ غایت کے لیے آتا ہے، اور اس آیت میں یا کسی دوسری آیت میں غیر حاملہ عورتوں کے نفقہ کی مدت نہیں بتائی گئی ہے؛ لیکن اس آیت میں واضح اشارہ موجود ہے، جس سے غیر حاملہ مطلقہ کے نفقہ کی مدت معلوم ہوسکتی ہے۔ وہ یہ کہ اس آیت میں حاملہ عورتوں کا نفقہ تا وضعِ حمل مقرر فرمایا گیا ہے اور قرآن ہی نے حاملہ عورتوں کی عدت وضعِ حمل تک بتائی ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ حاملہ عورتوں کا نفقہ ان کی عدت تک مرد پر لازم ہے، اس سے اس طرف اشارہ ہوا کہ مطلقہ کا نفقہ عدت تک ہوا کرتا ہے، ورنہ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ حاملہ کو تو اس کی عدت تک ہی نفقہ دیا جائے اور غیر حاملہ کو غیر محدود مدت تک اور یہ بھی واضح رہے کہ طلاق کے بعد فوراً وضعِ حمل ہوگیا تو حاملہ کی عدت ختم ہوگئی، اس کی تصریح احادیث میں آئی ہے؛ لہٰذا نفقہ بھی اس کو نہ ملے گا؛ کیوں کہ حاملہ کا نفقہ قرآن کی صراحت کے

مطابق وضعِ حمل تک ہی ہے۔"

اصلِ ثانی: حدیث

دوسری اصل حدیث ہے، اس سلسلے میں فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی حدیث پر رد کرتے ہوئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ: مطلقہ ثلاثہ کے لیے نفقہ اور سکنی ہے، جب تک کہ وہ عدت میں رہے اور اس پر حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے الدرایۃ میں سکوت کیا ہے۔(۱)

اس میں مادامت فی العدۃ کے الفاظ ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ نفقہ اس وقت تک ہی دیا جائے گا، جب تک کہ وہ مطلقہ عورت عدت میں ہے، اختتامِ عدت کے بعد نفقہ نہیں دیا جائیگا۔

اصلِ ثالث: اجماع

اب آیئے تیسری اصل اجماع کی طرف، پوری امت کا اس بات پر اجماع ہے کہ نفقۂ مطلقہ عدت تک ہی مرد پر لازم ہے، عدت کے بعد مرد کے ذمہ مطلقہ کا نفقہ نہیں ہے، چودہ سو سالہ تاریخِ اسلامی میں کسی عالم و امام کا ایسا کوئی قول اور فتوی نہیں ملتا اور نہ دکھایا جاسکتا ہے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ نفقۂ مطلقہ بعدِ عدت بھی مرد پر لازم ہے۔

علما کے مابین اگر اختلاف ہے تو اس میں ہے کہ ہر مطلقہ کو نفقہ ملے گا یا نہیں؟ جیسا کہ اس مسئلے کی تفصیل آگے بحثِ ثانی کے تحت آئے گی؛ مگر اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ جس مطلقہ کو بھی نفقہ ملے گا، تا عدت ملے گا، عدت کے بعد مطلقہ عورت مرد کی جانب سے نفقہ پانے کی حق دار نہیں۔

---

(۱) الدرایۃ: ۲/۸۳

پس اجماعِ امت سے بھی معلوم ہوا کہ نفقۂ مطلقہ عدت تک محدود ومحصور ہے، یہ واضح رہے کہ اجماعِ امت اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک حجتِ قطعیہ ہے، جیسا کہ اصولِ فقہ میں مصرح ہے:

''ان الاجماع فی الامور الشرعیة فی الاصل یفید الیقین والقطعیة فیکفر جاحده.'' (۱)

اصلِ رابع: قیاس

اس کے بعد قیاس کی طرف نظر فرمایئے، اس کا مقتضا بھی یہی ہے کہ نفقہ عدت تک محدود ہو، اس کے بعد نہ دیا جائے، وجہ یہ ہے کہ نفقہ دراصل اس لیے مرد پر واجب ہوا ہے کہ عورت عدت میں مرد کی وجہ سے بغرضِ استبراءِ رحم محبوس ومقید رہتی ہے؛ لہٰذا جس کے لیے یہ محبوس ہے، اس پر اس کی مدتِ حبس کا نفقہ اور خرچ بھی لازم ہوگا اور جب حبس ختم ہو جائے تو نفقہ بھی ممسوک ہو جائے گا اور ظاہر ہے کہ عدت کے بعد حبس نہیں ہے؛ بل کہ قرآن نے عدت کے بعد عورتوں کو روکنے کی ممانعت فرمائی ہے، پس جب عدت کے بعد مرد کی طرف سے حبس نہیں تو مرد پر اس کا نفقہ بھی نہ ہونا چاہیے۔

یہ قیاس قرآن سے مستنبط ہے، وہ اس طرح کہ قرآن نے حاملہ عورت کے لیے نفقہ کا حکم دیتے ہوئے ﴿حَتّٰى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ﴾ فرمایا ہے، اس میں اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ مطلقہ چوں کہ عدت میں استبراءِ رحم کی غرض سے محبوس رہتی ہے؛ اس لیے استبراءِ رحم تک ان کا نفقہ مرد کو دینا چاہیے، البتہ جب وضعِ حمل سے استبراء ہو جائے تو نفقہ مرد پر لازم نہیں ہے، پس جب حاملہ عورت کا نفقہ اسی علت سے مفروض ہوا ہے کہ وہ عدت میں محبوس رہتی ہے، تو غیر حاملہ عورت بھی چوں کہ عدت میں محبوس

---

(۱) نور الانوار: ۲۲۵

رہتی ہے؛ اس لیے اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا اور جس طرح حاملہ کا نفقہ اس کی عدت یعنی وضعِ حمل کے بعد مرد پر لازم نہیں؛ اسی طرح غیر حاملہ کا نفقہ بھی بعد العدۃ مرد کے ذمہ نہیں ہوگا۔ الغرض قیاس بھی یہی کہتا ہے کہ بعدِ عدت مرد کے ذمہ مطلقہ کا نفقہ نہ ہونا چاہیے۔ پس معلوم ہوا کہ نفقۂ مطلقہ کے سلسلہ میں شرعی اصول اور طریق کار یہ ہے کہ بعدِ عدت یہ مرد پر لازم نہیں، صرف عدت تک محدود و محصور ہے، پس زیرِ بحث آیت سے یہ بات معلوم ہوئی کہ نفقہ صرف عدت تک دینا چاہیے؛ کیوں کہ آیت نے یہ تصریح کر دی ہے کہ عورتوں کو متاع، معروف طریقہ پر اور شرعی دستور کے موافق دینا چاہیے اور شرعی دستور ابھی اوپر معلوم ہوگیا کہ وہ عدت تک نفقہ دینا ہے نہ کہ عدت کے بعد۔ زیرِ بحث آیت سے بخوبی معلوم ہوگیا کہ نفقہء مطلقہ عدت تک محدود ہے، یہاں پر وہ لوگ متوجہ ہوں جو اسی آیت سے سپریم کورٹ کے فیصلہ کے مطابق یہ ثابت کرنے کی ناکام کوشش میں مصروف ہیں کہ نفقہء مطلقہ مرد پر تا نکاحِ ثانی لازم ہے، کیا اب بھی کسی کو اس آیت سے اس مخترعہ قانون کو ثابت کرنے کی جرأت ہوسکتی ہے، جو سراسر قرآن اور اسلامی قانون کے خلاف ہے۔

ایک استدلال پر نظر

(۱) اس سے ہماری مراد وزیرِ مملکت برائے امورِ داخلہ وصنعت عارف محمد خان ہیں جنھوں نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مذکورہ دعوی کیا ہے۔ جو ۱۴ستمبر ۱۹۸۵ء کے اخبار بلٹز میں شائع ہوا ہے۔۱۲

وہ لوگ بھی یہاں پر متوجہ ہوں جنھوں نے یہ دعوی کیا ہے کہ مطلقہ کے نان ونفقہ کو عدت تک محدود کرنا قرآنی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا اور اس پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ مطلقہ عورت کو عدت کے دوران سکنی اور گھر دینا مرد پر لازم ہے اور

اس کی رہائش کا انتظام ضروری ہے؛ اس لیے ان دنوں میں نفقہ کا سوال ہی نہیں اٹھتا، کیوں کہ یہ بھی مرد پر لازم ہوگا؛ اس لیے اب جو نفقہ دینے کا حکم ہو رہا ہے، یہ عدت کے بعد ہی کے لیے ہے۔

ان لوگوں کو چاہیے کہ اولاً ہماری ان معروضات کو بغور ملاحظہ فرمائیں، جو گذشتہ صفحات میں پیش کی گئی ہیں، پھر اپنے اس دعوی پر نظرِ ثانی فرمائیں کہ نفقہ کو عدت تک محدود کرنا، قرآنی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا، یہی مذکورہ دعوی کے بطلان کو ظاہر کرنے کے لیے کافی ووافی ہے۔ پھر ان لوگوں کا یہ طریقِ استدلال اور طرزِ فکر بھی غیر منطقی اور غیر معقول ہے، کیوں کہ ان کے استدلال کا حاصل تو یہ نکلا کہ ایک حکم دینے کے بعد دوسرا کوئی ایسا حکم نہیں دیا جا سکتا، جو پہلے حکم سے لازم آ گیا اور ضمنی طور پر ثابت ہو گیا ہو؛ اس لیے سکنی کا حکم دینے کے بعد جس سے نفقۂ عدت لازم آ رہا ہے، پھر اسی نفقۂ عدت کا حکم نہیں دیا جا سکتا، پس اب جو نفقہ کا حکم دیا گیا ہے، وہ عدت کے بعد کے لیے ہے۔

یہ استدلال اس لیے غلط ہے کہ سب پر یہ عیاں ہے کہ کسی مصلحت سے ضمناً ثابت شدہ امر کو مستقلاً بیان کرنا ہر طرح درست اور صحیح ہے۔ لہٰذا اگر نفقہءعدت کا حکم سکنی کے حکم سے لازم بھی آ گیا ہو تو اس کو پھر مستقل طور پر بیان کرنا صحیح ہے۔ اس کی قرآن میں کئی نظیریں اور مثالیں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک مثال اسی نفقۂ مطلقہ کے مسئلہ سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ سورۂ طلاق (آیت: ٦) میں اولاً مطلقہ عورتوں کے لیے رہائش کا انتظام کرنا مرد پر لازم کیا گیا ہے، پھر حاملہ عورتوں کو ان کی عدت یعنی وضعِ حمل تک نفقہ دینے کا حکم فرمایا گیا ہے، اگر یہ بات غیر معقول ہوتی کہ ضمناً ثابت شدہ امر کو مستقل طور پر ذکر کیا جائے، تو قرآن میں مطلقہ عورتوں کے لیے

(جن میں وہ مطلقہ بھی داخل ہیں جو حاملہ ہوں) سکنی کا حکم دینے کے بعد ان حاملہ عورتوں کو تاعدت ہی نفقہ دینے کا کیوں حکم دیا جاتا؟

پھر اگر بالفرض اس قاعدہ کو تسلیم بھی کر لیا گیا تو اس میں کلام کی گنجائش ہے کہ سکنی سے نفقہ کا حکم لازم آ گیا اور اس لزوم سے انکار کیا جا سکتا ہے؛ اسی لیے امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ غیر حاملہ ایسی مطلقہ کے لیے جس کو طلاقِ بائن دی گئی ہو، اسی آیت سے سکنی کو ثابت ماننے کے باوجود نفقہ کا اس کے لیے انکار کرتے ہیں۔

الغرض مذکورہ استدلال نا قابلِ التفات اور مذکورہ دعوی سراسر نا قابلِ قبول ہے۔

بعض آیات پر نظر

یہاں مناسب ہوگا اگر بعض ان آیات پر بھی اجمالی نظر ڈال لی جائے، جن سے تا نکاحِ ثانی مطلقہ کے نان و نفقہ پر استدلال کیا جا رہا ہے۔

﴿اَلطَّلاقُ مَرَّتَانِ فَاِمسَاکٌ بِمَعرُوفٍ أَو تَصرِیحٌ بِاِحسَان﴾

(البقرۃ: ۲۲۹)

(طلاق دو مرتبہ ہے (اس کے بعد) یا (رجعت کر کے) قاعدہ کے موافق رکھ لے یا اچھے طریقے پر چھوڑ دے۔)

اس آیت سے بھی نکاحِ ثانی تک مرد کے ذمہ مطلقہ کے نفقہ کا ثبوت اخذ کیا جا رہا ہے کہ اس میں احسان کے ساتھ عورت کو چھوڑنے کا حکم ہے؛ مگر اس آیت کی یہ تشریح، تفسیر بالرائے اور تحریفِ قرآن کی زد میں آ جاتی ہے۔ اولاً تو اس لیے کہ یہاں احسان پر تنوینِ تنکیر داخل ہے، جس کا یہ مطلب ہے کہ کچھ تھوڑا بہت احسان کر کے رخصت کر دو اور عام مفسرین کے نزدیک اس سے متعہ مراد ہے، جس میں تین کپڑے مطلقہ کو دیئے جائیں گے، اس سے یہ کیسے سمجھا جا سکتا ہے کہ اس سے مراد

تا نکاحِ ثانی نفقہ دینا ہے۔

ثانیاً اس لیے کہ احسان سے مراد شرعی طریقہ پر احسان کرنا ہے؛ اسی لیے اس مضمون کو قرآن نے دوسری جگہ اس طرح بیان فرمایا ہے۔

﴿وَاِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَاَمْسِكُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ اَوْسَرِّحُوْهُنَّ بِمَعْرُوْفٍ﴾ (البقرۃ : ۲۳۱)

(جب تم عورتوں کو طلاق دے دو اور وہ عورتیں عدت کے پورا ہونے کے قریب پہنچ جائیں تو تم یا تو ان کو شرعی دستور کے مطابق روک لو یا دستور کے مطابق ان کو چھوڑ دو۔)

اس آیت میں بھی وہی مضمون وارد ہوا ہے، جو اوپر کی آیت میں ہے اور اس میں امساک اور تسریح دونوں حکموں کے ساتھ ''بمعروف'' کی قید ہے، معلوم ہوا کہ اوپر کی آیت میں احسان سے مراد شرعی طریقہ پر احسان ہے؛ کیوں کہ ایک آیت دوسری آیت کی تفسیر کرتی ہے اور اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ معروف کے معنی شرعی طریقہ کے ہیں اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ نفقۂ مطلقہ کے سلسلے میں شرعی دستور کیا ہے، پھر اس سے اس مخترعہ قانون کو ثابت کرنا اور آیت کی اس قانون کے مطابق تشریح کرنا تفسیر بالرائے نہیں تو اور کیا ہے؟

﴿وَمَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ مَتَاعاً بِالْمَعْرُوْفِ حَقّاً عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (البقرۃ : ۲۳۶)

(اور ان (عورتوں کو جن کو قبل از تعیینِ مہر اور خلوت، طلاق دے دی ہو) متعہ دو، یہ غنی پر اس کے موافق اور فقیر پر اس کے موافق ہے، متعہ دینا قاعدہ کے موافق، یہ محسنین پر لازم ہے۔)

اس سے بھی مخترعہ قانون کی تائید حاصل کی گئی ہے؛ مگر اس آیت سے نفقۂ مطلقہ پر استدلال ہی غلط ہے؛ کیوں کہ نفقہ کا سوال وہاں اٹھتا ہے جہاں عدت کا مسئلہ ہو اور جہاں عدت ہی نہ ہو وہاں نفقہ کا سرے سے سوال ہی نہیں اور یہ آیت ان عورتوں سے متعلق ہے، جن کو قبل از خلوت وصحبت طلاق دی گئی ہو، چناں چہ اسی آیت کا اس جزء سے پہلے کا جزء یہ ہے:

﴿لاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسآءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْ تَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً فَمَتِّعُوْهُنَّ﴾ (البقرۃ: ۲۳۴)

(تم پر کچھ گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو ان سے صحبت وخلوت سے قبل یا مہر فرض کرنے سے قبل طلاق دے دو۔)

اس کے بعد حکم ہے ایسی عورتوں کو متعہ دینے کا، پس معلوم ہوا کہ یہ آیت ان عورتوں سے متعلق ہے جو قبل از صحبت وخلوت طلاق یافتہ ہیں اور ایسی عورتوں پر عدت نہیں ہے، کیوں کہ قرآن نے اس کی صراحت کی ہے۔

﴿ يآاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا اِذَا نَكَحْتُمُ الْمُؤْمِنَاتِ ثُمَّ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَمَسُّوْهُنَّ فَمَالَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُّوْنَهَا فَمَتِّعُوْهُنَّ وَ سَرِّحُوْهُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا﴾ (الأحزاب: ۴۹)

(اے ایمان والو جب تم مومن عورتوں سے نکاح کرلو، پھر ان کو طلاق دے دو قبل اس کے کہ ان سے صحبت کرو، تو تمہارے لیے ان عورتوں پر عدت نہیں ہے، جس کو تم شمار کرنے لگو پس ان عورتوں کو متعہ دو اور اچھی طرح رخصت کرو۔)

پس جب ان عورتوں پر عدت ہی نہیں تو نفقہ کا کوئی سوال ہی نہیں؛ لہٰذا اس

آیت کا نفقۂ مطلقہ سے کوئی تعلق نہیں، پس آیت میں متعۂ طلاق کا ذکر ہے، اسی طرح سورۂ احزاب کی (آیت:۴۹) میں بھی متعہ ہی مراد ہے نہ کہ نفقہ اور اگر اس آیت سے متعہ مراد لیتے ہوئے مطلقہ کے لئے یکمشت اتنی رقم دینے پر استدلال کیا جائے کہ جس سے وہ تا نکاحِ ثانی اپنا گذارہ کر سکے، تو اس کا جواب ہم دوسرے قول کی تفصیل کرتے ہوئے حوالۂ قلم کریں گے۔ (انشاء اللہ)

ایک سوال کا جواب

اگر کوئی کہے کہ جس طرح دوسری بعض آیات میں متعہ کے معنی نفقہ کے لیے گئے ہیں، اسی طرح یہاں بھی اس کی گنجائش ہے، پس جب ان مطلقہ عورتوں پر عدت نہ ہونے کے باوجود ان کو متعہ یعنی نفقہ دینے کا حکم ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ نفقہ عدت کے ساتھ خاص نہیں؛ لہٰذا یہ عدت تک محدود بھی نہ ہوگا۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس جگہ متعہ سے نفقہ مراد لینا تحکمِ محض اور جرأتِ بے جا ہے؛ کیوں کہ اس سے باتفاقِ مفسرین متعۂ طلاق مراد ہے؛ لہٰذا یہاں نفقہ مراد لینا تواترِ اہلِ اسلام کے خلاف ہے۔

اگر اس طرح قرآنی الفاظ کو اپنے من مانی مرادات کا جامہ پہنایا جائے گا، تو قرآن میں تاویل کا دروازہ کھل کر وہ ایک کھیل بن کر رہ جائے گا اور ہر شخص جو اس کی سمجھ میں آئے گا، قرآن سے ثابت کرنے لگے گا، اگر آج اس سے نفقہ مراد لیا جا رہا ہے، تو ممکن ہے کل کوئی اسی سے نکاحِ متعہ مراد لے کر اس کے جواز کو ثابت کرنے لگے۔ (نعوذ باللہ) کیا شیعہ فرقہ اسی قسم کی تحریف کا مرتکب ہو کر ہلاک نہیں ہوا؟ اور کیا قادیانی گروہ گمراہی کا شکار نہیں ہوا؟ اور راہِ حق سے بھٹک نہیں گیا؟

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جو عربی زبان کے ماہر اور علمِ ادب و لغت سے خوب واقف

تھے، وہ بھی مراداتِ ربانی کے سمجھنے میں حضرت شارع علیہ السلام کے محتاج تھے۔

«عن عبد اللّٰه قال لما نزلت ولم يلبسوا ايمانهم بظلم قال اصحابه واينا لم يظلم فنزلت ان الشرك لظلم عظيم» (۱)

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ اَلَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُوْلٰئِكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴾ (الانعام: ۸۲)

تو صحابہ کرام پر یہ آیت شاق گذری (کیوں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ امن پانے والے وہی لوگ ہیں، جو ایمان لے آئے اور اپنے ایمان کو ظلم سے مخلوط نہیں کیا، جس سے یہ معلوم ہوا کہ کچھ بھی ظلم کرنا ایمان لانے کے بعد امن سے محروم کر دیتا ہے) صحابہ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہم میں سے کون ایسا ہے، جو ظلم سے بچا ہو؟ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ظلم سے مراد وہ نہیں ہے، جو تم گمان کر رہے ہو؛ بل کہ اس سے مراد شرک ہے، جیسا کہ حضرت لقمان علیہ السلام نے فرمایا تھا:

﴿اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ﴾ (شرک ظلم عظیم ہے۔) (لقمان: ۱۳)

اسی طرح ایک اور مثال لیجیے:

« عن عدی بن حاتم قال قلت يا رسول الله ما الخيط الابيض من الخيط الاسود هما الخيطان قال انك لعريض القفاان ابصرت الخيطين ثم قال لا بل هو اسود

---

(۱) بخاری: ۲/۶۶۶

اللیل وبیاض النھار» (۱)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ قرآن میں واقع خیطِ ابیض اور خیطِ اسود سے یہ سمجھے کہ اس سے مراد سفید دھاگہ اور سیاہ دھاگہ ہے، اس پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو بتایا کہ اس سے مراد صبحِ صادق اور صبحِ کاذب ہے۔

معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بھی مرادِ ربانی کے سمجھنے میں محتاج تھے، تو پھر دوسرے لوگ کیوں نہ محتاج ہوں گے، پس قرآن کی تفسیر یا تو شارع علیہ السلام کے ارشادات کے موافق کی جائے اور اگر اس میں کچھ نہ ملے تو آپ کے تربیت دیئے ہوئے اصحاب کے اقوال سے، ورنہ ان کے شاگردانِ رشید کے اقوال کے مطابق، وعلی ہذا اور جو تفسیر اجماعی ہو وہ تو قطعی ہے۔ اس کے خلاف کسی قول کا اختیار کرنا گم راہی ہے۔

الغرض یہ بات کسی آیت سے ثابت نہیں کی جا سکتی کہ عدت کے بعد بھی مرد کے ذمہ نفقۂ مطلقہ ہے؛ بل کہ اس کے برعکس یہ ثابت ہو چکا ہے کہ عدت تک ہی نفقۂ مطلقہ محدود ہے۔

بحثِ ثانی

اب دوسری بحث کی طرف آیئے کہ نفقۂ عدت کس قسم کی مطلقہ کو دیا جائیگا؟ بالفاظِ دیگر زیرِ بحث آیت میں متاع سے نفقہ مراد ہو تو "المطلقات" سے کون سی مطلقہ عورتیں مراد ہیں؟ پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ قانونِ اسلامی اور مخترعہ قانونِ سرکاری میں کس قدر تفاوت اور خلا ہے، جس سے یہ واضح ہوگا کہ یہ قانونِ مخترعہ، قرآن اور اسلام کے قانون سے ٹکراتا ہے۔

---

(۱) بخاري: ۴۱۵۰، مسلم: ۱۸۲۴

مطلقہ کی اقسام

اس بحث میں قدم رکھنے سے قبل مطلقہ کی قسمیں معلوم کر لینا ناگریز ہے، اولاً مطلقہ کی طلاق کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں۔

(۱) مطلقہ رجعیہ (جس کو طلاقِ رجعی دی گئی ہو)

(۲) مطلقہ بائنہ (جس کو طلاقِ بائن دی گئی ہو)

(۳) مطلقہ مغلظہ (جس کو طلاقِ مغلظہ دی گئی ہو)

ثانیاً مطلقہ کی صحبت اور مہر کے لحاظ سے چار قسمیں ہیں

(الف) وہ مطلقہ جس کو صحبت وخلوت سے قبل طلاق دی گئی ہو اور مہر متعین نہ ہو۔

(ب) جس کو صحبت سے قبل طلاق دی گئی ہو اور مہر متعین ہو۔

(ج) جس کو صحبت کے بعد طلاق دی گئی ہو اور مہر متعین نہ ہو۔

(د) جس کو صحبت کے بعد طلاق دی گئی ہو اور مہر متعین ہو۔

نفقۂ مطلقہ کے احکام

اب اصل بحث کی طرف آیئے، تقسیمِ اول کے لحاظ سے امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ کے نزدیک ہر مطلقہ خواہ وہ رجعیہ ہو یا بائنہ یا مغلظہ، عدت میں نفقہ پانے کی حق دار ہے اور حضراتِ ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد رحمہم اللہ صرف رجعیہ کے لیے نفقۂ عدت لازم قرار دیتے ہیں اور بائنہ یا (حاشیہ البتہ بائنہ مغلظہ ہو تو سب کے نزدیک نفقہ کی مستحق ہے) مغلظہ کے لیے نفقہ کا انکار فرماتے ہیں۔

امام ابوحنیفہ رَحِمَہُ اللّٰہُ دار قطنی کی روایت:

" اَلمُطَلقَةُ ثَلاثًا لَهَا النَفقَةُ وَالسُكنٰى." (۱)

---

(۱) الدار قطنی: ۳۹/۵، ح۳۹۴۹

اور بعض دوسری روایات سے استدلال فرماتے ہیں اور جب مطلقہ ثلاثہ یعنی مغلظہ کے لیے نفقہ ہے، تو بائنہ کے لیے تو بدرجۂ اولی ہوگا اور ائمہ ثلاثہ فاطمہ بنت قیس رضی اللہ عنہا کی روایت سے استدلال کرتے ہیں، جس میں ہے کہ ان کے شوہر نے ان کو تین طلاقیں دے دی تھی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے لیے نفقہ اور سکنی نہیں دلوایا، احناف نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ روایت قابلِ احتجاج نہیں ہے؛ کیوں کہ اس پر اکابرِ صحابہ نے طعن کیا ہے۔

الغرض تقسیمِ اول کے لحاظ سے مطلقہ رجعیہ کو باتفاقِ علماء نفقہ ملے گا، دوسروں کے نزدیک نہیں، پس امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے قول کے مطابق ہر مطلقہ کو نفقہ ملے گا، اس سے یہی تین قسمیں مراد ہیں۔

اور تقسیمِ ثانی کے اعتبار سے نفقۂ عدت صرف تیسری اور چوتھی قسم کی مطلقہ کو ملے گا۔ اول اور دوم قسم کی مطلقہ اس کی حق دار نہیں؛ کیوں کہ پہلے گذر چکا کہ نفقہ کا مسئلہ وہاں پیدا ہوتا ہے، جہاں عدت ہو، جہاں عدت ہی نہ ہو وہاں نفقہ کا کوئی سوال ہی نہیں اور عدت ان پر ہی لازم اور مشروع ہے، جن سے صحبت یا خلوت ہوئی ہو اور جن سے صحبت اور خلوت نہیں ہوئی، ان پر عدت نہیں ہے۔ لہٰذا جن عورتوں کو بعدِ صحبت یا خلوت طلاق دی گئی ہے، ان ہی پر عدت ہے اور عدت کا نفقہ بھی ان ہی کے لیے ہے؛ لہٰذا قسمِ اول اور دوم کے لیے نفقہ بھی نہیں ہوگا، جیسے ان پر عدت نہیں، یہ بھی پوری امت کا اجماعی مسلک ہے کہ نفقہ کی مستحق وہ مطلقہ ہے جس پر عدت لازم ہو ورنہ وہ نفقہ کی مستحق نہیں؛ لہٰذا یہاں "المطلقات" سے مراد صرف دو قسم کی مطلقہ ہوں گی اور اوپر یہ معلوم ہو چکا ہے کہ اجماعِ امت حجتِ قطعیہ ہے اور اصولِ شرع میں سے ہے؛ لہٰذا اس سے ثابت شدہ حکم اور قانون شرعی دستور ہے اور اس آیت میں

شرعی دستور کے مطابق ہی نفقہ دینے کا حکم ہے؛لہٰذا شرعی دستور یہ ہوگا کہ صرف دو قسم کی مطلقہ کو عدت تک نفقہ دیا جائے۔

اختراعی قانون پر نظر

اب ذرا اس اختراعی قانون پر دوبارہ نظر فرمایئے،شرعی دستور اور آئین تو یہ کہتا ہے کہ صرف دو قسم کی مطلقہ کو نفقہ دیا جائے گا؛ لیکن قانونِ مذکور ہر قسم کی مطلقہ کے لیے بلا کسی استثناء کے نفقہ دئے جانے کا فیصلہ کرتا ہے،کیا یہ قانونِ اسلامی میں مداخلت نہیں؟اگر ہے اور یقیناً ہے تو پھر اس کا کیا جواز ہے؟

قولِ ثانی کی تفصیل

یہاں تک قولِ اول کی تفصیل تھی اور قولِ ثانی کے مطابق متعہ سے متعۂ طلاق مراد لیا جائے،جیسا کہ اکثر مفسرین نے اختیار فرمایا ہے،تو اس کے متعلق دو مسئلوں کی تحقیق کرنا ہے،ایک تو یہ کہ متعہ کی وہ کیا مقدار ہے،جس کو مرد،عورت کو ادا کر کے بری الذمہ ہو جاتا ہے؟ دوسرے یہ کہ متعہ مطلقہ کی کس قسم کے لیے ہے؟

پہلا مسئلہ متعہ کی مقدار

متعہ کی مقدار کے سلسلہ میں قرآن ساکت ہے،البتہ ''متاع'' پر تنوینِ تنکیر داخل کر کے اس طرف اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ فریضہ کچھ نفع بخش چیز دے دینے سے ادا ہو جائے گا؛ اسی لیے ایک انصاری شخص کو جس نے بنی حنیفہ کی ایک عورت سے بلا تعیینِ مہر نکاح کر لیا تھا اور پھر اسی کو قبل از صحبت طلاق دے دی تھی،جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ دینے کا حکم دیتے ہوئے فرمایا (متّعها ولو بقلنسوتک) کہ اس عورت کو متعہ دے اگرچہ تیری ٹوپی ہی کیوں نہ ہو۔(۱)

---

(۱) معالم التنزیل: ۱/۲۱۷،تفسیر قرطبی: ۳/۲۰۲

مگر ممکن ہے کہ وہ آدمی جس کو آپ نے یہ حکم فرمایا تھا نہایت ہی تنگ دست ہو اور صحابہ کرام میں سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے متعہ کی تقدیر تین کپڑوں سے مروی ہے: ایک قمیص، ایک دوپٹہ اور ایک چادر۔ یہ متعہ کی ادنی مقدار ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس قدر اگر مرد عورت کو دے دیگا تو فریضہ سے سبکدوش ہو جائے گا اور یہ معلوم ہونا چاہیے کہ صحابہ کرام کے غیر قیاسی اقوال مرفوع روایت کے حکم میں ہوتے ہیں اور متعہ کی تقدیر ظاہر ہے کہ غیر قیاسی چیز ہے؛ اس لیے یہ بھی مرفوع کے حکم میں ہے، جسکا مطلب یہ ہوا کہ یہ متعہ کی مقدار خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیان کی ہوئی ہے۔

اور جو اس سے زائد کوئی دے تو یہ محض تبرع ہوگا اور متعہ کی اعلی مقدار ہوگی جیسے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے اعلی مقدار (خادم) منقول ہے؛ مگر یہ درجہ واجب نہیں ہے؛ بل کہ استحسان ہے، جس پر کسی کو مجبور نہیں کیا جاسکتا، جیسے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے اپنی مطلقہ عورت کو دس ہزار درہم کا عطیہ دیا تھا اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی مطلقہ عورت کو متعہ میں ایک باندی دی تھی۔ (۱)

اور قاضی شریح رحمہ اللہ نے پانچ سو درہم کا عطیہ دیا تھا۔ پس یہ سب کا سب تبرع اور احسان ہے، جس پر جبر نہیں کیا جاسکتا۔ (۲)

الحاصل متعہ میں تین کپڑے دے دینے سے اس فریضہ سے انسان بری الذمہ ہو جائے گا، ہاں البتہ مال دار ہو تو اس کو چاہیے کہ اپنی حیثیت کے مطابق اعلی درجہ کے کپڑے دے اور تنگدست اپنی حیثیت کے مطابق، کیوں کہ قرآن نے فرمایا ہے:

---

(۱) معالم التنزیل: ۱/ ۲۱۷

(۲) معارف القرآن: ۱/ ۵۸۸

﴿عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ﴾ (البَقَرَة: ۲۳۶)
(کہ غنی کو اس کے امکان کے موافق اور فقیر پر اس کی طاقت کے موافق متعہ دینا ہے۔)

قانونِ مخترعہ اور متعۂ اسلام

سپریم کورٹ کے بعض ہمنوا لوگوں نے مطلقہ عورت کو یک مشت اتنی رقم جس سے وہ تا نکاحِ ثانی گذارہ کر سکے بطورِ متعہ دینا مرد کے ذمہ ہونے پر ان روایات سے تائید حاصل کی ہے، جن کا ابھی ہم نے ذکر کیا ہے اور ممکن ہے "علی الموسع قدرہ" سے بھی استدلال کریں، کہ غنی پر اس کے موافق متعہ دینا واجب ہے؛ لہٰذا وہ مطلقہ عورت کو ایک کثیر رقم متعہ میں دے۔

مگر ان روایات سے استدلال تو اس لیے غلط ہے کہ وہ روایات جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، تبرع پر محمول ہیں اور یہ قانون وجوب کا فیصلہ کر رہا ہے، اور آیت سے استدلال اس لیے صحیح نہیں کہ اولاً تو اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ متعہ میں جو چیز دی جائے وہ امیر پر امیرانہ اور فقیر پر فقیرانہ واجب ہے، حاصل یہ کہ صفت کے لحاظ سے شئی بڑھیا یا گھٹیا دی جائے، نہ کہ مقدار کے لحاظ سے اور اگر مقدار کے لحاظ سے امیرانہ اور فقیرانہ دینے کا اس میں بیان ہے تو بھی اس سے دعوی مذکور پر کوئی دلالت نہیں ہوتی، اس سے تو بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ امیر آدمی فقیر کی طرح کم نہ دے؛ بلکہ امیر کی طرح زیادہ دے؛ مگر تا نکاحِ ثانی عورت کے خرچ کا انتظام کر دے، اس کا اس آیت سے کوئی جوڑ نہیں۔

پھر نکاحِ ثانی کا وقت اور زمانہ غیر معلوم اور غیر معین ہے، اس کے لیے یک مشت رقم کس حساب پر دی جائے گی اور اگر کسی کا نکاح نہ ہوا یا کسی نے نکاح نہ کیا تو

اس کا کیا کیا جائے گا؟

ہم اس مخترعہ قانون پر اس کے مفاسد کے اعتبار سے بھی بحث کرتے اگر یہ ہمارے موضوع سے خارج نہ ہوتا اور طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا؛ مگر چوں کہ ہمارا موضوع، قانونِ مذکور کا قرآن اور اسلامی قانون سے جائزہ لینا ہے؛ اس لیے ہم اس بحث میں جانا نہیں چاہتے۔ **لعل اللّٰہ یحدث بعد ذالک امرا.**

دوسرا مسئلہ

متعہ کس قسم کی مطلقہ کے لئے ہے؟

اس کا جواب معلوم کرنے سے قبل یہ پیشِ نظر رہے کہ متعہ دو قسم کا ہے، ایک واجب، دوسرا مستحب۔ اب ملاحظہ فرمائیے: امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس مطلقہ کے لیے جس کو قبل از خلوت وصحبت طلاق دی گئی ہو اور اس کا مہر متعین نہ ہو، متعہ دینا واجب ہے اور جن کو قبل از خلوت وصحبت طلاق دی گئی ہو ان کے لیے متعہ دینا مستحب ہے اور جس کو صحبت وخلوت سے قبل طلاق دی گئی ہو اور اس کا مہر متعین ہو اس کے لیے نہ مستحب ہے نہ واجب۔

اس قول پر آیت زیرِ بحث میں متعہ واجب مراد لیں تو "**المطلقات**" سے صرف ایک قسم کی مطلقہ مراد ہوں گی اور اس پر داخل الف لام عہد خارجی کا ہوگا اور اگر متعہ مستحب مراد لیں تو دو قسمیں مراد ہوں گی۔

اور امام مالک رحمہ اللہ کے نزدیک ہر مطلقہ کے لیے متعہ مستحب ہے، واجب کسی کے لیے نہیں؛ لہٰذا ان کے نزدیک آیت میں "**المطلقات**" سے ہر چہار قسم مراد ہوں گی مگر سب کے لیے متعہ مستحب ہوگا۔

اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک ہر مطلقہ کے لیے متعہ واجب ہے، سوائے

اس کے جس کو قبل از صحبت طلاق دی گئی ہو اور مہر متعین نہ ہو، اس صورت پر "المطلقات" سے تین قسمیں مراد ہوں گی، دلائل، کتبِ فقہ سے معلوم کی جاسکتی ہیں۔

تیسرے قول کی تفصیل

اور اگر متاع کو عام رکھا جائے تو اس میں یہ تفصیل ہے کہ ان چار صورتوں میں سے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

پہلی قسم کو متعہ دیا جائے گا۔

لقوله تعالی ﴿لاَ جُنَاحَ عَلَيْكُمْ......اِلیٰ......مَتِّعُوْهُنَّ﴾

دوسری قسم کو نصفِ مہر دیا جائے گا۔

لقوله ﴿وَاِنْ طَلَّقْتُمُوْهُنَّ......الی......نِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ﴾

تیسری کو مہرِ مثل دینا ہوگا۔ للاجماع

چوتھی کو پورا مہر دینا واجب ہوگا۔

لقوله تعالی ﴿وَاٰتُوْ هُنَّ اُجُوْرَهُنَّ﴾ وغیرها.

تیسرے قول کی تفصیل میں ہم نے اختصار سے کام لیا ہے، لہٰذا اس کی تفصیل اور اس میں علما کے مذاہب کا بیان کتبِ فقہ سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔

اس تحریر سے اصل غرض یہی تھی کہ مذکورہ قانون کو اس آیت سے رد کیا جائے اور ساتھ ہی بعض چیزوں کی تفصیل

والحمد للہ علی ذلک

۱۵/۱/۱۴۰۶ھ

ووٹ

اسلامی نقطۂ نگاہ سے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ووٹ اسلامی نقطۂ نگاہ سے

انتخابات کے موقعہ پر ووٹ کے متعلق جو افراط وتفریط ہوتی ہے، اس میں جو دھاندلیاں ہوتی ہیں، اور جو مجرمانہ ناٹک کھیلا جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں فاسد و مفسد عناصر بھرپور فائدہ اٹھاتے اور مفیدِ ملک وملت عناصر کو دھچکا و دھکا پہونچاتے ہیں، نیز اس کی وجہ سے خلق خدا کو جن پریشانیوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، ملک وقوم کے مفادات کو جو خطرات پیش آتے ہیں اور زمین میں ظلم و جور، فتنہ وفساد اور جنگ وجدال کی جو فضا قائم ہوتی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ ووٹ اپنے صحیح مصرف میں استعمال نہیں کیا جارہا ہے اور یہ کوتاہی دراصل نتیجہ ہے، ووٹ کی قانونی حقیقت و شرعی حیثیت کو نہ جاننے کا۔ اگر لوگ ووٹ کی حقیقت وحیثیت سے واقف ہوجائیں، تو انہیں اپنے ووٹ کی قیمت بھی معلوم ہوگی اور پھر وہ اس کو صحیح طور پر استعمال میں لانے کی فکر بھی کریں گے۔

زیرنظر مضمون انہی خیالات کا مرہونِ منت ہے، یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ ووٹ کی شرعی حیثیت پر آج سے تیس برس قبل حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ایک مختصر مگر جامع مضمون لکھا تھا، جو ''جواہر الفقہ حصہ دوم'' کا ایک جز ہوکر شائع ہو چکا ہے۔ نیز آپ نے اپنی تفسیر ''معارف القران'' میں بھی اس موضوع پر عمدہ کلام کیا ہے۔ راقم الحروف نے ان دونوں مضامین کو، اور اسی کے

ساتھ دیگر علما کی کتابوں کو سامنے رکھ کر اس مضمون کو مرتب کیا ہے، گویا یہ مضمون ''جواہر الفقہ'' کے مختصر سے مضمون کی شرح ہے۔

غیروں سے تو امید نہیں کی جا سکتی کہ وہ اس موضوع کو سمجھیں گے، البتہ اہل اسلام کو ضروری طور پر اسے سمجھنا چاہئے۔ واللہ الموفق

ووٹ کی مختلف حیثیتیں

ایک ووٹر جب کسی شخص کے حق میں ووٹ دیتا ہے، تو اس کی مختلف حیثیتیں ہوتی ہیں، ایک یہ کہ وہ امیدوار کے حق میں اس بات کی گواہی و شہادت دے رہا ہے کہ امیدوار اس کام کی صلاحیت و قابلیت رکھتا ہے، جس کے لیے یہ امیدوار بن کر کھڑا ہے، اس حیثیت سے ووٹ کی حقیقت شہادت و گواہی ہے۔

دوسری حیثیت یہ ہے کہ ووٹر امیدوار کے حق میں سفارش کرتا ہے کہ اس کو نمائندہ مقرر کر دیا جائے، اس حیثیت سے ووٹ کی حقیقت شفاعت و سفارش ہے۔

ووٹ کی تیسری شرعی حیثیت یہ ہے کہ ووٹر امیدوار کو قوم و ملت کے مشترکہ حقوق میں اپنی اور قوم کی طرف سے وکیل بناتا ہے، اس لحاظ سے ووٹ دراصل وکالت کا نام ہے۔

حضرت مفتی صاحب رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ: ہمارا ووٹ تین حیثیتیں رکھتا ہے: ایک شہادت، دوسرے سفارش، تیسرے حقوق مشترکہ میں وکالت۔ (۱)

پہلی حیثیت: شہادت

ووٹ کی پہلی حیثیت شہادت کی ہے، کہ ووٹر گواہی اور شہادت دیتا ہے کہ فلاں امیدوار جس کے حق میں میں نے ووٹ دیا ہے، وہ اس کام کی صلاحیت بھی رکھتا ہے

(۱) جواهر الفقه: ۲/۲۹۳، معارف القران: ۲/۷/۳

اور امانت دار ہونے کی وجہ سے کام کو صحیح طور پر انجام دینے کا جذبہ بھی رکھتا ہے۔ یہ تو ظاہر ہے کہ گواہی کا سچا ہونا ضروری ہے، جھوٹی گواہی بدترین قسم کا جرم ہے، جس پر شدید وعید وارد ہوئی ہے اور مذمت کی گئی ہے۔

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کبیرہ گناہوں کے بارے میں سوال کیا گیا، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (کبیرہ گناہ یہ ہیں) اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا، قتل کرنا اور جھوٹی گواہی دینا۔(۱)

(۲) حضرت ابوبکرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کیا میں تم کو سب سے بڑا گناہ بتاؤں؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ ضرور۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کرنا، والدین کی نافرمانی کرنا اور جھوٹی گواہی دینا یا یہ فرمایا کہ جھوٹی بات کہنا۔ حضرت ابوبکرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: آپ یہ لفظ بار بار فرماتے رہے، حتیٰ کہ ہم نے (دل) میں کہا کہ کاش! آپ خاموش ہو جائیں۔(۲)

(۳) حضرت حزیم بن فاتک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا خطبہ دیتے ہوئے کہ جھوٹی گواہی شرک کے برابر ہے۔ دو مرتبہ یہ فرمایا، پھر یہ آیت تلاوت فرمائی:

﴿فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّوْرِ﴾

(بتوں سے بچو یعنی شرک سے بچو اور جھوٹ بات سے بچو۔)(۳)

---

(۱) بخاري: ۳۶۲/۱، مسلم: ۶۴/۱

(۲) بخاري: ۳۶۲/۱، ترمذي: ۵۶/۲، الادب المفرد: ۱۰، مسلم: ۶۴/۱

(۳) ابو داود: ۵۰۶/۲، ترمذي: ۵۶/۲

ان تمام احادیث میں جھوٹی گواہی کو کبیرہ؛ بل کہ اکبرالکبائر گناہوں میں شمار کیا گیا ہے اور شرک کے برابر بتایا گیا ہے۔ایک اور وعید ملاحظہ کیجیے!

(۴) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: جھوٹی گواہی دینے والے، قیامت کے دن اس وقت تک ہل نہیں سکتے، جب تک کہ اس کے حق میں جہنم واجب نہ ہو جائے۔[1]

معلوم ہوا کہ جھوٹی گواہی پر جہنم کی سخت وعید آئی ہے۔

اب اس پر نظر کرنا ہے کہ جب ووٹر کسی امیدوار کے حق میں ووٹ دیتا ہے تو جیسا کہ عرض کیا گیا کہ یہ اس کے حق میں قابلیت و دیانت کی شہادت دے رہا ہے؛ لہٰذا اس میں جھوٹ و غلط بیانی سے بچنا لازم ہے؛ لہٰذا ہم کسی نااہل و ناقابل انسان کو کسی طور پر بھی ووٹ ہرگز نہ دیں، ورنہ سخت مجرم قرار پائیں گے اور دنیا کے وبال کے علاوہ اخروی پھٹکار کے بھی مستحق بن جائیں گے۔

دوسری حیثیت: شفاعت

ووٹ کی دوسری حیثیت سفارش و شفاعت کی ہے کہ ووٹ دینے والا امیدوار کے حق میں سفارش کرتا ہے، کہ اس امیدوار کو نمائندگی دی جائے۔سفارش کے متعلق اسلامی اصول یہ ہے کہ اچھے کام میں اور اچھے آدمی کے لیے سفارش کی جائے اور کسی برے کام کی اور برے آدمی کی سفارش نہ کی جائے۔چناں چہ قرآن نے اس اصول کو بیان کیا ہے۔سورہ نساء کی آیت میں ہے:

﴿ مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰى

(۱) الکبائر للذھبي: ۷۹

كُلِّ شَيْءٍ مُّقِيتًا﴾ (النِّسَآء : ۸۵)

(جو کوئی سفارش کرے حق بات میں اس کو بھی ملے گا، اس میں سے ایک حصہ اور جو کوئی سفارش کرے بری بات میں، اس پر بھی ہے ایک بوجھ، اس میں سے اور اللہ ہے ہر چیز پر قدرت رکھنے والا۔)(۱)

اس آیت میں شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ کا جو ذکر آیا ہے، اس کی متعدد تفسیریں علمائے تفسیر نے بیان فرمائی ہیں؛ مگر جامع تفسیر حضرت حسن بصری رحمہ اللہ نے ارشاد فرمائی ہے، وہ کہتے ہیں: کہ شفاعت حسنہ وہ ہے، جو دین میں جائز ہے اور شفاعت سیئہ وہ ہے، جس کی اجازت نہیں۔(۲)

مطلب یہ ہے کہ جائز کاموں میں کسی کی سفارش کرنا شفاعت حسنہ ہے اور ناجائز کاموں میں کسی کی سفارش کرنا شفاعت سیئہ ہے۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اسی آیت کے تحت ارشاد فرماتے ہیں:

''خلاصہ یہ ہوگیا کہ جو آدمی کسی شخص کے جائز حق اور جائز کام میں جائز طریقہ پر سفارش کرے، تو اس کو ثواب ملے گا اور اسی طرح جو کسی ناجائز کام کے لیے یا ناجائز طور پر سفارش کرے گا تو اس کو اس کا حصہ عذاب ملے گا۔''(۳)

آیت کریمہ اور اس کی تفسیر سے یہ معلوم ہوا کہ کسی ناجائز کام کے لیے سفارش کرنا ناجائز وحرام ہے اور اچھے کام کے لیے سفارش کرنا جائز وثواب کا کام ہے؛ لہٰذا جب کسی امیدوار کو ووٹ دینا چاہے، تو یہ سوچنا چاہیے کہ یہ ووٹ دینا ثواب کا باعث

(۱) ترجمہ شاہ رفیع الدین

(۲) قرطبی: ۵،۲۹۵

(۳) معارف القرآن: ۲/۴۹۸

بنے نہ کہ عذاب کا۔

اگر قابل اعتماد آدمی کو ووٹ دیا جائے گا، تو ثواب ملے گا اور کسی غلط و نا قابل آدمی کو ووٹ دیا جائے گا تو عذاب ملے گا؛ لہٰذا پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ یہ شخص جو آدمی امیدوار بنا ہوا ہے کہ ملک وملت کے لیے خطرہ تو نہیں ہوگا اور یہ کہ ملک وملت کی بہبودی کے کام کرنے والا ہے یا نہیں؟ کیریکٹر و مزاج صالح ہے یا فاسد؟ جب تک امیدوار کی صلاحیت و قابلیت و دیانت کو نہ دیکھ لیا جائے، اس وقت تک ووٹ نہ دیا جائے، ورنہ عذاب میں گرفتار ہونا پڑیگا اور عذاب کوئی ضروری نہیں کہ آخرت کا ہی ہو؛ بل کہ یہاں دنیوی عذاب بھی مراد ہوسکتا ہے اور یہ تجربہ بھی ہے کہ ہمارے ووٹ جب غلط آدمی کو جاتے ہیں، تو وہ جیتنے کے بعد اپنی غلط کاریوں اور مجرمانہ کاریوں سے ملک وملت کے لیے خطرہ و عذاب بن جاتا ہے۔ اس طرح ''کفل منھا'' کی ایک تفسیر یہ بھی ہوسکتی ہے کہ جو آدمی غلط سفارش کرتا ہے، تو اس کا وبال، اس پر پڑتا ہے چناں چہ مشاہدہ ہے۔

تیسری حیثیت: وکالت

ووٹ کی ایک تیسری حیثیت وکالت کی ہے کہ ووٹر امیدوار کو پورے حلقہ کا نمائندہ اور وکیل بناتا ہے، اس صورت میں ظاہر ہے کہ جس کو وکیل بنایا جاتا ہے وہ قابل و امانت دار ہونا چاہیے، چناں چہ جب ہم ذاتی معاملات میں کسی کو وکیل بناتے ہیں تو ان دونوں باتوں کو دیکھ لیتے ہیں، ایک یہ کہ وہ کام کی صلاحیت و قابلیت رکھتا ہے یا نہیں؟ دوسرے یہ کہ وہ امانت دار بھی ہے یا نہیں؟ غالباً ہدایہ میں اسی کی طرف اشارہ ان الفاظ سے کیا گیا ہے، وکالت کے باب میں شرائط بتاتے ہوئے صاحب ہدایہ، قدوری کے یہ الفاظ نقل فرماتے ہیں:

”و یشرط ان یکون الوکیل ممن یعقل العقد و یقصده.“
(شرط ہے کہ وکیل ان لوگوں میں سے ہو، جو معاملہ کو سمجھتے اور اس کا ارادہ کرتے ہوں۔)(۱)

اس میں وکیل کی دو شرطیں بیان کی گئی ہیں، ایک یہ کہ وہ معاملہ کو سمجھتا ہو، اس میں قابلیت وصلاحیت کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرے یہ کہ وہ معاملہ متعلقہ کا ارادہ کرتا ہو، اس کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ معاملہ اس طرح کرے، جس سے نتیجہ برآمد ہوتا ہو، محض کھیل تماشہ کر کے گزارنے والا نہ ہو۔ (۲)

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ معاملہ کو نتیجہ تک پہونچانے کا ارادہ رکھتا ہو، اس میں میری ناقص سمجھ کے مطابق اشارہ ہے، وکیل کی دیانت وامانت کی طرف۔ ویسے بھی یہ دوشرطیں ایسی ہیں جن کا وکیل میں ہونا عقلاً بھی ضروری ہے اور لوگ عام طور پر اسی کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں۔

جب ذاتی معاملات میں اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے تو ملی وقومی مسائل میں، اس کی طرف توجہ دینا، کس قدر ضروری ہوگا؟ جب کہ ذاتی معاملات کی اچھائی و برائی ذات تک محدود ہوتی ہے اور ملی وقومی مسائل کی اچھائی و برائی کا اثر پوری قوم و ملت پر پڑتا ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ جس امیدوار کے حق میں ووٹ دینا ہو اس کے بارے میں پہلے معلوم کرلیا جائے کہ وہ سیاسی سمجھ بوجھ اور معاملہ فہمی کی صلاحیت اور ملی مسائل کے حل کرنے کی قابلیت رکھتا ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ نیت وارادہ محض سیاسی کھیل کھیلنے کا ہے یا امانت ودیانت داری کے ساتھ ملی مسائل کو حل کرنے کا بھی ہے؟

---

(۱) ھدایہ: ۳/۱۶۳

(۲) بحر الرائق: ۷/۱۴۲

تاکہ قوم وملت کے حقوق کی پامالی کے ہم ذمہ دار نہ بنیں۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے اسی کو ذکر فرمایا ہے:

''اگر یہ وکالت اس (ووٹر) کے کسی شخص کے حق کے متعلق ہوتی اور اس کا نفع نقصان صرف اسی کی ذات کو پہونچتا، تو اس کا یہ خود ذمہ دار ہوتا؛ مگر یہاں ایسا نہیں؛ کیوں کہ یہ وکالت ایسے حقوق کے متعلق ہے، جن میں اس کے ساتھ پوری قوم شریک ہے۔ اگر کسی نا اہل کو اپنی نمائندگی کے لیے ووٹ دے کر کامیاب بنایا، تو پوری قوم کے حقوق کو پامال کرنے کا گناہ بھی اس ووٹر کی گردن پر رہا۔''(۱)

ووٹ کی ایک اور حیثیت

میں کہتا ہوں ووٹ کی ایک اور چوتھی حیثیت بھی ہے اور وہ ہے امداد و تعاون کی حیثیت کہ ووٹر امیدوار کو ووٹ دے کر گویا اپنا تعاون اور سپورٹ پیش کرتا ہے اور تعاون کے سلسلے میں قرآنی اصول یہ ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾ (المائدۃ: ۲)

(نیکی و پرہیزگاری کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد کیا کرو اور گناہ و ظلم میں مدد نہ کیا کرو۔)(۲)

معلوم ہوا کہ امیدوار ملک وملت کے حق میں فلاح و بہبودی کے لئے کام کرنے والا ہو تو اس کو ووٹ دیکر اس کا تعاون کرنا چاہئے لیکن ظلم وفساد کرنے والا اور کرانے

(۱) جواھر الفقه: ۲/۲۹۳

(۲) ترجمہ مولانا محمد فتح جالندھری

والا ہو یا لوگوں کے حقوق پامال کرنے والا ہو اور ملک وملت کے لیے خطرہ ہو تو اس کو ووٹ دینا حرام وناجائز ہے۔ ظالم امرا کے مددگاروں پر سخت وعیدیں آئی ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کہ عنقریب ایسے امراء ہوں گے کہ بہت سے لوگ ان کی حاشیہ برداری کریں گے جو ظلم کریں گے اور جھوٹ بولیں گے، پس جو شخص ان کے پاس جائیگا اور ان کی تصدیق کریگا اور ان کے ظلم پر ان کی مدد کرے گا وہ مجھ سے نہیں، میں اس سے نہیں۔ (۱)

معلوم ہوا کہ ظالموں کی مدد اور ان کا تعاون اور ان کی تصدیق یہ سب سخت حرام امور ہیں، ان کا مرتکب سخت وعید کا مستحق ہے۔ ظالموں کے سلسلے میں مدد کے یہ اقوال بھی ملاحظہ کیجئے تا کہ اس کی شدت کا پوری طرح احساس ہو:

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے نقل کیا ہے کہ حضرت سعید بن المصعب رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ظالموں کے مددگاروں کو دیکھ کر تمہاری آنکھیں نہ بھریں؛ مگر تمہارے دلوں کے انکار کے ساتھ، تا کہ تمہارے نیک اعمال حبط وباطل نہ ہو جائیں، یعنی اگر ان کو دیکھ کر انکار کے جذبات دل میں پیدا نہ ہوئے تو نیک اعمال کے حبط ہونے کا اندیشہ ہے۔

علامہ ذہبی رحمہ اللہ نے ہی حضرت مکحول تابعی رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا: کہ قیامت کے دن ندا دی جائیگی کہ ظالم اور ان کے مددگار کہاں ہیں؟ پس جس نے بھی ان ظالموں کے لئے لکھنے سیاہی پیش کی ہوگی یا دوات میں سیاہی ڈالی ہوگی یا قلم چھیل کر دیا ہوگا یا ایسا ہی کوئی کام کیا ہوگا جس سے ظلم پر اعانت ہوتی ہے ان سب کو جمع کیا جائیگا اور آگ کے بنائے ہوئے تابوت میں رکھ کر ان کو

(۱) الکبائر للذہبی: ۱۱۱تا۱۱۲

جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔(۱)

غرض یہ کہ ظالم امرا کی مدد و تعاون سخت حرام ہے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا کہ ووٹ دینا بھی ایک قسم کا تعاون ہے؛ لہذا جس کو ووٹ دیا جائے اس کے متعلق غور کر لیا جائے۔

ووٹ ڈالنے کا شرعی حکم

اب تک کی تفصیلات سے جہاں یہ واضح ہوا کہ ووٹ کی مختلف حیثیتیں ہیں، وہیں یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ووٹ ڈالنے کا کیا حکم ہے؟ اس کی توضیح یہ ہے کہ چوں کہ ووٹ میں ایک حیثیت شہادت کی ہے، تو جس طرح جھوٹی شہادت حرام ہے، اسی طرح سچی شہادت و گواہی دینا واجب ہے۔ قرآن میں متعدد جگہ اس کا ذکر آیا ہے اور سچی شہادت دینے کا حکم ہے۔ ایک جگہ ہے:

﴿كُونُوا قَوَّامِينَ لِلّٰهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ﴾ (المائدة : ۸)

دوسری جگہ فرمایا گیا:

﴿كُونُوا قَوّٰمِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ﴾ (النساء : ۱۳۵)

ان دونوں آیتوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے لئے انصاف و حق کے ساتھ گواہی دینے کے لئے کھڑے ہو جاؤ اور سورہ طلاق میں حکم ہے:

﴿وَ أَقِيمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ﴾ (الطلاق : ۲)

یعنی اللہ کے واسطے شہادت قائم کرو۔ ان سب آیات سے سچی شہادت کے اظہار کا حکم ظاہر ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض آیات میں سچی گواہی کو چھپانے کی مذمت کی گئی ہے۔

---

(۱) الكبائر للذهبي: ۱۱۲

چناں چہ فرمایا:

﴿وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ﴾

(البقرۃ : ۲۸۳)

(ترجمہ: شہادت کو نہ چھپاؤ اور جو شخص اس کو چھپاتا ہے اس کا دل گنہگار ہے۔)

معلوم ہوا کہ سچی شہادت کو چھپانا بھی حرام ہے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ ووٹ اس امیدوار کو دینا جو لائق و قابل ہو اور امانت دار ہو ضروری ہے اور شرعی فریضہ بھی ہے۔ اسی طرح ووٹ کی ایک حیثیت تعاون کی بھی ہے، لہٰذا اچھے اور امانت دار آدمی کا استعمال کرتے ہوئے اس کو ووٹ دینا ضروری ہے، کیوں کہ نیکی کے کام پر تعاون کا حکم دیا گیا ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ووٹ ایسے امیدوار کو دینا جس کو ہم نا قابل سمجھتے ہیں، نا جائز ہے۔ اور قابل انسان کو ووٹ دینا نہ صرف یہ کہ جائز ہے؛ بل کہ فریضہ شرعیہ ہے۔ چناں چہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ اوپر پیش کردہ آیات کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں، ان تمام آیات نے مسلمانوں پر یہ فریضہ عائد کر دیا کہ سچی گواہی سے جان نہ چرائیں، ضرور ادا کریں۔ (۱)

اس عبارت سے قبل صراحت کے ساتھ فرماتے ہیں:

"جس طرح قرآن وحدیث کی رو سے یہ واضح ہوا کہ نا اہل، ظالم، فاسق اور غلط آدمی کو ووٹ دینا گناہ عظیم ہے، اسی طرح ایک اچھے اور نیک آدمی کو ووٹ دینا ثواب عظیم ہے، بلکہ ایک فریضہ شرعی ہے۔" (۲)

---

(۱) جواھر الفقہ: ۲/۲۹۴

(۲) جواھر الفقہ: ۲/۲۹۳

سب امیدوار نا قابل ہوں تو کیا کریں؟

البتہ یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تمام امیدوار نا قابل ہوں اور کوئی بھی قابل اعتماد نہ ہو تو کیا کریں؟ یہ سوال ہمارے زمانے کے لحاظ سے نہایت ہی اہم ہے؛ کیوں کہ آج اکثر جگہ یہی بات نظر آتی ہے کہ امیدوار کسی جگہ بھی قابل اعتماد و اطمینان نہیں ہوتے حتیٰ کہ مسلم امیدواروں کی حالت بھی دوسروں سے کچھ مختلف نظر نہیں آتی تو کیا ایسی صورت حال کا تقاضہ یہ ہے کہ ووٹ سے دست کش ہو جائیں یا کچھ اور؟

اس سوال کا جواب حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے یہ دیا ہے کہ اگر کسی جگہ میں کوئی بھی امیدوار صحیح معنی میں قابل و دیانت دار نہ ہو؛ مگر ان میں سے کوئی ایک صلاحیت کار و خدا ترسی کے اصول پر دوسروں کی نسبت سے غنیمت ہو تو تقلیل شر و تقلیل ظلم کی نیت سے اس کو بھی ووٹ دے دینا جائز ہے؛ بل کہ مستحسن ہے۔ (۱)

اس کا مطلب یہ ہے کہ امیدواروں میں غور و فکر کریں کہ کون ملک و ملت کے لئے کم خطرہ ہے۔ اگر ایک بڑا ظالم ہے تو اور دوسرا اس سے کم ظالم، تو اس کو ووٹ دے دینا جائز ہے۔ اس کی تائید علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی ایک عبارت سے بھی واضح ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں:

"مع انه تو لية غير الاهل للضرورة اذا كان اصلح الموجود فيجيب مع ذٰلک العلى فى اصلاح الاحوال حتى يكمل فى الناس مالابد لهم منه من امور الولايات والامارات ونحوها". (۲)

---

(۱) جواهر الفقه: ۲/۲۹۴

(۲) فتاویٰ ابن تیمیه: ۲۸،۲۵۹

(باوجود یہ کہ نا اہل کو حاکم و ولی بنانا بہ ضرورت جائز ہے، جب کہ وہ موجودہ لوگوں میں سے غنیمت ہو؛ مگر اسی کے ساتھ اصلاح حالات کی کوشش کرنا ضروری ہے تاکہ ولایت وامارت وغیرہ کے معاملات جن کا ہونا ضروری ہے وہ لوگوں میں مکمل ہوجائیں۔)

علامہ کی اس عبارت سے دو باتیں معلوم ہوئیں، ایک یہ کہ نا اہل کو بھی حاکم بنانے کی اجازت ہے، جب کہ موجودہ اشخاص میں سے وہی غنیمت ہو، دوسرے یہ کہ نا اہل کو حاکم بنانے کے بعد اس بات کی کوشش رکھنا ضروری ہے کہ ولایت و امارت کے معاملات کو سنبھالنے کے لیے جن صفات وضروریات کی ضرورت ہے وہ لوگوں میں تکمیل پائیں تاکہ آئندہ قابل انسان اس کام کو سنبھال سکیں۔

ووٹ نہ دینا نقصان دہ ہے

اسی سے معلوم ہوا کہ انتخاب میں کسی ایسے شخص کو جو دوسروں کی نسبت غنیمت ہو ووٹ دینا چاہئے اور ایسا نہ کرنا نقصان دہ ہے؛ کیوں کہ جب صالح طبقہ ووٹ دینے سے گریز کرے گا تو جو لوگ دنیا دار ہوتے ہیں وہ اپنا ووٹ یا تو غلط استعمال کرتے ہیں یا غلط لوگوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں، جس کے نتیجہ میں ایسے نمائندے مقرر ہوکر آتے ہیں جو نہ قابلیت رکھتے ہیں، نہ دیانت وامانت کے قابل ہوتے ہیں۔ لہٰذا صالح طبقہ کو چاہئے کہ وہ صالح لوگوں کے حق میں ووٹ ضرور دیں۔

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”آج جو خرابیاں انتخابات میں پیش آرہی ہیں ان کی بڑی وجہ یہ ہے کہ عموما نیک صالح حضرات ووٹ دینے ہی سے گریز کرنے لگے، جس کا لازمی نتیجہ وہ ہوا جو مشاہدہ میں آرہا ہے کہ ووٹ عموماً ان لوگوں

کے آتے ہیں جو چند ٹکوں میں خرید لیے جاتے ہیں اور ان لوگوں کے ووٹوں سے جو نمائندے پوری قوم پر مسلط ہوتے ہیں وہ ظاہر ہے کہ کس قماش و کس کردار کے ہوں گے۔''(۱)

ووٹ بیچنا سخت حرام ہے

یہاں یہ فقہی مسئلہ بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ ووٹ چوں کہ شفاعت کی حیثیت بھی رکھتا ہے اور شہادت کی بھی اور دونوں پر کوئی معاوضہ لینا و دینا حرام ہے اور داخل رشوت ہے؛ اس لئے ووٹ پر بھی معاوضہ لینا و دینا حرام ہے اور رشوت میں داخل ہے۔ حدیث میں حضرت ابو امامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''جس نے کسی شخص کی سفارش کی اور اس نے اس پر اس کو ہدیہ دیا تو وہ اس نے قبول کر لیا تو وہ سود کے دروازوں میں سے ایک بڑے دروازے میں داخل ہو گیا۔''(۲)

معلوم ہوا کہ سفارش پر ہدیہ سود کے حکم میں ہے؛ بل کہ سود کی انتہائی قبیح صورت ہے، اسی طرح شہادت و گواہی کو بیچنا بھی حرام ہے اور رشوت میں داخل ہے جیسا کہ حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ نے جواہر الفقہ کے اسی مضمون میں نشان دہی فرمائی ہے۔(۳)

اور رشوت کا لین دین شریعت کی نظر میں نہایت ہی قبیح و شنیع فعل ہے جس پر

---

(۱) جواھر الفقہ: ۲/۲۹۴

(۲) ابو داؤد: ۲/۴۹۹

(۳) جواھر الفقہ: ۲/۴۹۵

سخت وعید بھی وارد ہوئی ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت لینے اور دینے والے پر لعنت فرمائی ہے۔ (۱)

لہٰذا کسی بھی مسلمان کو اپنا ووٹ بیچنا نہیں چاہئے، اس سے ہوسکتا ہے کہ کسی کی دنیا بن جائے؛ مگر بیچنے والے کی آخرت تباہ ہو جائے گی، یہ کون سی عقلمندی ہے کہ دوسروں کی دنیا سنوارنے کے لیے اپنی آخرت برباد کرنے تیار ہو جائے اور وہ بھی چند معمولی و حقیر ٹکوں کے عوض میں، ظاہر ہے کہ یہ عقلمندی نہیں؛ بل کہ بے وقوفی ہے۔

الغرض ووٹ اسلامی نقطہ نظر سے کئی حیثیات رکھتا ہے اور ہر حیثیت کے اعتبار سے مسلمان پر ضروری ہے کہ اسے خدا سے ڈر کر استعمال کرے اور صحیح مصرف میں استعمال کرے، ضائع نہ کرے، اس کو محض ہار جیت کا ایک کھیل سمجھ کر غلط و بے جا استعمال نہ کرے، یہ نہ صرف اپنی آخرت کی بربادی ہے؛ بل کہ دنیا میں اپنی قوم اور ملک وملت کی بربادی کا باعث بھی ہے۔

ہم کس پارٹی کو ووٹ دیں؟

اب سب سے اہم سوال یہ ہے کہ ہم کس پارٹی کو ووٹ دیں؟ یہ ایسا سوال ہے کہ موجودہ حالات میں دوٹوک جواب دینا اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ دودھ کا پانی سے الگ کرنا، کیوں کہ آج تک کا پورا ریکارڈ کھلے طور پر اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ہر پارٹی نے محض اپنے مفادات کی خاطر قوم و ملک سے بڑے بڑے وعدے کیے؛ مگر جب ایفاء وعدہ کا نمبر آیا تو کسی نے بھی اس کا پاس ولحاظ نہ رکھا، پھر بی جے پی تو شروع ہی دن سے مسلمانوں سے بغض وعناد وعداوت رکھتی چلی آرہی ہے اور اس میں وہ بے باک طور پر سامنے آتی ہی رہی ہے۔ لہذا اس کے حق میں تو ووٹ دینے کا

(۱) ابوداؤد: ۲/۵۰۵، ترمذی: ۱/۲۴۸

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور یہاں مسلمانوں کو ہوشیار رہنا چاہئے کہ آج کل ووٹ کی خاطر بی جے پی کچھ نرم گوشہ دکھائی دے رہی ہے؛ مگر یہ سب سیاسی چالیں ہیں، بعض لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ بی جے پی نے اپنا نظریہ بدل دیا ہے؛ لہٰذا اب اس کو ووٹ دے کر دیکھ لینا چاہئے؛ مگر یہ صحیح نہیں؛ کیوں کہ یہ محض ایک سیاسی چال ہے جس کو سمجھنا مسلمانوں کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

اب رہی دوسری پارٹیاں، ان میں سے کانگریس کی نیت بھی صاف نہیں ہے، اس نے ہمیشہ مسلمانوں سے وعدہ کر کے ان کو دھوکہ ہی دیا ہے؛ بل کہ حقیقت یہ ہے کہ کانگریس کی کوکھ سے ایسے سپوتوں نے بھی جنم لیا ہے جو مسلم دشمنی میں پیش پیش رہے؛ اس لئے کلیۃً یہ فیصلہ کرنا بھی مشکل ہے کہ کانگریس کے حق میں ووٹ دیا جائے ، اب رہی دیگر جماعتیں اور پارٹیاں ان کا حال بھی اس سے کچھ مختلف نہ ہونے کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی خلاف ہے اس صورت حال میں کیسے کہا جائے کہ کانگریس کے حق میں ووٹ دیا جائے ان کو کوئی مضبوط پوزیشن بھی حاصل نہیں؛ اس لئے ان کو ووٹ دینا دیانت کے خلاف ہونے کے ساتھ ساتھ عقل کے بھی خلاف ہے، بس اتنا تو کہہ سکتے ہیں کہ بی جے پی کو ہرگز ووٹ نہ دیا جائے اور دوسری پارٹیوں کے متعلق اہل رائے حضرات میں سے بعض حضرات نے یہ رائے پیش کی ہے کہ جس علاقہ میں جس امیدوار کی اچھی پوزیشن ہو اس کو ووٹ دیا جائے اور جس کی پوزیشن اچھی نہ ہو اس کو ووٹ دیکر اپنا ووٹ ضائع نہ کرے۔ بعض حضرات نے یہ رائے تجویز کی ہے کہ کانگریس اگر چہ اپنے چہرے پر ہزار داغ رکھتی ہے تاہم اس کا منشور سیکولر ہے اور آئندہ اس کے اندر صلاحیت کے امکانات ہیں؛ لہٰذا کانگریس ہی کو ہر جگہ ووٹ دیا جائے؛ کیوں کہ مختلف پارٹیوں کو ووٹ دینے سے وہی مخلوط

حکومت بنے گی جس کی ناکامی کا تجربہ کیا جا چکا ہے اور بحیثیت پارٹی کے کانگریس کے سوا اس کے قابل نہیں ۔اور غالبا یہی رائے مناسب معلوم ہوتی ہے۔

بہ ہر حال مسلمانوں کو اپنا ووٹ ضائع نہ کرنا چاہئے اور ہر جگہ کے لوگ اپنے اپنے علاقہ کے اہل رائے حضرات سے مشورہ کر کے اس سلسلے میں قدم اٹھائیں اور ہر جگہ کے اہل رائے حضرات بھی دوسروں کی رہنمائی کا کام پوری تندہی و دلچسپی کے ساتھ کریں تو یہ ووٹ نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔

کرسی پر نماز
کی فقھی تحقیق

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض حال

الحمد لولیه و الصلاۃ علی نبیه و علی آله و أصحابه أجمعین ،

أما بعد:

آج کل مساجد میں کرسیوں کا رواج عام ہو رہا ہے اور لوگ عذر سے یا بلا عذر کے کرسیوں کو نماز کے لیے استعمال کر رہے ہیں اور واقعہ یہ ہے کہ کرسی پر نماز پڑھنے کا رواج ابھی ابھی چند سالوں سے شروع ہوا ہے، اس سے پہلے بھی لوگ بیمار ہوتے تھے اور اعذار ان کو بھی لاحق ہوتے تھے؛ مگر کبھی لوگوں کو کرسی پر نماز کی نہیں سوجھی۔

اکثر دیکھنے میں آیا ہے اور سنا بھی جاتا ہے کہ لوگ اچھے خاصے ہیں، چلنے پھرنے، اٹھنے بیٹھنے کی قوت پوری طرح رکھتے ہیں اور اپنے گھروں سے چل کر آتے ہیں؛ مگر نماز کے وقت خود ہی کرسی کھینچ کر اس پر نماز پڑھتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس بات کو سمجھنے کے لیے کافی ہے، کہ لوگوں میں تکاسل و تغافل ہے اور نماز کی اہمیت سے وہ بے خبر ہیں؛ لہٰذا ان کو توجہ دلانے کی ضرورت ہے۔

اور اس سے انکار نہیں کہ بعض اللہ کے بندے واقعی عذر اور شدید مجبوری میں کرسیوں کا استعمال کرتے ہیں اور ان کا یہ عذر شرعی و معقول ہوتا ہے اور آج کل قویٰ کی کمزوریوں اور نئی نئی قسم کی بیماریوں نے اصحابِ اعذار کی بھی بہتات کر دی ہے۔

الغرض ایک جانب دین سے غافل اور لاپرواہ لوگ ہیں، جو بلا وجہ و بلا عذر محض

تن آسانی ولاپرواہی سے اور غفلت وسستی کی بنا پر محض شوقیہ یا فاخرانہ طور پر نماز کے لیے کرسیوں کا استعمال کرنے لگے ہیں، تو دوسری جانب ان کی بھی بڑی تعداد پائی جاتی ہے، جن کے دلوں میں اللہ کا ڈر وخوف اور احکامِ الٰہی کی عظمت وجلالت موجود ہے اور وہ بھی کرسیوں کا استعمال کرتے ہیں؛ مگر اس وجہ سے کہ وہ واقعی معذور ومجبور ہیں۔

اس صورتِ حال میں علما ومفتیانِ کرام کی ذمے داری ہے کہ وہ امت کو اس سلسلے میں صحیح وغلط اور اچھے وبرے کی تمیز بتائیں اور شریعت کی روشنی میں اس کے احکام کو واضح کریں اور شریعت کے وصفِ امتیازی ''اعتدال'' کو پیش نظر رکھتے ہوئے پہلی قسم کے لوگوں کی بے اعتدالیوں پر تنبیہ کے ساتھ ساتھ واقعی عذر رکھنے والوں کے لیے شریعت کی عطا کردہ سہولتوں کو پیش کریں؛ تاکہ اصحابِ اعذار ان سے منتفع ہوسکیں۔

زیرِ نظر تحریر اسی مسئلے کی تحقیق کے لیے لکھی گئی ہے اور اس میں ہم نے اس کے دونوں پہلوؤں کو واضح کیا ہے؛ تاکہ افراط وتفریط کی راہوں سے الگ ''اعتدال'' کے راستے پر قائم رہیں۔ واللہ اعلم۔

محمد شعیب اللہ خان
(الجامعہ الاسلامیہ مسیح العلوم)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

محورِ اوّل: بلا عذر کرسی پر نماز نا جائز ہے

کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کے بارے میں ہماری بحث کے تین محور ہیں: ایک یہ کہ بلا عذر کرسی پر نماز کا حکم، دوسرے عذر معقول کی وجہ سے کرسی پر نماز کا جواز اور اس کے شرائط و قیود اور تیسرے کرسی پر عذر کی وجہ سے جواز کی دلیل۔

لہٰذا سب سے پہلی بات ''کرسی پر بلا عذر نماز کے حکم'' کے بارے میں عرض ہے، کہ بلا عذر معقول کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا نا جائز ہے اور اس کی کئی وجوہات ہیں۔

عدمِ جواز کی پہلی وجہ

ایک وجہ یہ ہے کہ نماز میں قیام و رکوع و سجدہ، فرائض میں داخل ہیں اور بلا عذر ان میں سے کسی کو چھوڑ دینے سے نماز نہیں ہوتی اور کرسی پر نماز پڑھنے والا، ان تمام فرائض کو چھوڑ دیتا ہے، قیام کی جگہ کرسی پر بیٹھتا ہے اور رکوع و سجدہ دونوں کو چھوڑ کر محض اشارے سے ان کو ادا کرتا ہے، تو اس کی نماز کیسے ہو سکتی ہے؟ لہٰذا جو لوگ بلا عذر معقول کرسی پر نماز پڑھتے ہیں، وہ اپنی نمازوں کو ضائع کر رہے ہیں اور یہاں یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم نے تو نمازیں پڑھی ہیں؛ لیکن جب اللہ کے یہاں پہنچیں گے، تو ان کے نامۂ اعمال اس سے خالی ہوں گے؛ لہٰذا ایسے لوگ ذرا ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ اگر قیامت کے دن نماز کی محنت کرنے کے باوجود ہمارا نامۂ اعمال نماز سے خالی ہو تو کیا ہوگا؟!!

عدمِ جواز کی دوسری وجہ

دوسرے یہ کہ نماز دراصل اللہ تعالیٰ کی عظیم ہستی کے سامنے بندے کی بندگی، عاجزی وانکساری کا نام ہے، اللہ کی جلالت کے روبرو خدا کے غلام کی تواضع وفروتنی سے عبارت ہے اور کرسی پر نماز پڑھنے کی صورت میں یہ مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے؛ کیوں کہ کرسی پر بیٹھنے کی حالت عموماً عاجزی وانکساری کی نہیں ہوتی؛ بل کہ ایک حد تک یہ متکبرانہ ہوتی ہے؛ نیز اگر متکبرانہ نہیں ہوتی، تب بھی عرفِ عام میں بڑوں کے سامنے کرسی پر بیٹھنا بے ادبی سمجھا جاتا ہے، یا کم از کم خلافِ ادب خیال کیا جاتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ اللہ عزوجل کے دربارِ عالی شان ودرگاہِ بے نیاز میں بلا وجہ کرسی پر بیٹھنا اچھا معلوم ہوتا ہے؟ لہٰذا یہ صورت نماز کی مقصدیت کے خلاف ہونے کی وجہ سے بھی ناجائز ہے۔

عدمِ جواز کی تیسری وجہ

تیسرے یہ کہ کرسیوں پر بیٹھ کر عبادت کرنے میں غیروں سے مشابہت پائی جاتی ہے؛ چناں چہ عیسائیوں میں رواج ہے کہ وہ اپنے چرچوں میں کرسیوں پر عبادت کرتے ہیں اور یہ بات اسلام کی اہم تعلیمات میں سے ہے کہ غیروں کی مشابہت اختیار نہ کیا جائے۔

ایک حدیث میں ہے رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

« من تشبه بقوم فهو منهم. »(۱)

(جس نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی، وہ ان ہی میں سے ہوگا۔)

---

(۱) أبو داود:۴۰۳۳

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"ليس منا من تشبه بغيرنا، لاتشبهوا باليهود و لا بالنصارىٰ؛ فإن تسليم اليهود الإشارة بالأصابع، وتسليم النصارىٰ الإشارة بالأكف." (۱)

(وہ ہم میں سے نہیں ہے جو غیروں سے مشابہت اختیار کرے، تم یہود سے مشابہت نہ کرو اور نہ نصاریٰ سے، یہود کا سلام انگلیوں کے اشارے سے اور نصاریٰ کا سلام ہتھیلیوں کے اشارے سے ہوتا ہے۔)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کی روایت میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

"جزوا الشوارب وأرخوا اللحىٰ، خالفوا المجوس" (۲)

(مونچھوں کو کٹاؤ اور داڑھی کو بڑھاؤ اور مجوسیوں کی مخالفت کرو۔)

ان احادیث سے معلوم ہوا کہ اسلام غیروں سے مشابہت اختیار کرنے کے سلسلے میں کس قدر حساس واقع ہوا ہے؟ جب اسلامی شریعت لباس و پوشاک اور بال وکھال تک میں غیروں کی مشابہت کو پسند نہیں کرتا، تو نماز جیسی اہم ترین عبادت اور مؤمن کی زندگی کے بنیادی مقصد کے بارے میں یہ کیسے گوارہ کرسکتا ہے، کہ وہ غیروں کے طور وطریقے کے مطابق انجام دیا جائے؟

لہٰذا بلا عذر کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنا ناجائز ہے اور اس طرح نماز پڑھنے والوں کی نماز بالکل بھی نہیں ہوتی اور اس طرح پڑھی ہوئی نمازیں ان کے ذمے علیٰ حالہ باقی رہتی ہیں۔

---

(۱) الترمذي:۲۲۹۵

(۲) مسلم:۶۲۶، معرفة السنن للبيهقي:۱/۴۴۰، مسند أبي عوانة:۱/۱۶۱

محورِ دوم: عذرِ معقول کی وجہ سے کرسی پر نماز جائز ہے

دوسری بحث یہ ہے کہ عذر ہونے کی صورت میں کرسی پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کا کیا حکم ہے؟ کیا کسی بھی عذر و تکلیف میں کرسی کا استعمال نماز کے لیے جائز نہیں؟ یا کچھ شرائط و قیود کے ساتھ جائز بھی ہے؟

مشقت سے احکام میں تخفیف

یہ جاننے سے پہلے ایک اصولی بات سمجھ لینی چاہیے؛ تاکہ بات واضح و صاف طریقے پر سامنے آجائے۔ وہ یہ کہ ہماری شریعت نہایت معتدل ہے، جس میں نہ افراط ہے، نہ تفریط؛ اس لیے یہ بات تو یقینی ہے کہ عذر و تکلیف کی صورت میں اس میں تخفیف و سہولت دی جاتی ہے۔

چناں چہ شریعت کے اصول میں سے ایک اصول یہ ہے کہ اس نے بیماری و تکلیف کو تخفیفِ احکام کا سبب مانا ہے۔

اسی کو فقہا یوں بیان کرتے ہیں:

"المشقة تجلب التيسير" (۱)

(مشقت آسانی کا باعث بنتی ہے۔)

اور یہ قاعدہ فقہیہ متعدد قرآنی و حدیثی نصوص سے اخذ کیا گیا ہے، جیسا کہ فقہا نے ثابت کیا ہے۔ اور علما نے لکھا ہے کہ عبادات میں تخفیف کے سات اسباب ہیں، اور اس میں سے ایک مرض کو بھی لکھا ہے۔ (۲)

مشقت کے درجات و احکام

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ ہر قسم کی تکلیف و مرض اس سے مراد نہیں؛ بل کہ وہ مرض

(۱،۲) الأشباه و النظائر لابن نجيم:۱/۷۵، الأشباه و النظائر للسيوطي:۱/۱۶۰

وتکلیف جس سے انسان کو شدید پریشانی لاحق ہوتی ہے؛ ورنہ تھوڑی بہت تکلیف تو ہر کام میں ہوتی ہے، حتیٰ کہ خود نماز پڑھنا بھی ایک مشکل کام ہے، اسی طرح بعض امراضِ خفیفہ میں بھی تھوڑی بہت مشقت ہوتی ہے۔ جیسے: سر درد، یا معمولی زخم کی تکلیف وغیرہ؛ مگر ان کی وجہ سے تخفیف نہیں دی جاتی۔

اسی لیے فقہا نے لکھا ہے کہ مشقت دو قسم پر ہے: ایک وہ مشقت، جو عبادت سے اکثر و بیشتر جدا نہیں ہوتی۔ جیسے: وضوو غسل میں سردی کی مشقت اور طویل دن اور سخت گرمی میں روزے رکھنے کی مشقت؛ پس اس قسم کی مشقت کا عبادات کے ساقط ہونے میں کسی بھی وقت اعتبار نہیں اور رہی وہ مشقت، جو غالب طور پر عبادت سے جدا ہوتی ہے، اس کے کئی مراتب ہیں: پہلی بڑی اور پریشان کرنے والی مشقت ہے۔ جیسے جان پر یا اعضا پر، یا اعضا کے متعلق فوائد پر خوف کی مشقت، پس یہ مشقت موجبِ تخفیف ہے۔ دوسری معمولی وہلکی مشقت۔ جیسے: انگلی میں معمولی درد ہونا، یا سر میں معمولی سا چکر ہونا، یا معمولی سی طبیعت کی خرابی، پس اس کا کوئی اثر نہیں اور نہ اس کا کوئی لحاظ ہوتا ہے اور تیسری ان دو کی درمیانی مشقت۔ جیسے: رمضان میں بیمار آدمی روزہ رکھنے سے مرض کے بڑھ جانے کا خوف کیا، یا بیماری سے دیر سے صحت یاب ہونے کا اندیشہ کیا، پس اس کے لیے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ (۱)

الغرض مشقت و بیماری اسبابِ تخفیف میں سے ہے؛ مگر ہر تکلیف و بیماری نہیں؛ بل کہ وہ جس میں انسان کو نا قابلِ برداشت تکلیف پیش آئے اور وہ اس کو سہار نہ سکے۔

---

(۱) الأشباہ و النظائر لابن نجیم:۱/۸۲، الأشباہ و النظائر للسیوطي:۱/ ۱٦۸

شریعت میں معذور کے لیے سہولت اور اس کی شرائط

جب یہ تفصیل معلوم ہوگئی، تو اب قابلِ غور بات یہ ہے کہ کرسی پر نماز کے جواز کے لیے کیا اور کون سے اعذار معتبر ہیں اور وہ کیا اور کون سے اعذار ہیں، جو معتبر نہیں؟ اس کے جواب سے پہلے اصحابِ اعذار کے لیے حضراتِ فقہائے کرام کے لکھے ہوئے مسائل پر ایک اجمالی نظر ڈال لیں:

(۱) قیام فرض ہے؛ لہٰذا جو شخص قیام کرسکتا ہے اس کو کھڑے ہو کر نماز پڑھنا فرض ہے اور جو کسی عذر کی وجہ سے کھڑا نہیں ہوسکتا، تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر وہ پورا وقت کھڑا نہیں ہوسکتا؛ لیکن کچھ دیر قیام کرسکتا ہے، تو وہ کچھ دیر قیام کرے اور بعد میں بیٹھ جائے، اگر اس نے کچھ دیر قیام پر قدرت کے باوجود کچھ دیر قیام نہیں کیا اور شروع ہی سے بیٹھ کر نماز پڑھ لی، تو اس کے لیے یہ جائز نہیں۔

"العناية شرح الهداية" میں ہے کہ جب بعض قیام پر قادر ہوا، گرچہ کہ ایک آیت یا ایک مرتبہ "الله أكبر" کہنے کے برابر نہ کہ پورا، تو امام جعفر ہندوانی رَحِمَهُ اللّٰهُ نے کہا کہ اس کو حکم دیا جائے گا کہ جس قدر کھڑا ہوسکتا ہے، وہ کھڑا ہو، پس جب قیام کرنے سے عاجز آجائے، تو پھر بیٹھ جائے اور اگر ایسا نہیں کیا، تو مجھے خوف ہے کہ اس کی نماز فاسد ہوجائے گی، یہی مذہب ہے اور ہمارے اصحاب سے اس کے خلاف کوئی بات مروی نہیں ہے؛ کیوں کہ طاعت بہ قدر طاقت ہوتی ہے۔(۱)

"درر الحكام" میں ہے کہ اگر بعض قیام پر قدرت رکھتا ہو، تو وہ قیام کرے، پس وہ قیام کے ساتھ تکبیر کہہ سکتا ہو یا تکبیر اور تھوڑی قراءت کرسکتا ہو، تو اس کو قیام کا حکم دیا جائے گا، شمس الائمہ رَحِمَهُ اللّٰهُ نے کہا کہ یہی صحیح مذہب (احناف) ہے اور

(۱) العناية شرح الهداية: ۲/۳۱۴

اگراس نے قیام کوترک کردیا،تو خوف ہے کہ اس کی نماز نہیں ہوگی۔(۱)

اور ''الدر المختار''،میں ہے کہ اگرکوئی تھوڑی دیر بھی کھڑے ہونے پرقادرہو،تووہ اپنی طاقت کے بہ قدر لازمی طور پر کھڑا ہو،اگرچہ ایک آیت یا ایک تکبیر کی مقدار ہی کیوں نہ ہو؛اس لیے کہ بعض کوکل پر قیاس کیا گیا ہے۔(۲)

(۲)اور جو شخص خود تو نہیں کھڑا ہوسکتا؛ لیکن کسی دوسرے آدمی یا کسی چیز کو سہارا دے کر کھڑا ہوسکتا ہے، تو اس کو بھی کسی کے سہارے سے کھڑا ہونا لازم ہے، اس کو بھی بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں اور اگر کوئی خود بھی نہیں کھڑا ہوسکتا اور نہ کسی کے سہارے سے کھڑا ہوسکتا ہے؛ اس کے لیے جائز ہے کہ وہ بیٹھ کر نماز پڑھے۔

علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے ''فتح القدیر''،میں اور علامہ البابرتی رحمہ اللہ نے ''عنایۃ شرح ھدایۃ'' میں لکھا ہے:

''اگر ٹیک لگا کر قیام کرسکتا ہو،تو شمس الائمہ نے کہا کہ صحیح یہ ہے کہ وہ کھڑے ہوکر ٹیک کے ساتھ نماز پڑھے گا اور اس کے سوا جائز نہ ہوگا، اسی طرح اس صورت میں بھی کہ اگر عصا پر ٹیک لگانے یا خادم ہو،تو اس پر ٹیک لگانے سے قیام کی قدرت مل جائے۔(۳)

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے کہ اگر ٹیک لگا کر قیام کرسکتا ہو،تو صحیح یہ ہے کہ وہ کھڑے ہوکر ٹیک کے ساتھ نماز پڑھے گا اور دوسری صورت اس کے لیے جائز نہ ہوگی ، اسی طرح اس صورت میں بھی ہے کہ اگر عصا پر ٹیک لگانے یا خادم ہو،تو اس

---

(۱) درر الحکام:۲/۸۷

(۲) الدر المختار مع رد المحتار:۲/۹۷

(۳) فتح القدیر:۲/۳،العنایۃ:۲/۳۱۴ و اللفظ لہ

پر ٹیک لگانے سے قیام کی قدرت مل جائے، تو وہ کھڑا ہوگا اور ٹیک لگائے گا۔[1]

(۳) قیام کر تو سکتا ہے؛ مگر اس سے شدید تکلیف ہوتی ہے، جو نا قابلِ برداشت ہے یا بیماری و عذر کے بڑھ جانے کا غالب گمان ہے، تو اس کے لیے بھی یہی تفصیل ہے کہ اگر کسی کے سہارے کھڑے ہونے سے تکلیف نہیں ہوتی، تو وہ کسی کے سہارے قیام کرے اور پورا وقت کھڑے ہونے سے تکلیف ہوتی ہے؛ مگر کسی کا سہارا لینے سے بقیہ وقت قیام میں تکلیف نہیں ہوتی، تو کچھ دیر قیام کرے اور باقی وقت کسی کے سہارے سے قیام کرے اور اگر کسی کو ہر صورت میں شدید تکلیف ہوتی ہے، تو وہ بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے۔

''درر الحکام'' میں ہے:

''جب قیام کرنا بیماری کی وجہ سے متعذر و مشکل ہو جائے یا کھڑے ہونے سے بیماری کے بڑھ جانے کا خوف ہو یا بیماری کے دیر سے درست ہونے کا اندیشہ ہو یا سر چکرانے کا ڈر ہو یا کھڑے ہونے سے شدید تکلیف محسوس کرے تو بیٹھ جائے۔''[2]

علامہ شامی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

'' أراد بالتعذر التعذر الحقيقي؛ بحيث لو قام سقط... أو الحكمي ؛ بأن خاف زيادته أو بطء برئه بقيامه أو دوران رأسه أو وجد لقيامه ألماً شديداً صلى قاعداً.''[3]

---

(۱) فتاوی ہندیہ:۱/۶۳۱، ردالمحتار:۲/۹۷

(۲) درر الحکام:۲/۸۷

(۳) درالمختار و ردالمحتار:۲/۹۶

(مصنف نے عذر سے عذرِ حقیقی مراد لیا ہے، اس طور پر کہ کھڑا ہو؛ تو گر جائے، یا حکمی مراد لیا ہے؛ اس طور پر کہ اسے بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو، یا کھڑے ہونے کی وجہ سے صحت یابی میں تاخیر کا اندیشہ ہو، یا سر چکرانے کا اندیشہ ہو، کھڑے ہونے میں سخت تکلیف محسوس کرے، تو بیٹھ کر نماز پڑھے۔)

یہ تو شدید تکلیف کا حکم ہے اور اگر کسی کو تکلیف تو ہوتی ہے؛ مگر تھوڑی بہت جو قابل برداشت ہے، تو اس کا کوئی اعتبار نہیں اور اس کو بیٹھ کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔

''فتاویٰ ہندیہ'' میں ہے:

''فإن لحقه نوع مشقة لم يجز ترک ذالک القيام.''(۱)

(اگر کھڑے ہونے میں معمولی تکلیف لاحق ہو، تو قیام کا چھوڑنا جائز نہیں۔)

اور علامہ ابن الہمام رحمہ اللہ نے ''فتح القدیر'' میں علامہ زیلعی رحمہ اللہ نے'' تبیین الحقائق'' میں اور علامہ المیدانی رحمہ اللہ نے ''اللباب في شرح الكتاب'' میں لکھا ہے:

''فإن لحقه نوع مشقة لم يجز ترک القيام بسببها.''(۲)

(اگر کھڑے ہونے میں معمولی تکلیف لاحق ہو؛ تو اس کی وجہ سے قیام کا چھوڑنا جائز نہیں۔)

(۴) جو شخص اوپر کی تفصیل کے مطابق کسی بھی طرح قیام نہیں کر سکتا اور بیٹھ کر

---

(۱) فتاویٰ ہندیہ:۱/۱۳۶

(۲) فتح القدير:۲/۳،تبيين الحقائق:۲/۴۵۶،اللباب:۱/۴۹

نماز پڑھ سکتا ہے، تو وہ زمین پر بیٹھ کر نماز ادا کرے اور اگر خود بیٹھ نہیں سکتا؛ لیکن کسی دوسرے شخص یا چیز جیسے دیوار وغیرہ کے اوپر ٹیک لگا کر بیٹھ سکتا ہے، تو اس کو کسی کے اوپر ٹیک لگا کر بیٹھنا ضروری ہے۔

''المحیط البرهاني'' میں ہے:

''امام محمد رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''الأصل'' میں یہ صورت ذکر نہیں کی، کہ اگر ایک شخص ٹھیک سے نہیں بیٹھ سکتا اور ٹیک لگا کر یا کسی دیوار یا انسان وغیرہ پر سہارا لے کر بیٹھ سکتا ہو، تو امام شمس الائمہ حلوانی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ ہمارے مشائخ نے کہا کہ اس کے لیے کسی کے سہارے سے یا ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے نماز پڑھے، تو جائز ہے اور لیٹ کر پڑھے تو جائز نہیں۔''(۱)

اور فتاوی عالمگیری میں ہے:

''وإذا لم يقدر على القعود مستوياً وقدر متكئاً أو مستندا إلى حائط أو إنسان، يجب أن يصلي متكئا أو مستندا ، ولايجوز له أن يصلي مضطجعاً.'' (۲)

(اور جب ٹھیک سے بیٹھنے پر قادر نہ ہو؛ بل کہ ٹیک لگا کر یا کسی دیوار یا انسان کا سہارا لے کر بیٹھنے پر قادر ہو، تو ضروری ہے کہ وہ نماز پڑھے ٹیک لگا کر یا سہارا لے کر اور اس کے لیے لیٹ کر نماز پڑھنا جائز نہیں۔)

(۵) اور جو شخص بیٹھ کر نماز پڑھ سکتا ہے اور رکوع وسجدہ بھی کرسکتا ہے، وہ بیٹھ

---

(۱) المحیط البرهاني:۲/۲۷۲

(۲) فتاویٰ ہندیہ:۱/۱۳۶

کر ہی رکوع وسجدہ کرلے؛ لہٰذا جو شخص زمین پر بیٹھ کر رکوع وسجدے کے ساتھ نماز ادا کرسکتا ہے، اس کو رکوع وسجدہ کرنا فرض ہے؛ کیوں کہ وہ اس پر قادر ہے اور یہ دونوں بھی نماز میں فرض ہیں۔

امام قدوری رَحِمَهُ اللّٰهُ فرماتے ہیں:

”إذا تعذر على المريض القيام صلى قاعداً يركع ويسجد.“ (۱)

(جب مریض پر قیام دشوار ہو جائے، تو بیٹھ کر رکوع وسجدہ کرتے ہوئے نماز پڑھے۔)

”الاختيار لتعليل المختار“ میں ہے:

جب قیام سے عاجز ہو جائے یا قیام سے مرض بڑھ جانے کا خوف ہو تو بیٹھ کر رکوع وسجدہ کرتے ہوئے نماز ادا کرے۔ (۲)

اس سے معلوم ہوا کہ بیٹھ کر نماز پڑھنے والا اگر رکوع وسجدے پر یا ان میں سے ایک پر قادر ہے، تو اس کو بیٹھ کر رکوع وسجدہ کرنا لازم ہے؛ ورنہ اس کی نماز نہیں ہوگی۔

(۶) جو شخص زمین پر بیٹھ سکتا ہے؛ مگر رکوع وسجدے کے لیے جھک نہیں سکتا، وہ بیٹھ کر رکوع وسجدے کے لیے اشارہ کرلے، اسی طرح جو شخص رکوع وسجدے کے لیے جھکنے میں شدید تکلیف محسوس کرتا ہے، جو نا قابلِ برداشت ہو، تو وہ بھی رکوع وسجدے کا اشارہ کرسکتا ہے۔

فقہا رحمہم اللہ نے لکھا ہے:

---

(۱) الجوهرة: ۱/۳۱۱

(۲) الاختيار لتعليل المختار: ۱/۸۲

"فإن لم يستطع الركوع والسجود أومأ إيماءً." (۱)

(پس اگر رکوع وسجود نہ کر سکے، تو اشارہ سے کرلے۔)

(۷) اور اگر کوئی شخص اس قدر بیمار ہے کہ وہ بیٹھ کر رکوع وسجدہ نہیں کرسکتا، تو اس کو چت لیٹ کر یا پہلو پر لیٹ کر اشارے سے نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور اس کو چاہیے کہ وہ سر سے رکوع وسجدے کا اشارہ کرے اور سجدے کا اشارہ رکوع کے اشارے سے زیادہ کرے۔

"الجوهرة" میں ہے:

"فإن لم يستطع القعود استلقىٰ على ظهره الخ "(۲)

(پس اگر بیٹھنے کی طاقت نہ ہو، تو پیٹھ کے بل لیٹ جائے۔)

اور "البحر الرائق" میں ہے:

"اگر بیٹھنا دشوار ہو جائے، تو چت لیٹ کر یا اپنے بازو پر لیٹ کر اشارے سے پڑھے۔"

اس تفصیل سے بیماروں ومعذوروں کو شریعت کی دی ہوئی سہولت اور اسی کے ساتھ اس کی شرائط کا بھی علم ہو گیا، جس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ ان فرائض کے ادا کرنے کی جس قدر طاقت وگنجائش ہے، اس قدر ان کو ادا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے، جہاں ممکن نہ ہو یا ممکن تو ہو؛ مگر زیادہ پریشانی وتکلیف ہوتی ہو، وہاں ان فرائض کو چھوڑنے کی اوپر کی تفصیل کے مطابق گنجائش ہے۔

کرسی پر نماز کا مسئلہ

اب سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی وجہ سے زمین پر بیٹھ کر نماز نہ پڑھ سکتا ہو؛

(۱) الجوهرة: ۱/۳۱۱، واللفظ له، البحر الرائق: ۲/۱۲۲

(۲) الجوهرة: ۱/۳۱۲

لیکن کرسی پر بیٹھ سکتا ہے، اس کا کیا حکم ہے؟

(۱) مثلاً ایک شخص کا ایکسیڈنٹ ہوا اور کمر میں راڈ داخل کی گئی ہے، جس کی وجہ سے وہ کرسی پر بیٹھ سکتا ہے؛ مگر جھک نہیں سکتا، بیٹھ نہیں سکتا اور رکوع یا سجدہ نہیں کر سکتا۔

(۲) ایک شخص اس قدر کمزور ہے کہ اٹھنا بیٹھنا اس کے لیے دشوار ہے، اگر اٹھتا بیٹھتا ہے، تو ناقابلِ برداشت تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ کرسی پر بیٹھ کر اپنے کام کاج کرتا ہے اور اسی میں نماز بھی پڑھ لیتا ہے۔

(۳) ایک شخص کو موٹاپے کی وجہ سے زمین پر بیٹھنے میں شدید تکلیف ہوتی ہے، اگر چہ وہ چل سکتا ہے اور قیام بھی کر سکتا ہے؛ مگر بیٹھ نہیں سکتا، لہٰذا کرسی پر ہی اس کو اپنے تمام دنیوی کام بھی کرنے پڑتے ہیں اور نماز بھی وہ اسی پر پڑھتا ہے۔

(۴) ایک شخص اس قدر کمزور یا بیمار ہے کہ زمین پر از خود نہیں بیٹھ سکتا اور بیٹھ گیا تو اٹھ نہیں سکتا؛ بل کہ اس صورت میں دو آدمیوں سے مدد لینی پڑتی ہے۔ اور بعض دفعہ کوئی ایسا خادم یا اعانت کرنے والا میسر نہیں ہوتا؛ لہٰذا وہ اس پریشانی کی وجہ سے کرسی پر ہی نماز پڑھ لیتا ہے۔

(۵) بعض بیماریاں ایسی ہوتی ہیں، جن میں ڈاکٹروں کی ہدایت ہوتی ہے کہ نیچے نہ بیٹھا جائے؛ ورنہ بیماری کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے، اس وجہ سے بھی کرسی پر نماز کی ضرورت کسی کو پیش آ سکتی ہے۔

ظاہر ہے ان تمام صورتوں اور اس طرح کی صورتوں میں عذر معقول موجود ہے اور اس کا اعتبار کرنا شرعاً بھی درست ہے؛ لہٰذا اس قسم کے اصحابِ اعذار کو کرسی پر نماز کی اجازت ہونی چاہیے؛ کیوں کہ اوپر خود فقہا کے کلام میں یہ ضابطہ ہم نے پڑھ

لیا ہے کہ طاعت بہ قدرِ طاقت ہوا کرتی ہے۔جب اس قسم کے اعذار میں نیچے بیٹھ کر نماز کی طاقت نہیں یا نیچے بیٹھنا بڑا مشکل ہے،تو کرسی پر پڑھنے کی اجازت ایک معقول بات بھی ہے اور اصولِ فقہیہ کی روشنی میں شرعی بات بھی ہے۔

لیکن اس جگہ وہی دو باتیں ذہن نشیں ہونی چاہئیں:ایک تو یہ کہ عذر موجود ہو،بلا عذر کرسی پر نماز پڑھنا گناہ بھی ہے اور اس کی وجہ سے نماز ہوتی بھی نہیں اور دوسری بات یہ کہ معمولی اور چھوٹا موٹا عذر نہیں ؛ بل کہ معقول و شرعاً معتبر عذر ہو،جس کا خلاصہ یہ ہے کہ زمیں پر بیٹھ کر نماز پڑھنے کی یا تو سکت و طاقت ہی نہ ہو یا طاقت تو ہو؛ مگر اس سے نا قابلِ برداشت تکلیف و درد ہوتا ہو یا زمین پر بیٹھنے سے بیماری و تکلیف کے بڑھ جانے کا اندیشہ ہو۔اس صورت میں کرسی پر نماز کی اجازت ہے۔

محورِ سوم:عذر سے کرسی پر نماز کے جواز کی دلیل

اب رہا یہ سوال کہ عذر کی وجہ سے کرسی پر نماز کے جواز کی دلیل کیا ہے؟اس مسئلے کی دلیل میں احقر کو ایک فقہی نظیر بھی الحمد للہ مل گئی ہے،جس سے اس مسئلے پر اچھی طرح روشنی پڑتی ہے۔وہ یہ کہ حضراتِ فقہا نے لکھا ہے کہ بعض صورتوں میں سواری کے جانور پر بیٹھے ہوئے بھی نماز کی گنجائش ہے۔مثلاً:

(۱) کسی جگہ زمین پر کیچڑ ہی کیچڑ ہو اور وہاں زمین پر اتر کر نماز نہیں پڑھی جا سکتی ،تو ایسی جگہ جانور ہی پر بیٹھ کر نماز پڑھی جا سکتی ہے۔

(۲) اسی طرح کسی کا جانور سرکش ہے،جس کی وجہ سے اس پر سوار ہونا کارے دارد؛ لہٰذا اگر اس سے اتر گئے،تو دوبارہ اس پر سوار ہونے میں مشکل پیش آئے گی، تو اس جانور ہی پر بیٹھ کر نماز پڑھ لینے کی گنجائش ہے۔

(۳) اسی طرح اگر جانور سے اترنے کی صورت میں کسی چور وڈاکو یا درندے کی

جانب سے جان کا خطرہ ہو، تو جانور پر بیٹھے ہوئے نماز جائز ہے۔

(۴) بوڑھا آدمی جانور پر سوار ہے، اگر اترے گا؛ تو دوبارہ بیٹھنا مشکل ہے، تو اس کو سواری ہی پر نماز کی اجازت ہے۔

(۵) کوئی بیمار ہے اور اس کی وجہ سے سواری سے اتر نہیں سکتا؛ تو اس کے لیے بھی جانور ہی پر سوار ہوتے ہوئے نماز جائز ہے۔

کرسی پر نماز کی فقہی نظیر

درج ذیل عبارات میں ان مسائل کا ذکر موجود ہے:

"الجوهرة النيرة" میں جانور پر نفل نماز جائز ہونے کے مسئلے کے ضمن میں "نفل نماز" کی قید کیوں لگائی ہے؟ اس کا فائدہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"لأن المكتوبة لا تجوز على الدابة إلا من عذر ، وهو أن يخاف من النزول على نفسه أو دابته من سبع أو لص ، أو كان في طين أو ردغة لا يجد على الأرض مكانا جافاً ، أو كانت الدابة جموحاً لو نزل لا يمكنه الركوب إلا بمعين أو كان شيخاً كبيراً لا يمكنه ولا يجد من يعينه فتجوز صلاة الفرض في هذه الأحوال كلها على الدابة." (۱)

(کیوں کہ بلا عذر جانور پر بیٹھ کر فرض نماز جائز نہیں ہوتی اور عذر یہ ہے کہ جانور سے اترنے سے کسی درندے یا چور کا اپنے اوپر یا جانور پر خوف ہو، یا گارا اور کیچڑ ہو، جس سے زمین پر کوئی سوکھی جگہ نہ پائے، یا جانور سرکش ہو کہ اگر سواری سے اترے، تو دوبارہ سوار ہونا بغیر کسی مدد

(۱) الجوهرة النيرة: ۱/۲۹۶

کے ممکن نہ ہو، یا بوڑھا آدمی ہو، جس کوسوار ہونا ممکن نہ ہواور کوئی سوار کرانے والا نہ ملے، تو ان تمام احوال میں جانور پر بیٹھے ہوئے فرض نماز جائز ہے۔)

اور یہی بات'' تبیین الحقائق ''میں ہے:

''و هي أن يخاف من النزول على نفسه أو دابته سبع أو لص ، أو كان في طين أو ردغة ، قال في المحيط : يغيب وجهه فيها ، لايجد مكانا جافاً ، أو كانت الدابة جموحاً لو نزل لا يمكنه ركوبها إلا بعناء و كان شيخاً كبيراً لايمكنه أن يركب فلا يجد من يعينه على الركوب فتجوز صلاة الفرض في هذه الأحوال كلها على الدابة.'' (۱)

(اور عذر یہ ہے کہ جانور سے اترنے سے کسی درندے یا چور کا اپنے اوپر یا جانور پر خوف ہو یا گارا اور کیچڑ ہو، جس میں چہرہ رکھنے سے اندر دھس جائے اور زمین پر کوئی سوکھی جگہ نہ پائے یا جانور سرکش ہو کہ اگر سواری سے اترے، تو دوبارہ سوار ہونا بغیر مشقت کے ممکن نہ ہو یا کوئی بوڑھا آدمی ہو، جس کو سوار ہونا ممکن نہ ہو اور کوئی سوار کرنے والا نہ ملے، تو ان تمام احوال میں جانور پر بیٹھے ہوئے فرض نماز جائز ہے۔)

'' البحر الرائق''اور''الدر المختار''میں ہے:

''و كذا المريض الراكب إذا لم يقدر على النزول، ولا

---

(۱) تبیین الحقائق:۲/۳۴۵

علی من ینزله الخ‘‘(۱)

(اسی طرح جو مریض سوار ہو، جب سواری سے اترنے پر اور اتارنے والے پر قدرت نہ ہو۔)

’’الاختیار لتعلیل المختار‘‘ میں ہے:

’’مریض راکب لایقدر علی من ینزله یصلي المکتوبة راکبا بإیماء ، وکذلک إذا لم یقدر علی النزول لمرض أو مطر أو طین ، أوعدو . ‘‘ (۲)

(مریض شخص جو سواری پر سوار ہو، اگر اتارنے والے پر قدرت نہ ہو، تو وہ فرض نماز سواری ہی پر اشارے سے پڑھ لے، اسی طرح اس وقت بھی جب سواری سے اترنے پر مرض کی وجہ سے یا بارش یا گارے یا دشمن کی وجہ سے قدرت نہ ہو۔)

اور ’’تحفة الفقهاء‘‘ میں ہے:

’’ أما الفرض فیجوز علی الراحلة بشرطین : أحدهما : أن یکون خارج المصر سواء کان مسافراً أو خرج إلی الضیعة .و الثاني أن یکون به عذر مانع من النزول عن الراحلة الخ‘‘ (۳)

(رہی فرض نماز، وہ سواری پر دو شرطوں سے جائز ہے: ایک یہ کہ

---

(۱) البحر الرائق، الشامي: ۹٦/۲

(۲) الاختیار: ۸۳/۱

(۳) تحفة الفقهاء: ۱۵۳/۱

شہر سے باہر ہو، خواہ سفر کی وجہ سے یا اپنی زمین کی جانب جانے کے واسطے۔ دوسری شرط یہ کہ اس کے ساتھ عذر ہو، جو سواری سے اترنے سے مانع بنے۔)

ان تمام عبارات میں دابہ یعنی سواری کے جانور پر نماز فرض کی اجازت دی گئی ہے، اور ان سب کو قیام ورکوع وسجود کے ساقط ہونے کے لیے عذر مانا گیا ہے۔ اور ہر کوئی جانتا ہے کہ جانور پر بیٹھنے کی ہیئت تقریباً وہی ہوتی ہے جو کرسی پر بیٹھنے کی ہوتی ہے، اور اس پر نماز کی صورت بھی تقریباً وہی ہوتی ہے جو کرسی پر نماز کی ہوتی ہے، لہٰذا ان اعذار میں جانور پر نماز کا جواز دراصل کرسی پر نماز کے جواز کی واضح نظیر ہے۔

حدیث وآثار سے استدلال

اور فقہا نے یہ مسئلہ ایک حدیث سے مستنبط کیا ہے۔ جسے ترمذی، احمد، بیہقی اور دارقطنی وغیرہ محدثین نے حضرت یعلی بن مرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے، چناں چہ وہ کہتے ہیں:

" أن رسول الله – صلی اللہ علیہ وسلم – انتهى إلى مضيق هو وأصحابه ، وهو على راحلته ، والسماء من فوقهم ، والبلة من أسفلهم ، فحضرت الصلوٰة ، فأمر المؤذن، فأذن وأقام ، ثم تقدم رسول الله – صلی اللہ علیہ وسلم – على راحلته، فصلىٰ بهم يؤمي إيماء ، يجعل السجود أخفض من الركوع. " (١)

(١) الترمذي:٤١١، مسند أحمد:١٧٦٠٩، سنن البيهقي:٢/٧، الد ارقطني:١٤٢٩

(رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ ایک تنگ جگہ پہنچے، جب کہ آپ سواری پر سوار تھے اور اوپر سے آسمان برس رہا تھا اور نیچے تری و کیچڑ تھا، پس نماز کا وقت آ گیا، تو آپ نے مؤذن کو حکم دیا، تو اس نے اذان دی اور اقامت کہی، پھر آپ اپنی سواری پر آگے بڑھے اور لوگوں کو اشارے سے نماز پڑھائی، سجدے کا اشارہ رکوع کے اشارے سے زیادہ پست کیا۔)

اس حدیث کے بارے میں علمائے محدثین کا اختلاف ہے کہ یہ کس درجے کی ہے؟ امام ترمذی رحمہ اللہ نے کہا:

”هذا حديث غريب تفرد به عمر بن الرماح البلخي. لايعرف إلا من حديثه، وقد روىٰ عنه غير واحد من أهل العلم.“

اور ابن حجر رحمہ اللہ نے ”التلخيص الحبير“ میں لکھا ہے:

” قال عبد الحق: إسناده صحيح والنووي: إسناده حسن ، وضعفه البيهقي وابن العربي وابن القطان لحال عمرو بن عثمان.“ (۱)

اور ابن عبد البر رحمہ اللہ نے ”التمهيد“ میں کہا ہے:

”ليس إسناده بشيء.“(۲)

معلوم ہوا کہ اس کی صحت کے بارے میں اختلاف ہے، تاہم اس کی صحت

---

(۱) التلخيص الحبير: ۱/۵۲۲

(۲) التمهيد: ۲۳/۶۱

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ایک اثر سے ہوتی ہے؛ کیوں کہ محدثین کے نزدیک حدیث کی تقویت کا ایک ذریعہ آثار صحابہ کا اس کے موافق ہونا بھی ہے۔

چناں چہ امام طبرانی رحمہ اللہ نے حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ سے روایت کیا ہے، وہ کہتے ہیں:

"أقبلنا مع أنس- رضی اللہ عنہ - من الكوفة حتىٰ إذا كنا بأطط أصبحنا والأرض طين وماء، فصلى المكتوبة على دابته."(۱)

(ہم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ کوفے سے آئے، یہاں تک کہ جب ہم "اطیط" مقام پر تھے، تو ہم نے اس حال میں صبح کی کہ زمین میں کیچڑ و پانی تھا، پس حضرت انس رضی اللہ عنہ نے فرض نماز جانور پر پڑھی۔)

اورعلامہ ہیثمی رحمہ اللہ نے "مجمع الزوائد" میں اس حدیث کے بارے میں فرمایا: "رواه الطبراني في الكبير ورجاله ثقات."(۲)

اور یہ حدیث دوسرے الفاظ سے امام ابن ابی شیبہ اورامام عبدالرزاق رحمہما اللہ نے بھی روایت کی ہے۔امام عبدالرزاق کے الفاظ یہ ہیں کہ ابن سیرین نے فرمایا:

"كنت مع أنس بن مالك -رضی اللہ عنہ- في يوم مطير حتىٰ إذا كنا بأطيط والأرض فضفاض، صلى بنا على حماره صلاة العصر يؤمي برأسه إيماء وجعل السجود أخفض

---

(۱) المعجم الكبير للطبراني:۱/۲۹۲

(۲) مجمع الزوائد :۲/۱۹۲

من الركوع."(۱)

اور ابن ابی شیبہ کے الفاظ اس طرح ہیں کہ ابن سیرین رحمہما اللہ نے کہا:

" أقبلت مع أنس -رضي الله عنه- من الكوفة حتىٰ إذا كنا بأطط، وقد أخذنا السماء قبل ذلک، والأرخ ضحضاح، فصلى أنس -رضي الله عنه- وهو على حمار مستقبل القبلة، وأومأ إيماء، وجعل السجود أخفض من الركوع." (۲)

جب حضرت انس رضی اللہ عنہ کے عمل کا صحیح طور پر ثبوت ہوگیا کہ انھوں نے بھی کیچڑ کی وجہ سے جانور پر بیٹھے بیٹھے نماز پڑھی، تو اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اوپر کی حدیث بھی صحیح ہے؛ کیوں کہ یہ حدیث اس کی تائید کر رہی ہے؛ لہٰذا اس حدیث اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے اثر سے معلوم ہوا کہ ضرورت پر جانور پر بیٹھے بیٹھے رکوع وسجدے کا اشارہ کرتے ہوئے نماز ہوسکتی ہے اور اس کی گنجائش ہے اور جیسا کہ عرض کیا گیا، یہ نظیر ہے کرسی پر نماز کی؛ لہٰذا معلوم ہوا کہ ضرورت وعذر کی بنا پر کرسی پر نماز جائز ہے۔

---

(۱) مصنف عبدالرزاق:۲/۵۷۳

(۲) مصنف ابن أبی شیبة:۲/۹۰

یوتھینزیا

[EUTANASIA]

یعنی جذبۂ رحم سے مریض کو مار دینے کا شرعی حکم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

یوتھینزیا[EUTANASIA]
یعنی جذبہ رُحم سے مریض کو ماردینے کا شرعی حکم

سوال

محترم مفتی صاحب دام اقبالہ

السام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

ہم کئی ساتھی ڈاکٹر ہیں اور الحمد للہ مختلف اداروں سے جڑے ہوئے خدمت کر رہے ہیں، میں کینیڈا میں مقیم ہوں اور وہاں ایک ہسپتال میں ملازم ہوں اور مجھے بھی میرے ساتھیوں کو بھی مختلف مسائل پیش آتے رہتے ہیں جو ہم آپ سے فون پر بھی پوچھ لیتے ہیں، ایک مسئلہ یوتھینزیا کے بارے میں آپ سے پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ اس کو لکھ کر پیش کیا جائے؛ لہٰذا یہ سوال آپ کے پاس میرے ساتھی پیش کر رہے ہیں۔امید ہے کہ جواب سے نوازیں گے۔

ڈاکٹر لوگوں کو ایسے مواقع آتے رہتے ہیں کہ بعض مریض انتہائی قابل رحم ہوتے ہیں، جن کی بیماری بڑی خطرناک ہونے کے ساتھ ساتھ بہت زیادہ تکلیف دہ بھی ہوتی ہے۔اور اسی کے ساتھ ڈاکٹروں کو اپنی جانکاری ومہارت کے تجربے سے اس کی شفا کی کوئی امید بھی دور دور تک نہیں ہوتی۔اس قسم کے لوگوں پر رحم کی وجہ سے

میڈیکل سائنس میں اطبا نے ایک طریقہ جاری کیا ہے جس کو ''یوتھنز یا'' [Euthanasia] کہا جاتا ہے۔ اور اس عمل کی دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک کو [Active Euthanasia] اور دوسری کو [Passive Euthanasia] یعنی فعلی وسلبی کہا جاتا ہے۔ ''فعلی یوتھنز یا'' کا مطلب یہ ہے کہ کسی عمل سے مریض کو ختم کردیا جائے، جیسے کوئی زہریلا انجکشن یا کوئی ایسی دوا دے کر ان کو مار دیا جاتا ہے۔ اور ''سلبی یوتھنز یا'' یہ ہے کہ مریض کو بچانے کے لیے کی جانے والی تدابیر و اسباب کو روک دیا جائے تا کہ وہ خود ختم ہو جائے۔

اس تفصیل کی روشنی میں ہم یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ یہ عمل شرعاً جائز ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ ان دو قسم عملی وسلبی یوتھنز یا میں کوئی فرق بھی ہے یا دونوں کو حکم یکساں ہے؟ براہ کرم اس کا تفصیلی جواب دی کر ممنون فرمائیں؟

نوٹ: یہ بھی علم میں رہے کہ یوتھیز یا کا یہ طریقہ بیشتر ممالک میں ممنوع قرار دیا گیا ہے؛ اس لیے جو ڈاکٹر ان ممالک میں اس کو اختیار کرتے ہیں، وہ پوشیدہ طور پر اور رازدارانہ طریقہ پر اس کو انجام دیتے ہیں۔

فقط

ڈاکٹر سعید انور، مقیم کینیڈا

ڈاکٹر نواز جیلانی و دیگر ساتھی

الجواب ومنہ الحق والصواب

یوتھینز یا یعنی قتل بہ جذبۂ رحم وشفقت اسلامی نقطۂ نگاہ سے ایک غیر انسانی وغیر اخلاقی حرکت ہے، ایک انسان کو تکلیف و پریشانی ہو اور وہ دکھ و رنج میں گرفتار ہو تو ایک شریف النفس انسان خواہ وہ اپنا ہو یا غیر، اس کی اخلاقی ذمہ داری یہ ہے کہ اس کو بچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائے اور کسی نہ کسی طرح اس کو اس کی بیماری و پریشانی سے نکالنے کی جدو جہد کرے۔

انسانی تاریخ کے گزشتہ سارے ادوار اسی بات کی شہادت دیتے ہیں کہ ہر زمانے میں لوگوں نے ایسا ہی کیا ہے اور اسی کو وہ اپنے لیے باعث سعادت وخوش بختی سمجھتے تھے، سوائے دو ایک قدیم قوموں جیسے یونانی و رومی اور اکا دکا مذہبوں جیسے بدھیزم کے کہیں بھی یہ فلسفہ نہیں ملتا کہ کسی کی بیماری و تکلیف کو دیکھ کر رحم وشفقت نے لوگوں کو اس پر آمادہ کیا ہو کہ وہ اس بیمار و تکلیف کے شکار شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے کی فکر کریں۔ الغرض یہ انسانیت و اخلاق سے خالی فلسفہ ہے جس کو تہذیب جدید کے اخلاقی بحران اور شقی ذہن و دماغ کی پیداوار کہا جا سکتا ہے۔

اب رہا یہ کہ شرعاً اس کا کیا حکم ہے؟ تو اس کے جواب میں کچھ تفصیل ہے، اور وہ تفصیل اس کی مختلف شقوں وصورتوں کے لحاظ سے ہے؛ لہٰذا ہم یہاں ان کو نمبر وار بیان کریں گے:

عملی یوتھینز یا کا حکم [Active Euthanasia]

جہاں تک عملی و مثبت یوتھینز یا کا تعلق ہے، جس میں ڈاکٹر و معالج از خود یا بیمار و تیماردار کے کہنے سے مریض کو کسی آلے یا دوا کے ذریعہ موت کی نیند سلا دیتا ہے، اس

کی دو صورتیں ہیں:

پہلی صورت: ایک یہ کہ خود مریض تکالیف و پریشانیوں کو برداشت نہ کر کے یہ چاہے کہ اس مصیبت سے بچنے کے لیے خود کو موت کے گھاٹ اتار دوں اور اپنے اوپر اس کو لاگو کرے۔

یہ صورت بھی اسلام میں حرام و ناجائز ہے، اور یہ خودکشی کے حکم میں ہے۔ شریعت نے دنیوی مصائب کے پیش آنے پر ہمیں حکم دیا ہے کہ صبر کیا جائے اور اس کا بہت بڑا ثواب بیان کیا ہے اور بیماری و مصیبت کو رفع درجات اور کم سے کم کفارۂ سیئات قرار دیا ہے۔ جیسا کہ قرآن وسنت کے مطالعہ سے واضح ہے۔

یہاں میں ان میں سے بعض کا ذکر مناسب سمجھتا ہوں تا کہ آپ ڈاکٹر حضرات ایسے مریضوں کی تسلی و تعلیم کے لیے ان کو پیش نظر رکھیں۔

قرآن کریم کی آیت ہے:

﴿ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ. ١٥٥ الَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَتْهُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالُوْا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ﴾ (البقرۃ: ١٥٥-١٥٧)

(اور ہم تمہاری آزمائش کرتے ہیں کچھ خوف اور بھوک اور مالوں و جانوں اور پھلوں میں نقصان دیکر، پس آپ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ان لوگوں کو بشارت سنا دیجئے ان پر صبر کرنے والے لوگوں کو جو مصیبت پہونچنے پر یہ کہتے ہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور اسی کی جانب لوٹ جانے والے ہیں۔)

دیکھئے اس میں صبر خواہ وہ کسی خوف وڈر کے نتیجہ میں ہو یا بھوک و پیاس اس کا سبب ہو یا جان ومال کا نقصان اس کی بنیاد ہو، ہر قسم کے صبر پر بشارت سنائی گئی ہے۔

متعدد جگہوں میں قرآن میں یہ مضمون بھی وارد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔ اور یہ بھی وارد ہے کہ اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو محبوب رکھتے ہیں۔ کیا اس سے بڑھ کر کسی مصیبت زدہ کو صبر دلانے کی کوئی سبیل ہو سکتی ہے، کیا کسی مومن کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی نعمت متصور ہے کہ اللہ اس کے ساتھ ہو جائے اور اللہ اس کو اپنا محبوب قرار دے؟(۱)

(۱) حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« إذا أراد اللّٰه بعبده الخير عجل له العقوبة في الدنيا وإذا أراد اللّٰه بعبده الشر أمسک عنه بذنبه حتى يوافي به يوم القيامة. »

(جب اللہ تعالیٰ بندے سے خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اس کی سزا دنیا ہی میں دے دیتے ہیں اور اگر کسی بندے سے شر کا ارادہ کرتے ہیں تو اس کو گناہ کی سزا روک لیتے ہیں یہاں تک کہ اس کو قیامت میں پوری سزا دیتے ہیں۔)(۲)

(۲) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بسند صحیح روایت ہے کہ میں ایک مرتبہ سواری پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے بیٹھا تھا آپ نے (اور باتوں کے ساتھ یہ بھی) فرمایا:

---

(۱) دیکھو: بقرة: ۱۵۳، بقرة: ۲۴۹، انفال: ۴۶ و۶۶ و آل عمران: ۱۴۶

(۲) ترمذی: ۲۳۹۶، شرح السنه: ۱۴۳۵، مشکل الآثار: ۲۰۵۰

« اعلم أن في الصبر على ما تكره خيرا كثيرا و أن النصر مع الصبر و الفرج مع الكرب و أن مع العسر يسرا. »

(جان لے کہ ایسی باتوں پر صبر میں جو تجھے بری لگیں بہت خیر ہے اور نصرت صبر کے ساتھ ہوتی ہے اور کشادگی کرب و تکلیف کے ساتھ آتی ہے اور ہر تنگی کے ساتھ آسانی ہے۔)(۱)

(۳) حضرت محمود بن لبید رحمہ اللہ سے سند جید سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو چاہتے ہیں تو ان کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دیتے ہیں، پس جو صبر کرے گا اس کو صبر کا پھل ملے گا اور جو اس پر واویلا کرے گا تو اس کو یہی واویلا ملے گا۔''(۲)

(۴) حضرت ابو ہریرہ و حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« لا يصيب المرء المؤمن من نصب ولا وصب ولا هم ولا حزن ولا أذى ولا غم حتى الشوكة يشاكها إلا كفر الله عنه خطاياه. »

(مؤمن جب بھی کسی پریشانی، بیماری، رنج و ملال، تکلیف و غم میں مبتلا ہوتا ہے یہاں تک کہ اگر اسے کوئی کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ

(۱) مسند احمد: ۲۸۰۴، شعب الایمان: ۹۵۲۸

(۲) مسند احمد: ۲۳۶۷۲

اسے اس کے گناہوں کا کفارہ بنا دیتے ہیں۔)[1]

(۵) حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم لوگ ایک بار رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے پاس تھے، آپ نے مسکرایا، ہم نے معلوم کیا کہ آپ نے کیوں مسکرایا؟ فرمایا کہ: میں مؤمن اور اس کے بیماری پر جزع فزع یعنی واویلا کرنے پر تعجب کرتا ہوں اور اگر مؤمن کو معلوم ہو جائے کہ بیماری پر کیا ثواب ہے تو وہ خواہش کرے گا کہ وہ بیمار ہی رہے، حتی کہ اسی حال میں اللہ سے ملاقات ہو۔[2]

ان آیات کریمات و احادیث با برکات میں واضح طور پر صبر پر بڑے بڑے ثمرات وثوابات کے وعدے کئے گئے ہیں، بعض میں تو مطلق مصیبت کا ذکر ہے اور بعض میں خاص طور پر بیماری، وغم وحزن، کانٹا وغیرہ لگ جانے سے ذکر کیا گیا ہے، الغرض بیماری ومصیبت پر مریض لوگوں کو اس امور کا مطالعہ کرنا چاہئے یا اس کا ان سے مذکرہ ہونا چاہئے اور ان کو اپنے مصائب پر صبر کی تلقین کرتے ہوئے، ان کو سہنے و برداشت کر کے اپنے مالک وخالق کو راضی کرنے پر آمادہ کرنا چاہیے۔

مگر یہ باتیں اس کو فائدہ دیں گی جو اہل ایمان میں سے ہے، اگر بیمار ومریض غیر مسلم ہے تو اس کو چوں کہ اولاً تو ان باتوں پر اسے ایمان نہیں، اور ثانیاً وہ آخرت کا وہ تصور نہیں رکھتا جو اہل ایمان رکھتے ہیں، اس لئے یہ باتیں اس کی تسلی کا ذریعہ نہیں بن سکتیں الا ماشاء اللہ؛ لیکن ایسے مریضوں کو یوں ڈاکٹر بھی اور ان کے تیمار دار بھی تسلی دینے کی کوشش کریں کہ وہ بہت جلد ٹھیک ہو جائے گا، اور اللہ کا امید کا حکم بھی ہے،

---

(۱) بخاری: ۵۶۴۰، مسند احمد: ۸۴۰۵، مسند ابویعلی: ۱۲۳۷، صحیح ابن حبان: ۲۹۰۵

(۲) مسند بزار: ۱۷۶۱، مسند ابوداود طیالسی: ۳۴۵، معجم اوسط طبرانی: ۲۳۱۷، شعب الایمان: ۹۴۶۸

لہٰذا یہ کوئی غلط بات بھی نہیں ہے، اس طرح بہ ہر حال کوشش کی جانی چاہیے۔

لہٰذا جو شخص ان باتوں کو نظر انداز کر کے خود کو مارنے کی تدبیر کرے وہ خودکشی کا مرتکب ہے اور اسلام میں اس کی قطعاً اجازت نہیں، عام حالات میں تو اس کا حرام ہونا ظاہر ہے اور خاص ایسے حالات میں بھی کہ مرض و تکلیف کی شدت نا قابل برداشت ہے، اسلام خودکشی کی اجازت نہیں دیتا۔

عام حالات میں خودکشی کے بارے میں حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« من قتل نفسه بحديدة فحديدته في يده يتوجأ بها في بطنه في نار جهنم خالدا مخلدا فيها أبداً ومن شرب سما فقتل نفسه فهو يتحساه في نار جهنم خالدا مخلدا فيها أبداً ، ومن تردى من جبل فقتل نفسه فهو يتردى في نار جهنم خالدا مخلدا فيها أبداً. »

(جس نے کسی دھاردار لوہے سے خودکشی کی، تو اس کا یہ ہتھیار اس کے ہاتھ میں ہوگا جس سے وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اپنے پیٹ میں مارتا رہے گا اور جس نے زہر پی کر خودکشی کی، وہ جہنم کی آگ میں اس کو ہمیشہ ہمیشہ پیتا رہے گا اور جس نے پہاڑ سے خود کو گرا کر خودکشی کی وہ جہنم کی آگ میں ہمیشہ ہمیشہ خود کو اسی طرح گراتا رہے گا۔)(۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) بخاري: ۵۷۷۸، مسلم: ۳۱۳، واللفظ له، ترمذی: ۲۰۴۴، مسند احمد: ۷۴۴۱، ابن حبان: ۵۹۸۶

« من خنق نفسه في الدنيا خنق نفسه في النار ومن طعن نفسه طعنها في النار ومن اقتحم فقتل نفسه اقتحم في النار. »

(جس نے دنیا میں اپنا گلا گھونٹ لیا، وہ دوزخ میں بھی اپنا گلا گھونٹے گا اور جس نے خود کو نیزہ سے مار لیا وہ دوزخ میں بھی خود کو نیزہ مارتا رہے گا اور جو شخص کود کر خود کو ہلاک کر لیا وہ دوزخ میں بھی کودتا رہے گا۔)(۱)

اور تکالیف و بیماری کی وجہ سے خودکشی کے بارے میں حدیث میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک شخص کو زخم ہو گیا تھا، اس نے نیزے سے خودکشی کر لی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اس پر نماز نہیں پڑھوں گا، ایک روایت میں ہے کہ آپ نے اس پر نماز جنازہ نہیں پڑھی۔ (۲)

ایک حدیث میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''تم سے پہلے لوگوں میں ایک شخص کو ایک پھوڑا نکل آیا تھا، اس نے چاقو لی اور خودکشی کر لی، پس اس کا خون رکا ہی نہیں یہاں تک کہ وہ مر گیا، اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ: میرے بندے نے مجھ سے پہل کی پس میں نے اس پر جنت کو حرام کر دیا۔''(۳)

نیز ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے جہاد میں حصہ لیا اور خود داد شجاعت لی اور زخمی ہو گیا، پھر زخم کی تکلیف برداشت نہ ہونے کی وجہ خودکشی کر لی، اللہ کے نبی

---

(۱) ابن حبان: ۵۹۸۷

(۲) نسائی: ۱۹۶۴، ابن حبان: ۳۰۹۳

(۳) ابن حبان: ۵۹۸۸

صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو جہنمی قرار دیا۔ (۱)

الغرض اسلام میں عام حالات میں بھی اور خاص تکالیف و پریشانیوں میں بھی اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ آدمی مصیبت سے گھبرا کر خود کشی کر لے؛ بل کہ خود کشی کیا اسلام تو اس کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایسے حالات میں کوئی موت کی تمنا بھی کرے۔

ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: تم میں سے کوئی شخص کسی مصیبت و پریشانی کی وجہ سے جو اس پر نازل ہوئی ہے موت کی تمنا نہ کرے۔ (۲)

ان سارے دلائل کی روشنی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ خود مریں کسی بیماری و مصیبت کی وجہ سے موت کی تمنا نہیں کر سکتا اور خود کشی بھی نہیں کر سکتا، خواہ کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو؛ بل کہ اس کو ہر صورت میں صبر کرتے رہنا چاہیے اور خود کشی کرنا حرام و باعث عذاب شدید ہے؛ بل کہ ظاہر الفاظ سے تو اس پر ہمیشہ کے لیے جہنم واجب ہے، اگر چہ کہ جمہور علما نے اس کی تشریح میں یہ بتایا ہے کہ چوں کہ مؤمن کبھی نہ کبھی جہنم سے نکالا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا؛ لہٰذا اس کو بھی آخر کار جنت ملے گی، تاہم ان الفاظ سے اس کے لیے عذاب کی سختی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

دوسری صورت: دوسری صورت یہ ہے کہ ڈاکٹر یا تیمار دار اہل خاندان کی جانب سے ایسے بیمار کو یوتھینیز یا سے ختم کرنے کی کوشش کی جائے، یہ صورت بھی قطعاً حرام و ناجائز ہے؛ کیوں کہ اس میں ایک جان کا قتل لازم آتا ہے اور یہ کسی وضاحت کا محتاج نہیں کہ اسلام میں قتل کس قدر بڑا گناہ ہے؟ یا کم از کم قتل پر امداد و تعاون لازم آتا ہے اور یہ بھی اسلام میں حرام ہے۔

---

(۱) دیکھو: بخاري: ۳۰۶۲، مسلم: ۳۱۹، مسند احمد: ۸۰۷۶، ابن حبان: ۴۵۱۹

(۲) نسائي: ۱۸۲۱، ابن ماجه: ۴۲۶۵، مسند احمد: ۱۱۹۹۸، مسند بزار: ۶۳۷۵

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ﴾

(الأنعام : ۱۵۱)

(اور کسی جان کو جسے اللہ نے حرام قرار دیا ہے بلا وجہ قتل نہ کرو۔)

اور اس میں جو یہ فرمایا کہ بلا وجہ قتل نہ کرو، اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ یوتھینیز یا میں جو قتل کیا جاتا ہے وہ بلا وجہ کے نہیں ہے، کیوں کہ یہاں ایک وجہ ہے، وہ اس مریض کو یا اس کے اہل خاندان کو تکالیف سے بچانا؛ مگر یہ بات صحیح نہیں؛ کیوں کہ قرآن کے اس جملے کی تفسیر حدیث میں جو آئی ہے وہ یہ ہے کہ قتل کی تین وجوہات ہوسکتی ہیں: ایک مرتد ہو جانا، دوسرے کسی مسلمان کو بلا وجہ قتل کرنا، اور تیسرے زنا کرنا؛ لہٰذا یہاں آیت میں ان تین وجوہات کی جانب اشارہ ہے کہ اگر یہ وجوہات ہوں تب تو قتل کرنا جائز ہے ورنہ جائز نہیں اور یہ ظاہر کہ زیر بحث مسئلہ اس میں داخل نہیں ہے۔

لہٰذا جو ڈاکٹر مریض کو اس ذریعے سے قتل کرے گا وہ اس حرام کا مرتکب سمجھا جائے گا اور اس کی حرمت و مذمت کے لیے یہ کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ قرآن کریم میں فرمایا:

﴿مِنْ اَجْلِ ذٰلِکَ کَتَبْنَا عَلٰی بَنِیْ اِسْرَآئِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا وَمَنْ اَحْیَاهَا فَکَاَنَّمَآ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا﴾ (المائدۃ : ۳۲)

(اسی لئے ہم نے بنی اسرائیل پر لکھ دیا تھا کہ جو شخص کسی جان کو بغیر کسی جان یا بغیر کسی فساد کے قتل کرتا ہے وہ اس نے گویا تمام انساں کو قتل کر ڈالا اور جس نے کسی ایک جان کو بچالیا، اس نے گویا تمام انسانوں کو

بچالیا۔)

اس آیت نے انسانی جان کی قدر و قیمت کو واضح کر دیا کہ ایک جان بھی اللہ کے نزدیک تمام انساں کی جانوں کے برابر ہے؛ لہٰذا جو ایک جان کو بھی قتل کرتا ہے وہ گویا تمام دنیائے انسانیت کو قتل کرنے کے برابر جرم کا مرتکب سمجھا جاتا ہے، اسی طرح ایک جان کو بچالینا بھی بڑا کارِ خیر و باعث اجر وثواب ہے گویا کہ اس نے تمام انسانوں کی جانوں کا تحفظ کیا۔

لہٰذا ڈاکٹر حضرات کا کام یہ ہونا چاہیے کہ وہ ہر صورت میں مریض کی تیمارداری و دوا و علاج کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے اپنی بساط بھر کوشش اس کو بچانے کے لیے کریں، نہ یہ کہ اس کو مارنے کی کوشش کریں۔

سلبی یوتھینیز یا [Passive Euthanasia]

یہ ساری بحث اس یوتھینیز یا کے متعلق تھی جس کو "عملی یوتھینیز یا" کہا جاتا ہے، اور اس کی دوسری صورت جس کو "سلبی یوتھینیز یا" کہتے ہیں، جس میں ڈاکٹر صرف یہ کرتا ہے کہ اسباب علاج و معالجہ ترک کر دیتا ہے اور ان تدابیر کو روک لیتا ہے جو مریض کی زندگی کو بظاہر جاری رکھنے والے ہیں۔

اس کا کیا حکم ہے؟ اس سلسلے میں سب سے پہلے یہ جاننے کی ضرورت ہے کہ اسلامی نقطۂ نظر سے جان وصحت کے تحفظ کی کیا حیثیت ہے؟ فقہائے کرام کی تصریحات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تحفظ جان کے لیے جو اسباب وتدابیر اختیار کیے جاتے ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ جن پر اس تحفظ کا ترتب یقینی ہے، جیسے کھانا، پینا وغیرہ کہ جب انسان کو بھوک و پیاس لگے اور وہ تحفظ نفس کے لیے ان کو اختیار کرے تو یقینی طور پر عادۃ اللہ کے مطابق اس کو تحفظ حاصل ہو جاتا ہے، اور دوسرے

اسباب وہ جن پر تحفظ جان کا ترتب ظنی ہے یقینی نہیں، جیسے صحت کے لیے دوا و علاج کہ اس سے صحت ہو کر جان کا تحفظ یقینی نہیں ہے؛ بل کہ محض ظنی ہے۔ پھر ان دونوں قسم کے اسباب کا حکم بھی مختلف ہے، جہاں تک پہلی قسم کا تعلق ہے ان کا حکم یہ ہے کہ ان اسباب کا اختیار کرنا واجب ہے اور اگر بھوک و پیاس کی شدت کے باوجود کسی نے ان کو اختیار نہیں کیا حتی کہ حرام چیز سے بھی پرہیز کیا اور اس کی وجہ سے اس کی موت واقع ہوگئی تو وہ گنہ گار ہوگا اور اس کو خود کشی کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ اس کے برخلاف دوسری قسم کے اسباب اختیار کرنا لازم و واجب نہیں؛ بل کہ سنت یا جائز ہے، لہٰذا ان کو ترک کرنا بھی جائز ہے۔ جیسے بیماری کا علاج کرانا سنت یا جائز ہے، واجب نہیں، اور اس کے اسباب کو ترک کرنے میں کوئی حرج و مضائقہ نہیں۔ ان کے ساتھ ایک قسم اسباب کی وہ بھی ہے جس کو وہمی کہا گیا ہے، کہ ان پر مسبب کا ترتب محض وہمی ہے، جیسے تعویذ گنڈے اور جلانے سے علاج وغیرہ۔ ان کا اختیار نہ کرنا افضل اور شرط توکل ہے۔

فتاوی ہندیہ میں ہے:

" اعلم بأن الأسباب المزيلة للضرر تنقسم إلى مقطوع به كالماء المزيل لضرر العطش والخبز المزيل لضرر الجوع، وإلى مظنون كالفصد والحجامة وشرب المسهل وسائر أبواب الطب، .... وإلى موهوم كالكي والرقية، أما المقطوع به فليس تركه من التوكل بل تركه حرام عند خوف الموت ، وأما الموهوم فشرط التوكل تركه إذ وصف به رسول الله المتوكلين وأما الدرجة المتوسطة وهي المظنونة كالمداواة بالأسباب

الظاهرة عند الأطباء ففعله ليس مناقضا للتوكل بخلاف الموهوم و تركه ليس بمحظور بخلاف المقطوع به ، بل يكون أفضل من فعله في بعض الأحوال و في حق بعض الاأشخاص فهو على درجة بين الدرجتين." (۱)

اسی اصول پر متعدد حضرات فقہا نے لکھا ہے کہ اگر ڈاکٹر نے کسی مریض کے لیے کوئی علاج تجویز کیا؛ مگر مریض نے اس کو نہیں اپنایا اور اس کی وجہ سے وہ مر گیا تو وہ گناہ گار نہیں ہوگا۔ (۲)

مبسوط میں امام سرخسی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ومن امتنع من التداوی حتی مات لم يأثم، لانه لا يتيقن بأن هذا الدواء يشفيه ولعله يصح من غير علاج". (۳)

شامی نے لکھا ہے:

" فإن ترک الأكل والشرب حتى هلک فقد عصى لأن فيه إلقاء النفس إلى التهلكة وإنه منهي عنه في محكم التنزيل، بخلاف من امتنع من التداوی حتى مات إذ لا يتيقن بأنه يشفيه." (۴)

لہٰذا اگر "سلبی یوتھینز یا" کو محض ترک علاج قرار دیا جائے تو اس کی گنجائش معلوم ہوتی ہے کہ ڈاکٹر ایسے حالات سے دوچار مریض کو سلبی یوتھینز یا سے کام لیتے

(۱) الفتاوى الهندية: ۳۵۵/۵

(۲) فتاوی هنديه: ۳۵۵/۵،مجمع الانهر: ۱۱۶/۸

(۳) مبسوط: ۱۸۶/۵

(۴) شامی: ۳۳۸/۶

ہوئے اپنے حال پر چھوڑ دے اور کوئی علاج نہ کرے۔

لیکن اس سلسلے میں دو پہلو اور ہیں جن پر توجہ دینا چاہیے، ایک تو یہ کہ بعض حضرات معاصرین نے یہاں یہ سوال اٹھایا ہے کہ کیا سلبی یوتھینز یا محض ترک علاج ہے یا کف عن العلاج؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرات فقہائے کرام نے ان دونوں میں فرق کا لحاظ رکھا ہے، ترک تو یہ ہے کہ کوئی کام نہ کیا جائے، جس میں قصد و نیت کو دخل نہیں ہوتا، جیسے ایک شخص نماز پڑھتا ہے تو اس وقت بہت سے گناہ کے کاموں سے باز رہتا ہے، اسی طرح اندھا شخص نامحرم کو دیکھنے سے محفوظ ہے، مگر ان گناہوں سے بچنے و باز رہنے پر ان لوگوں کو ثواب نہیں ہے، کیوں کہ یہ محض ترک گناہ ہے، جس میں ان گناہوں سے بچنے کا کوئی قصد و ارادہ شامل نہیں، اس کے برخلاف کف یہ ہے کہ کسی کام کو بالقصد چھوڑ دیا جائے اور یہ ظاہر ہے کہ اس میں نیت و ارادے کو دخل ہوتا ہے، اس لیے اس پر ثواب و عقاب بھی جاری ہوتا ہے، اچھے کام کے چھوڑنے پر عقاب اور برے کام کے چھوڑنے پر ثواب۔

امام ابن نجیم مصری رحمہ اللہ نے ”الاشباہ و النظائر“ میں اس سلسلے میں اچھی بحث کی ہے، اس میں وہ لکھتے ہیں:

”وأما التروک کترک المنهي عنه فذکروه في الأصول في بحث ما تترک به الحقيقة عند الکلام علی حديث ” إنما الأعمال بالنيات“ فذکروه في نية الوضوء و حاصله أن ترک المنهي عنه لا تحتاج إلی النية للخروج عن عهدة النهي وأما لحصول الثواب فإن کان کفا وهو

أن تدعوه النفس به قادراً على فعله فيكف نفسه عنه خوفا من ربه فهو مثاب وإلا فلا ثواب على ترک الزنا وهو يصلي ولا يثاب العنين على ترک الزنا ولا الأعمى على ترک النظر إلى المحرم.‘‘ (۱)

اس اصول کی روشنی میں بعض معاصرین کی رائے یہ ہے کہ ’’سلبی یوتھینز یا‘‘ میں چوں کہ ڈاکٹر محض ترک علاج نہیں ؛ بل کہ کف عن العلاج کا مرتکب ہوتا ہے، اس لیے یہ جائز نہیں ، کیوں کہ علاج اس کی ذمہ داری ہے اور اس کا ترک بالقصد مریض کو ہلاکت کی طرف لے جانا ہے۔

مگر احقر کی رائے اس سلسلے میں اس سے مختلف ہے، وہ یہ کہ علامہ ابن نجیم کی بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ محض ترک اور کف میں بڑا فرق ہے؛ لیکن غور یہ کرنا ہے کہ حضرات فقہائے کرام نے جہاں علاج معالجے کا ذکر کرتے ہوئے اس کو ان اسباب میں شمار کیا ہے جن کا اختیار کرنا لازم وضروری نہیں ؛ بل کہ جائز یا سنت ہے، وہاں ان کی مراد ترک علاج سے کیا ہے؟ کیا محض ترک جو بلا قصد ہوتا ہے یا وہ ترک جس کو کف سے تعبیر کیا گیا ہے؟ جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو یہ بات واضح طور پر سامنے آجاتی ہے کہ ان کی مراد اس سے کف عن العلاج ہی ہے، نہ کہ محض ترک، مثلا مبسوط کی جو عبارت پیش کی گئی، اس میں ہے کہ:

’’ومن امتنع من التداوی حتی مات لم یأثم ، لأنه لا يتيقن بأن هذا الدواء يشفيه و لعله يصح من غير علاج‘‘. (۲)

---

(۱) الاشباہ النظائر

(۲) مبسوط: ۱۸۶/۵

اسی طرح شامی کی عبارت گزری ہے:

" فإن ترک الأکل والشرب حتی هلک فقد عصی لأن فیه إلقاء النفس إلی التهلکة و إنه منهي عنه في محکم التنزیل، بخلاف من امتنع من التداوی حتی مات إذ لا یتیقن بأنه یشفیه." (۱)

ان میں "امتنع" کا لفظ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں مراد بالقصد علاج سے رک جانا ہے، یہ نہیں کہ مریض نے بلا قصد علاج کو ترک کر دیا تھا یا یہ کہ علاج کی جانب دھیان نہیں دیا تھا؛ بل کہ یہ مراد ہے کہ علاج کی جانب توجہ دلانے کے باوجود اس نے خود کو علاج سے روک لیا تھا۔ جب یہ بات واضح ہوگئی کہ فقہاء کی عبارات میں کف عن العلاج کو جائز قرار دیا گیا ہے، تو معلوم ہوتا ہے کہ "سلبی یوتھینیز یا" کو اگر ہم محض ترک نہیں؛ بل کہ کف عن العلاج بھی تسلیم کر لیں تو بھی فقہا کے نزدیک یہ جائز ہے۔ لہٰذا ترک وکف کے مابین فرق ہونے کے باوجود یہ ثابت نہیں کہ کف عن العلاج کوئی گناہ ہے۔ لہٰذا اس کو "کف عن العلاج" ہونے کے وجہ سے گناہ قرار دینا احقر کے نزدیک محل نظر ہے۔

رہی علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ کی عبارت تو اس کا حاصل احقر کے نزدیک یہ ہے کہ ایک ہوتا ہے بالقصد کسی چیز کو ترک کرنا اور ایک ہوتا ہے بلا قصد کسی چیز کا چھوٹ جانا، دونوں میں حکم شرعی کے لحاظ سے فرق ہے، بالقصد ترک پر ثواب وعقاب کا معاملہ ہوتا ہے، جب کہ بلا قصد کسی چیز کا چھوٹ جانا مدار حکم نہیں۔ لہٰذا جو چیز شرعاً فرض و واجب ہو اس کا بلا قصد ترک گناہ نہ ہوگا اور بالقصد ترک گناہ ہوگا اور جو چیز شرعاً جائز

(۱) شامي:٦/ ٣٣٨

ہو اس کا ترک خواہ بالقصد ہو یا بلا قصد دونوں جائز ہوگا اور جو چیز شرعاً ممنوع و حرام ہو اس کا ترک بلا قصد ہو تو اس پر ثواب نہ ہوگا اور بالقصد ہو تو ثواب ہوگا۔

اب غور یہ کرنا ہے کہ زیر بحث طریق علاج میں کونسی بات پائی جاتی ہے؟ تو یہ ظاہر ہے کہ یہاں ترک کسی شرعی واجب وفرض کا نہیں ہے؛ بل کہ ایک جائز کام کا ترک یا اس سے کف ہو رہا ہے، لہٰذا یہ ترک خواہ بالقصد ہو یا بلا قصد جائز ہوگا، ہاں اگر علاج معالجے کو شرعاً واجب وفرض مانا جائے تو پھر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ترک علاج حرام ہے، مگر یہ بات شرعی لحاظ سے ثابت نہیں، لہٰذا معلوم ہوا کہ ''سلبی یوتھینیز یا'' کا حکم جواز کا ہے۔

دوسرا پہلو یہ قابل غور ہے کہ بہت سے شفا خانوں میں اور بعض ڈاکٹر لوگوں کے یہاں بسا اوقات مریض کو علاج کے نام سے لوٹا بھی جاتا ہے اور مختلف قسم کے آلات مریض کو لگا کر یہ باور کرایا جاتا ہے کہ اس کا علاج ہو رہا ہے؛ جب کہ مریض کو اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا؛ بل کہ مزید تکلیف ہی گزرتی ہے، اگر ہم علاج معالجے کو اس صورت میں بھی لازم قرار دیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مریض کا علاج ہونا تو موہوم رہے گا، لیکن ڈاکٹروں اور اسپتالوں کا مفاد یقینی ہوگا۔

والله أعلم وعلمه أتم وأحكم

محمد شعیب اللہ خان

۲۴/ جمادی الاولی/۱۴۳۳

دعائے سری وجہری

پر ایک محققانہ نظر

کلمات

حضرت مولانا عبدالجمیل صاحب باقوی رحمہ اللہ

(ناظم جمعیۃ علماء ہندوانمباڑی)

الحمدللّٰہ و کفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ

شریعت نے جن احکام کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کی ہے، ان میں کلمہ طیّبہ کی شہادت کے بعد نماز کا درجہ اولین ہے، نماز اجتماعی ہو یا انفرادی تکبیر تحریمہ سے شروع ہو کر تسلیم پر ختم ہو جاتی ہے، نماز کے اندر اور باہر کے ارکان وشرائط میں کسی بھی قسم کی کمی ہو تو قطعاً نماز نہیں ہوتی، واجبات، سنن ومستحباب جن کی شریعت نے نشاندہی کی ہے وہ ظاہر ہیں، اور جن حقائق کا ذکر کیا گیا ہے، ان میں امت کے کسی بھی فقہی مسلک کا اختلاف نہیں ہے، البتہ سورہ فاتحہ کی قرأت پر فرض وواجب کی اصطلاح فقہ حنفی وشافعی وغیرہ میں زیر بحث آسکتی ہے، ہاں قرأۃ خلف الامام فاتحہ ایک بنیادی مسئلہ ہے، جس میں صرف حنفی فقہ کے عاملین اپنا انفرادی حق حدیث ہی کی بنا پر محفوظ رکھتے ہیں۔

زیر نظر رسالہ میں جس مسئلہ پر بحث کی گئی ہے وہ بعد نماز دعا بالجہر کا مسئلہ ہے جس کو بعض مصالح پسند حضرات نے نزاعی مسئلہ بنا دیا ہے اور رواج عام کی وجہ سے وہ

نماز کا ایک داخلی مسئلہ بن گیا ہے۔

حضرت مولانا مفتی محمد کفایت اللہ صاحب رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ اگر کسی سنت غیر مؤکدہ اور مستحب فعل پر کثرت سے التزام ہونے لگے تو اس کو گا ہے چھوڑ دینا چاہئے، تاکہ اس کی حقیقت فرض کے روبرو واضح ہو جائے اور جو مسنون منصوص ہی نہ ہو اس کی حقیقت واضح ہے، دُعا کی فضیلت اپنی جگہ مسلم ہے اور آپ کو اختیار رہے کہ گھنٹوں بیٹھ کر تسبیحات اور دعائیں اپنی اپنی کرتے رہیں، نہ امام کو آپ مجبور کریں نہ امام آپ کو مجبور کرے، نماز ختم ہوگئی، آپ کیوں بیٹھے امام کو دیکھ رہے ہیں؟

بعض جگہ بعد سلام زور سے ''الحمدللہ'' پھر خاموشی طاری ہو جاتی ہے اور آخر میں ''والحمدللہ رب العالمین'' یہ بھی مناسب نہیں، امام اپنی دعا کرے، مقتدی اپنی دعا کریں، بعض جگہ؛ بل کہ اکثر جگہ لمبی لمبی غیر ماثور دعاؤں کو زور زور سے پڑھتے ہیں اور مسبوق (پیچھے نماز پوری کرنے والوں) کی نمازوں میں خلل کا وبال اپنے سر لیتے ہیں۔عزیزم مولوی محمد شعیب اللہ صاحب نے جس مسئلہ'' دعاء بعد الصلوۃ الفریضۃ'' پر بحث فرمائی ہے وہ اپنی جگہ حق وصداقت کی حامل ہے۔

اللہ تعالیٰ قبول کرے اور ہم سب کو اپنی مرضیات پر چلنے کی توفیق دے۔

(مولانا)
محمد عبدالجمیل خطیب باقوی
ناظم جمعیۃ علماء ہند وانمباڑی

التقریظ

حضرت مولانا ذاکر حسن صاحب عبیدی دامت برکاتہم

الحمدللہ و کفیٰ وسلام علی عبادہ الذین اصطفیٰ امابعد:

میں نے رسالہ "التحقیق الحری فی ندب الدعاء الخفی" مصنفہٗ مولانا محمد شعیب اللہ صاحب مفتاحی حرفاً حرفاً سنا، ماشاء اللہ اپنے موضوع پر محققانہ کلام فرمایا ہے، اور میں اس سے دعاء جہری کے بدعت ہونے میں بالکل متفق ہوں اور میرے نزدیک مروجہ دعاء جہری محدثات بدعیہ میں سے ہے۔

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو صحیح طریقہ اختیار کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔آمین

ابوالناصر ذاکر حسن عبیدی

(غفراللہ لہٗ)

التقریظ

حضرت استاذی مولانا مفتی مہربان علی صاحب مدظلہ العالی

(مفتی وصدر مدرس مدرسہ امداد الاسلام ہرسولی مظفرنگر)

الحمدللّٰه المنعم الجواد الذی لارادّلفضله والصلوة والسلام علی سیدالاولین والآخرین سیدنا ومولانامحمدوآله واصحابه الطاهرین وبعد.

إنی قد طالعت الرسالة المساة "القضآء لدفع نزاع الدعآء بین الجهروالخفآء" الفاضل النبیل، البارع الذکی، الفائق علی أصحابه "المولوی محمدشعیب الله خان الحنفی" صانه اللّٰه تعالیٰ عن کل شروفساد،فرأیتهاصحیحةً نافعةً نافذةً عنداولی الالباب ومن خالفه فقدخالف اهل السنة بلاارتیاب.

فجزاه اللّٰه تعالیٰ خیرالجزآء والثواب فی یوم الحشر والحساب وهواعلم بالحق والصواب والیه المرجع والمآب .

فقط

کتبه الاحقر مهربان علی عفی عنه

خادم التدریس بالمدرسة العربیة،إمدادالإسلام

هرسولی مظفرنغر، یوبی

نوٹ: یہ تقریظ حضرت استاذی دامت برکاتہم نے میرے اصل عربی مختصر رسالہ پرتحریر فرمائی تھی اس وقت اس کا یہی نام تجویز ہوا تھا جوحضرت نے تحریر فرمایا ہے۔ پھر میں نے اس کا "التحقیق الحری" نام رکھا جس میں بعض چیزوں کا اضافہ ہوا تھا اور اردو ترتیب میں تو بہت کچھ اضافہ وترمیم ہوئی ہے، جیسا کہ مقدمہ میں بھی اس کا اظہار کیا گیا ہے۔ فقط: محمد شعیب اللہ خان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقدمۂ کتاب

الحمدللّٰہ الذی یعلم السرو الخفی و الصلوۃ و السلام علی افضل اولی النھی وعلی آلہ و اصحابہ الذین ھم بدور الھدیٰ.

امابعد: یہ ایک رسالہ ہے جس میں دعاء ''سری'' کا مندوب ومستحب ہونا اور مروجہ دعا ''جہری'' کا بدعت ہونا قرآن، حدیث اور فقہ کی روشنی میں ثابت کیا گیا ہے اوراس کے لکھنے کی وجہ یہ ہوئی کہ جب بعض جگہوں پر مستحب ومندوب طریقہ پر دعاء سری کی گئی تو عوام میں ایک ہیجان وتردد پیدا ہوگیا، کیوں کہ انہوں نے اس کورواج ورسم کے خلاف پایا، اوربعض جگہ دعاء جہری کواس درجہ تک پہنچادیا گیا ہے کہ جب وہاں طریق مستحب کواختیار کرتے ہوئے سری دعا کی گئی تو فساد ونزاع تک نوبت پہنچی اوربعض جگہ اس امام کو جوسری دعاء کرتا ہے برطرف کردیا گیااورامامت سے الگ کردیا گیا۔

یہ سب حالات دیکھ کر خیال ہوا کہ اس فساد عقیدہ وعمل کی اصلاح نہایت ضروری ہے، چناں چہ راقم السطور نے ایک رسالہ عربی میں لکھ کر حضرت مرشدی مسیح الامت دامت برکاتہم کی خدمتِ اقدس میں پیش کیا، حضرت نے دیکھ کر فرمایا کہ عربی میں نفع عام نہیں ہوتا، اس لیےاس کواُردو میں منتقل کردیا جائے، اسی حکم کی تعمیل میں یہ اُردو رسالہ لکھا جارہا ہے، جوترتیب کے لحاظ سے عربی رسالہ سے مختلف ہے، نیزبعض جگہ مضامین میں ترمیم واضافہ بھی ہوا ہے، اس رسالہ کو میں نے چند فصول پر

مرتب کیا ہے۔

فصل اول میں دعاء سری کا استحباب ہونا ثابت کیا گیا ہے، دوسری فصل میں دعاء سری کے فوائد عظیمہ بیان کیے گئے ہیں، تیسری فصل میں ان حضرات کے دلائل کے جوابات دیئے گئے ہیں جو دعاء میں جہر کو افضل قرار دیتے ہیں، چوتھی فصل میں دعاء جہری کے احکام بالتفصیل مذکور ہیں۔

ناظرین کرام سے گذارش ہے کہ اگر کچھ سہو وخطا پائیں تو دامنِ عفو میں جگہ دے کر اطلاع دینے کی زحمت گوارہ فرمائیں اور اپنی دعوات صالحہ میں احقر کو فراموش نہ کریں۔

فقط

محمد شعیب اللہ خان المفتاحی

آرمسٹرانگ روڈ، محلّہ بیدواڑی، بنگلور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فصل اول

دعا میں سر و اخفا کا مستحب ہونا

اصل و افضل دعاء میں سر و اخفاء ہی ہے؛ بل کہ سر و اخفاء تمام ہی اذکار و ادعیہ میں اصل اور مندوب و مستحب ہے اور دعاء سری کا مستحب ہونا، قرآن، حدیث اور اجماع سب سے ثابت ہے، جس سے خود بخود دعاء میں جہر کا غیر مستحب ہونا معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم دلائلِ شرعیہ ذکر کرتے ہیں۔

دلائل قرآنیہ

سب سے پہلے ہم قرآنی دلائل ذکر کرتے ہیں:

(۱) ﴿اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً اِنَّهٗ لَايُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ﴾ (الاعراف: ۵۵)

(اپنے رب سے گڑگڑا کر اور آہستہ سے دعاء کرو، بلاشبہ اللہ تعالیٰ حد سے گذر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا)

اس آیت شریفہ میں حضرت حق جل مجدہ نے دعا کا حکم دیتے ہوئے لفظ

''خفیۃ'' کو بصراحت ذکر فرمایا ہے، اور بلاغت کا قاعدہ ہے کہ کلام میں اگر قید مذکورہ ہو تو قید ہی مقصودِ کلام ہوتی ہے، لہٰذا مقصودِ باری تعالیٰ خفیۃً دعاء کا امر کرنا ہے نہ کہ مطلق دعاء کا، پس اس آیت سے صاف معلوم ہوا کہ دعا میں اخفاء مقصود ومطلوب ہے، لہٰذا یہ مندوب واصل ہے۔

چناں چہ امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کبیر میں اسی آیت کے تحت فرماتے ہیں:

''اعلم ان الاخفاء معتبرفی الدعاء ویدل علیه وجوه، الاول هذه الآیة فانهانزل علی أنه تعالی اَمَرَ بالدعاء مقروناً بالاخفاء وظاهرالامرِ الوجوبُ فان لم یحصل فلااقل من کونہ ندباً.'' (۱)

(جاننا چاہیئے کہ دعاء میں اخفا کا اعتبار کیا گیا ہے اور اس پر بہت سے دلائل ہیں، اول یہی آیت ہے کہ یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کا حکم اخفا کے ساتھ ساتھ دیا ہے اور ظاہر امر وجوب کے لیے ہوتا ہے، اگر وجوب حاصل نہ ہو تو استحباب سے تو کم نہیں)

حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مطلق دعا کا حکم نہیں فرمایا؛ بل کہ اس دعا کا امر فرمایا ہے جو اخفاء کے ساتھ مقرون ہو، اور امر کا اصل تقاضا تو یہ ہے کہ آہستہ دعاء کرنا واجب ہو کیوں کہ اصول فقہ کا قاعدہ ہے کہ امر وجوب کے لیے ہوتا ہے اور اگر بعض دوسرے دلائل کی وجہ سے وجوب حاصل نہ ہو تو پھر استحباب تو حاصل ہو ہی جائے گا، لہٰذا دعاء کا اخفاء کرنا مستحب ومندوب ہوگا، اس سے کم نہیں ہوگا۔

---

(۱) تفسیر کبیر: ۱۳/۱۴۶

(۲) ﴿وَاِذَاسَأَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّی فَاِنِّی قَرِیبٌ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ﴾ (البقرة :۱۸۶)

(اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ) اے نبی ا! جب میرے بندے آپ سے سوال کریں میرے بارے میں تو (آپ کہہ دیجئے) کہ میں قریب ہوں میں دعاء کرنے والے کی دعاء جب وہ دعاء کرے قبول کرتا ہوں۔)

اس آیتِ شریفہ کے شانِ نزول سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت میں بھی دعاء میں آواز پست کرنے اور بلند نہ کرنے کی تلقین وتعلیم کی گئی ہے۔ چناں چہ **المحدث البغوی** نے **معالم التنزیل** (۱/۲۳۷) میں حضرت ضحاک سے اور علامہ سیوطی رحمہ اللہ نے جلالین میں علامہ بیضاوی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر بیضاوی میں اور حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے بدائع الفوائد میں اس کا شان نزول یہ بیان کیا ہے کہ (بعض) صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! کیا ہمارا رب ہم سے قریب ہے کہ ہم اس سے مناجات وسرگوشی کریں یا ہم سے دور ہے کہ ہم اس کو ندادیں اور پکاریں؟

اس سوال کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ حضرت حق جل مجدہ کو پکارنے اور آواز دینے کی ضرورت نہیں کیوں کہ وہ قریب ہے۔ لہٰذا مناجات وسرگوشی پر اکتفاء کرنا چاہئے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس شان نزول کو نقل کرکے فرماتے ہیں:

”وَهٰذَا یَدُلُّ علی إرشادهم المناجاة فی الدُّعاء لا لِلنّداءِ الذی هو رفع الصوت فإنهم عن هذا سألوا، فأجیبوا بأنَ

ربُّھُمْ تبارکَ وَتعالیٰ قریبٌ لایحتاجُ فی دعائہٖ الی النداء وإنما یسأل مسئلة القریب المناجی لا البعید المنادی." (۱)

(یہ شان نزول اس پر دلالت کر رہا ہے کہ صحابہ کرام کو دعاء میں مناجات (سرگوشی) کی تعلیم دی گئی ہے نہ کہ ندا دینے کی، جو آواز بلند کرنے کا نام ہے کیوں کہ انہوں نے اسی کے بارے میں سوال کیا تھا، پس ان کو یہ بتلایا گیا ہے کہ ان کا رب قریب ہے، اس سے دعاء کرنے میں اس کو پکارنے یا چلّانے کی ضرورت نہیں، لہذا اس سے قریب سے سرگوشی کرنے والے کی طرح مانگے نہ کہ دور سے پکارنے والے کی طرح)۔

اس آیت سے بھی دعاء میں اخفاء کا اصل و مستحب ہونا؛ بل کہ مامور بہ ہونا خوب واضح ہوگیا۔

(۳) ﴿ذِکرُ رَحمتِ رَبّکَ عَبْدَہٗ زَکَرِیاً اِذنادٰی رَبَّہٗ نِدآءً خَفِیاً﴾ (مریم:۳۲)

(یہ تذکرہ ہے تیرے پروردگار کی اپنے بندے زکریا (علیہ السلام) پر رحمت کا جب کہ انہوں نے اپنے رب کو آہستہ آواز سے پکارا تھا)۔

حضرت زکریا علیہ السلام نے آخری عمر میں جو دعاء کی تھی کہ میں بوڑھا ہوگیا ہوں، میرے بال پک گئے ہیں اور ہڈیاں ضعیف و ناتواں ہو چکی ہیں۔ یہ دعاء جیسا کہ حضرت حق جل مجدہ نے تشریح فرمائی ہے، اخفاء اور پست آواز سے کی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر پسند آیا کہ اس دعاء سری کا مقام و مدح و تعریف میں تذکرہ

(۱) بدائع الفوائد: ۳/۵۱۹

فرمایا۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ آہستہ دعاء کرنا اللہ تعالیٰ کومحبوب وپسند ہے۔ لہٰذا دعائے خفی وسری مستحب ہوگی۔

ایک شبہ اور جواب

اگر کسی کوشبہ ہو کہ آیت میں کہا گیا ہے کہ حضرت زکریا عَلَيْهِ السَّلَامُ نے نداء دی، جو اس طرف مشیر ہے کہ دعاء میں آواز بلند کی گئی تھی، تو اس کا جواب یہ ہے کہ عرف کے لحاظ سے اگرچہ نداء اس دعاء کو کہتے ہیں جس میں آواز بلند کی گئی ہو، لیکن لغت کے لحاظ سے لفظ نداء عام ہے اور مطلق دعاء کے لیے استعمال ہوتا ہے، اس لیے کہا جائے گا کہ یہاں لفظ نداء لغوی معنی میں استعمال ہوا ہے، یہی وجہ ہے کہ نداء کو خفی سے موصوف ومقید کیا ہے، ورنہ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ ندا بمعنی عرفی لے کر اس کو خفی سے مقید بھی کریں۔(فافھم)

دلائل حدیثیہ

قرآن کے بعد نمبر ہے احادیث وراویات کا اور ان میں بھی دعاء وذکر کے خفی وسری ہونے کو مستحب وافضل بتایا گیا ہے۔

(۱) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جب بلند آواز سے تکبیر کہی اور اللہ کو پکارا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

"اِرْبعوْاعَلیٰ اَنْفُسِکُمْ اِنَّکُمْ لاتَدْعُوْنَ اَصَمَّ ولاغَائِباًاِنَّکُمْ تَدْعُوْنَ سَمِیْعاً اَقْرَبَ اِلیٰ اَحَدِکُمْ مِنْ عُنُقِ رَاحِلَتِه (او کماقال)." (۱)

(اپنی جانوں پر رحم کرو تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو؛ بل کہ تم تو سمیع اور قریب کو پکار رہے ہو جو تم سے ہر ایک کے اس سے زیادہ قریب ہے جتنا کہ کوئی اپنی سواری کی گردن سے قریب ہوتا ہے)

اس حدیث میں صحابہ کرام کو بلند آواز سے تکبیر کہنے پر جو کہ دعاء ہی ہے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی ہے اور اس پر کراہت کا اظہار فرمایا۔ معلوم ہوا کہ دعاء میں آواز کا بلند کرنا محبوب نہیں؛ بل کہ آواز کا پست کرنا ہی افضل ومحبوب ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اگر کوئی کہنے لگے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا قول "اِرْبَعُوْا علیٰ انفسِکُمْ"

---

(۱) بخاری: ۲۷۷۲، مسلم: ۴۸۷۴

سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہی شفقت ہے تو اس سے جہر کی کراہت وعدم مشروعیت کیسے لازم آئی ؟ تو میں کہتا ہوں کہ یہ اگر نہی شفقت ہے تو بلا شبہ جہر کی عدم مشروعیت اس سے ثابت نہیں ہوتی اور نہ ہم اس کی عدم مشروعیت کے قائل و مدعی ہیں؛ بل کہ ہم جہر کی مشروعیت و جواز پر آگے مستقل فصل میں بحث بھی کریں گے؛ لیکن یہاں اس فصل میں ہمیں صرف یہ ثابت کرنا ہے کہ جہر مطلقاً افضل و مستحب نہیں؛ بل کہ واقعہ اس کے خلاف ہے اور اس حدیث سے ہمیں صرف اس قدر بات اخذ کرنی ہے کہ اگر جہر مطلقاً افضل ہوتا اور شرع میں کوئی درجہ استحباب وندب رکھتا تو بہ طور شفقت ہی سہی اس سے منع کیسے کیا جاتا، کیوں کہ ایسی چیز سے منع کرنا گویا ایک اچھی چیز سے روکنا ہے حالاں کہ ایسا ممکن نہیں۔

حاصل یہ کہ نہی شفقت بھی اسی فعل پر ہوگی جو محمود و مستحب فی نفسہٖ نہ ہو۔ پس جہر بالدعاء بھی مستحب نہ ہوگا؛ بل کہ محض جائز ہوگا، جیسا کہ آگے آرہا ہے۔ (فافهم)

(۲) مسند ابویعلی میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا ہے:

”وہ ذکر خفی جس کو فرشتے بھی نہ سن سکیں ستر درجہ دو چند ہوتا ہے۔ جب قیامت میں حق تعالیٰ شانہ تمام مخلوق کو حساب کے لیے جمع فرمائیں گے اور کراماً کاتبین اعمال نامے لے کر آئیں گے تو ارشاد ہوگا کہ فلاں بندہ کے اعمال دیکھو اور کچھ باقی ہے؟ وہ عرض کریں گے کہ ہم نے کوئی بھی ایسی چیز نہیں چھوڑی جو نہ لکھی ہو اور محفوظ نہ ہو تو ارشاد ہوگا کہ ہمارے پاس اس کی ایسی نیکی ہے جو تمہارے علم میں نہیں، وہ ذکر خفی ہے۔“(۱)

---

(۱) مسند أبي يعلى: ۱۸۲/۸

(۳) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے منقول ہے:

''جس ذکر کو فرشتے بھی نہ سن سکیں وہ اس ذکر پر جس کو وہ سن لیں ستر درجے بڑھا ہوا ہے۔''(۱)

(۴) حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:

''بہترین ذکر، ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کفایت کا درجہ رکھتا ہو۔''(۲)

(۵) ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد نقل کیا گیا ہے:

''اللہ کو ذکر خامل سے یاد کیا کرو، کسی نے دریافت کیا کہ ذکرِ خامل کیا ہے؟ ارشاد فرمایا کہ مخفی ذکر۔''(۳)

(۶) حضرت عبادہ ابن الصامت رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے:

''بہترین ذکر ذکر خفی ہے اور بہترین رزق وہ ہے جو کافی ہو جائے۔''(۴)

ان پانچ روایات کو حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا صاحب رحمہ اللہ نے بھی اپنی کتاب فضائل ذکر میں نقل فرمایا ہے اور آخری روایتِ عبادۃ کے بارے میں لکھا ہے:

---

(۱) ابن ابی شیبہ :۶/۸۵،شعب الایمان :۱/۴۰۷

(۲) صحیح ابن حبان :۳/۹۱،موارد الظمآن :۱/۵۷۷،ابن ابی شیبہ :۷/۸۴

(۳) کتاب الزھد ابن مبارک: ۱/۵۰،الجامع الصغیر:

(۴) مسند احمد:۱/۱۸۰،مسندابویعلی :۲/۸۱،شعب الایمان :۷/۲۹۷

''ابن حبان اور ابو یعلی نے اس حدیث کو صحیح بتایا ہے۔ ان سب روایات سے بھی ذکر خفی کا افضل و بہتر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اس میں اگر چہ ذکر کا بیان ہے؛ مگر یہ لفظ دعاء کو بھی شامل اور عام ہے؛ بل کہ ایک ابنِ حبان کی روایت میں یہ بھی آیا ہے کہ ''خیر الدعاء الخفی'' (کہ بہترین دعاء خفی و سری ہے)''(۱)

(۷) « روی ابن السنی عن ابی امامة رضی اللّٰہ عنه مادنوتُ مِن رَسُولِ اللّٰهِ فِی دُبُرِصَلوٰةٍ مَکْتوبةٍ وَلاتَطوّعٍ اِلَّاسَمِعْتُه یقول اَللّٰهُمَّ اغفِرْلِی ذُنُوبِی وَخَطَائِی کُلَّهَااَللّٰهُمَّ انعِشْنِی وَاجْبُرْنِیْ وَاهْدِنِی لِصَالِحِ الاعمالِ والاخلاقِ اِنهٗ لایهدِی لِصَالِحِهَاوَلایَصْرِفُ سَیِّهَااِلَّا اَنْتَ. »(۲)

(محدث ابن السنی رحمہ اللہ نے حضرت ابوامامۃ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ فرمایا میں جب بھی فرض یا نفل نماز کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب ہوا تو ہمیشہ یہ دعا کرتے ہوئے سنا کہ اے اللہ! میرے گناہ اور تمام خطائیں معاف فرما دیجئے۔ اے اللہ! مجھے بلند کیجئے اور میرے نقصان کی تلافی فرمایئے اور مجھے عمدہ اعمال و اخلاق کی ہدایت فرمایئے کیوں کہ اچھے اعمال و اخلاق کی طرف آپ کے سوا کوئی ہدایت نہیں کر سکتا۔ اور نہ برے اعمال و اخلاق کو سوائے آپ کے کوئی ہٹا سکتا ہے۔)

---

(۱) اس حدیث کو بحوالہ بحر الرائق، فتح الملهم ۲: ۵۲/۲، میں نقل کیا گیا ہے

(۲) معجم کبیر طبرانی: ۸/۲۰۰

اس حدیث سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے بعد آہستہ دعاء فرماتے تھے، ورنہ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ کو قریب سے سننے کی کیا ضرورت تھی۔ اور اس حدیث میں اس امر کی بھی تصریح ہے کہ یہ آپ کا دعاء سری کرنا فرض و نفل ہر دو نمازوں کے بعد تھا، صرف سنن و نوافل کے بعد کا عمل نہیں۔ نیز یہ بھی واضح رہے کہ یہ صحابی ابوامامہ رضی اللہ عنہ صرف ایک وقت کا یا کبھی کسی وقت کا نہیں؛ بل کہ آپ کا استمراری و دوامی فعل نقل کر رہے ہیں کہ جب بھی میں قریب ہو کر سنا تو آپ یہ پڑھتے ہوتے۔ معلوم ہوا کہ یہ آپ کا امر اتفاقی نہیں؛ بل کہ دوامی عمل و معمول تھا۔

علامہ ابن القیم رحمہ اللہ نے بدائع الفوائد میں اور امام رازی رحمہ اللہ نے تفسیر کبیر میں حضرت حسن بصری (۱) رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے:

"قال الحسن بين دعوة السر ودعوة العلانية سبعون ضعفاً." (۲)

(حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علانیہ دعاء اور سری دعاء کے درمیان ستر درجوں کا فرق ہے)

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کی شخصیت سے کون ناواقف ہوگا، سبھی جانتے ہیں

---

(۱) حافظ ابن قیم اور امام رازی نے اس جگہ مطلقاً بلانسبت حسن لکھا ہے اور علماء نے فرمایا ہے کہ کتب تفسیر یا ابحاث تفسیر یہ میں حسن کا اطلاق کیا جائے تو مراد حسن بصریؒ ہوتے ہیں۔ اس لیے ہم نے یہاں حسن بصریؒ لکھ دیا ہے، پھر اس کے بعد جب معالم التنزیل للمحدث البغوی ۲۴/۸ دیکھا تو اس میں امام بغویؒ نے اس قول کو حسن بن علی رضی اللہ عنہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ پس اگر یہ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہ کا قول ہے تو پھر اس کے وقوع حکمی ہونے میں کوئی کلام نہیں جب کہ اس کے بعد کے راویوں کا حال معلوم ہو جائے۔ فقط

(۲) بدائع الفوائد: ۳/۵۱۷ و تفسیر کبیر: ۱۴/۱۰۷

کہ آپ تابعی اور ایک بلند پایہ محدث اور وقیع النظر فقیہ تھے۔ان کا بیان ہے کہ دعاء سری میں ستر درجے زیادہ فضیلت ہے اور ظاہر ہے کہ یہ مراتب کا فرق ودرجات کا تفاوت کوئی رائے اور قیاس کی چیز نہیں ہے؛ بل کہ یہ امر غیر معقول محض نقل سے متعلق ہے۔ اس لیے حسن بصری رحمہ اللہ جو کہ سب کے نزدیک ثقہ ہیں، اپنی طرف سے تو یہ نہیں کہہ سکتے؛ بل کہ کسی صحابی سے سن کر ہی کہہ سکتے ہیں اور صحابی بھی اس کو اپنی جانب سے نہیں کہہ سکتے ؛بل کہ وہ بھی سرکار دو عالم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سن کر کہہ سکتے ہیں۔اس بنا پر یہ حکم کہ دعاء سری وجہری میں ستّر درجوں کا تفاوت ہے، مرفوع حدیث کے حکم میں ہوگا؛ کیوں کہ صحابہ کرام کے غیر قیاسی اقوال احادیث مرفوعہ کے حکم میں ہوتے ہیں جیسا کہ محدثین واصولیین نے تصریح کی ہے، لیکن چوں کہ یہاں صحابی کا نام مذکور نہیں، اس لیے یہ حدیث مرسل کے حکم میں ہوگی؛ کیوں کہ مرسل اس روایت کو کہتے ہیں جس میں تابعی بلاواسطہ صحابی کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کریں۔

چناں چہ حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ نے ایک تابعی حضرت موسیٰ بن طلحہ رحمہ اللہ کا ایک غیر مدرک بالقیاس قول نقل کر کے اپنی کتاب ''التلخیص الکبیر'' میں فرمایا:

> ''قلت هذاموقوف علىٰ موسىٰ بن طلحةؒ ولكنّه في حكم المرفوع لان هٰذا لايقال من قبل الراى فهوعلى هذامرسل.'' (۱)

(میں کہتا ہوں کہ یہ (قول) موسیٰ بن طلحہ رحمہ اللہ پر موقوف ہے

---

(۱) التلخیص الحبیر: ۳۴/۱

لیکن یہ مرفوع کے حکم میں ہے؛ کیوں کہ بات رائے اور قیاس سے نہیں
کہی جاسکتی، پس اس بنا پر یہ مرسل ہے)

مطلب اس عبارت کا وہی ہے جو اوپر کی سطور میں ہم نے وضاحت سے لکھا ہے۔ پس یہ حسن بصری رحمہ اللہ کا قول بھی مرسل حدیث کے حکم میں ہوگا اور مرسل کی حجیت کے سب قائل ہیں سوائے امام شافعی رحمہ اللہ کے اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک بھی اگر مرسل دوسرے مرفوعات ومسندات سے یا آیتِ قرآنی سے یا فتاویٰ صحابہ سے مؤید ہوتو مقبول وقابل احتجاج ہوجاتا ہے اور یہاں ایک مرفوع صحیح حدیث بھی اس کی تائید کرتی ہے کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ قول ابوالشیخ نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ ایک سری دعاء ستّر جہری دعاؤں کے برابر ہے (کذافی العزیزی: ۲/۲۹) اس طرح جو روایات اوپر گذری ہیں وہ بھی اس قول کی تائید کرتی ہیں، پس یہ مرسل بھی سب کے نزدیک قابل احتجاج ہے۔ البتہ اتنی بات رہ جاتی ہے کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کے بعد رواۃ کون ہیں اور کیسے ہیں اس کی مجھے تحقیق نہیں۔ پس اگر ان رواۃ کا ثقہ ہونا معلوم ہوجائے تو یہ روایت مرفوع حکمی مرسل ہوگی۔

ایک سوال اور جواب

یہاں کوئی یہ سوال کرسکتا ہے کہ اوپر کے بعض دلائل میں دعاء کا ذکر نہیں ہے۔ بل کہ تکبیر و ذکر اللہ کا بیان ہے اور ذکر ہی کے اخفاء کا استحباب ثابت ہوتا ہے نہ کہ دعاء سری کا تو پھر دعوی اور دلیل میں مطابقت نہ ہوئی کہ دعویٰ تو ہے دعاء سری کا مستحب ہونا اور دلیل میں ذکر سری کا مستحب ہونا ثابت کیا گیا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دعاء بھی دراصل ایک ذکر ہی ہے؛ کیوں کہ دعاء کے

معنی طلب کرنے یا پکارنے کے ہیں اور دعاء میں اللہ کو پکارا جاتا ہے اور ذکر میں بھی اللہ کو پکارا جاتا ہے اور اس کو طلب کیا جاتا ہے، اس لیے ذکر کو دعاء کہا جاتا ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں ہے کہ ''**افضل الدعاء الحمد للّٰه**''، یعنی اللہ کی تعریف کرنا سب سے افضل دعاء ہے۔ اس میں آپ نے الحمد للہ کو دعاء؛ بل کہ افضل دعاء فرمایا ہے۔ حالاں کہ الحمد للہ محض ثناء وذکر ہے۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ اس کی وجہ بیان کرتے ہیں کہ حمد محبت کو متضمن ہے کہ کسی کی تعریف اس سے محبت ہی کی وجہ سے کی جاتی ہے اور محبت طلب محبوب کے اعلیٰ انواع واقسام میں سے ہے، لہٰذا حمد کرنے والا اپنے محبوب کا طالب ہے، اس لیے حمد کرنے والے کو داعی کہنا زیادہ مناسب ہے اس کو داعی کہنے سے جو اپنی حاجت طلب کر رہا ہے، پس تعریف کرنے والا، ذکر کرنے والا بھی دعاء کرنے والا ہی ہے اور ذکر دعاء ہی ہے۔ (۱)

غرض یہ کہ ذکر تو افضل دعاء ہے، جب افضل دعاء کا حکم معلوم ہو گیا کہ سر واخفاء سے ہونا چاہیے تو دیگر ادعیہ کا حکم بھی معلوم ہو گیا کہ وہ بھی اخفاء سے ہونا چاہیے، یہی مستحب ہے۔

اجماع ائمہ امت

دعاء سری کا مستحب وافضل ہونا قرآن وحدیث سے ثابت ہو گیا۔ اس بنا پر علماء امت وائمہ ملت خصوصاً ائمہ اربعہ کا اس بات پر اجماع ہے کہ دعاء سری وخفی ہی افضل ومستحب ہے، اس میں اختلاف صرف ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ کا ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے **فتح الملهم** شرح مسلم میں علامہ ابن بطال رحمہ اللہ سے

(۱) بدائع الفوائد: ۵۲۱/۳

نقل فرمایا ہے۔

''اَصْحَابُ الْمَذَاهِبِ الْمُتبعةِ وَغَيْرُهُمْ مُتَّفِقُوْنَ عَلٰى عَدَمِ اِسْتِحْبَابِ رَفْعِ الصَّوْتِ بِالتَّكْبِيْرِ وَالذِّكْرِ حاشَاابن حزم رَحِمَهُ اللهُ .'' (١)

(مذاہب (اربعہ) والے جن کی اتباع واقتداء کی جاتی ہے ،وہ اوران کے علاوہ دوسرے حضرات اس پر متفق ہیں کہ تکبیر اور ذکر میں آواز بلند کرنا مستحب نہیں ہے سوائے ابن حزم رَحِمَهُ اللهُ کے۔)

اور علامہ نووی رَحِمَهُ اللهُ شارح مسلم نے بھی اپنی شرح مسلم میں ابن بطال رَحِمَهُ اللهُ سے اسی طرح نقل کیا ہے اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رَحِمَهُ اللهُ اپنے رسالہ استحباب الدعوات میں فرماتے ہیں:

''اِعْلَمْ اَنَّهُ لاخلافَ بَيْنَ مَذَاهب الْاَرْبَعَةِ فِي نُدْب لِدُعَاءِ سرًّا وَالفذ.'' (٢)

(جاننا چاہیے کہ اس بات میں کہ امام ومنفرد دونوں کے لیے دعاء سری مندوب ومستحب ہے، چاروں مذاہب میں سے کسی کا اختلاف نہیں۔)

اور حضرت شیخ الحدیث مولانا زکریا رَحِمَهُ اللهُ اپنی کتاب ''الابواب والتراجم'' میں نقل فرماتے ہیں:

''ثمّ رفع ُالصّوتِ بالذّکرلمْ یقُلْ بِهٖ اَحَدٌ مِنَ الائمة

---

(١) فتح الملهم: ٢/١٧

(٢) استحباب الدعوات مندرجہ امداد الفتاوی: ١٠٨

والفقهاء الاّ ابن حزم." (۳)

(پھر ذکر میں آواز بلند کرنا ائمہ اور فقہاء میں سے کسی کا قول نہیں سوائے ابن حزم کے۔)

ان نقول معتبرہ سے معلوم ہوا کہ فقہاء حنفیہ، شافعیہ، مالکیہ اور حنابلہ اور ان کے علاوہ دیگر علماء وائمہ سب کے نزدیک دعاء سری ہی مستحب ہے اور جہر کے استحباب کا سوائے علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ اور بعض حضرات کے کوئی قائل نہیں تو یہاں اگرچہ اجماع امت کا تحقق تو نہیں لیکن اس میں کیا شک کہ جمہور ائمہ اور خصوصاً مذاہب اربعہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سری ہی مستحب ہے۔

---

(۳) الابواب والتراجم: ۳۰۴/۲

فصل ثانی

دعائے سری کے فوائد

حافظ ابن القیم رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''بدائع الفوائد'' میں دعاء سری کے متعدد فوائد بیان کیے ہیں۔ جن کو مولانا ادریس صاحب کاندھلوی رَحِمَہُ اللّٰہُ نے ''التعلیق الصبیح'' میں نقل فرمایا ہے۔ ہم یہاں پر ان کی تلخیص کرتے ہیں۔

پہلا فائدہ

دعاء سری میں پہلا فائدہ تو یہ ہے کہ یہ اعظم ایمان ہے۔ کیوں کہ دعاء سری کرنے والا (بزبانِ حال گویا یوں کہتا ہے) کہ وہ اس بات کو خوب جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس دعاء خفی کو بھی سنتا ہے اور وہ اس جیسا نہیں جس نے یہ کہہ دیا تھا کہ اگر ہم زور سے دعاء کریں تو اللہ تعالیٰ سنتا ہے اور اگر ہم اخفاء کریں تو نہیں سنتا۔ حاصل یہ کہ دعاء سری کرنا گویا اللہ کی صفات پر ایمان کی پختگی کی علامت ہے، اس لیے یہ اعظم الایمان ہے۔

دوسرا فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء اور سر ادب و تعظیم میں بڑھا ہوا ہے، اسی لیے بادشاہوں سے بلند آواز سے خطاب و سوال نہیں کیا جاتا۔ البتہ بادشاہوں کے پاس اس قدر اخفاء کیا جاتا ہے کہ وہ اس کو سن سکیں۔ جو شخص ان کے سامنے آواز بلند کرتا ہے وہ ان کے غیض وغضب کا نشانہ بنتا ہے اور خداوند تعالیٰ تو دعاء خفی واخفی کو بھی سنتا ہے تو اس کے بارگاہِ عالی و دربار اقدس میں سوائے اخفاء واسرار کے کوئی چارہ نہیں، کیوں کہ

آواز بلند کرنا ادب اور تعظیم کے خلاف ہے۔

تیسرا فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء کرنا، آہ وزاری اور خشوع میں کہ یہی دعاء کی روح اور مغز ہے مبالغہ پیدا کرتا ہے اور خشوع وتضرع کرنے والا دراصل اس مسکین وذلیل کی طرح سوال کرنے والا ہے جس کا قلب ٹوٹا ہوا ہو اور اعضاء نڈھال ہو چکے ہوں اور اس کی آواز دب چکی ہوحتی کہ اس کی وجہ سے اس کی ذلت ومسکنت، انکسار وتضرع اب اس حد تک پہنچنے کے قریب ہو کہ اس کی زبان بھی منکسر ہو جائے اور وہ بول نہ سکے، پس اس کا قلب تو سائل ہے اور زبان ساکت ہے۔ جب دعاء کرنے والے کی یہ حالت ہوتی ہے تو بھلا اس حالت کے ساتھ وہ آواز بلند کیسے کرسکتا ہے جب کہ حالت تخشع وتضرع سے زبان ہی ساکت ہے۔ حاصل یہ ہے کہ دعاء کرنے والا ایسے دعاء کرے جیسے کہ اوپر بیان کیا گیا ہے پھر خود ہی جہر کرنا دشوار ہو جائے گا اور اگر جہر کرے گا تو روحِ دعاء یعنی خشوع وخضوع میں خلل واقع ہوگا۔

چوتھا فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء کرنا اور اِسرار کرنا اخلاص میں مبالغہ پیدا کرتا ہے کہ ریاء کا اس میں اندیشہ نہیں یا بہ نسبت جہر کے کم ہے۔ اور اخلاص مطلوب ومامور بہ ہے تو اخفاء بھی کہ اس کا ذریعہ ہے مطلوب ہوا۔

پانچواں فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء وسر سے دعاء میں جمعیت قلب بھی پیدا ہوتی ہے، برخلاف اس کے آواز کا بلند کرنا قلب کو منتشر کر دیتا ہے اور دل کو بانٹ دیتا ہے۔

چھٹا فائدہ

جو کہ نکات عجیبہ میں سے ہے یہ ہے کہ اخفاء کرنا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ دعاء کرنے والا اللہ تبارک وتعالیٰ سے قریب ہے اور وہ اللہ تعالیٰ سے بالکل قریب ہونے کی وجہ سے اس طرح سوال کررہا ہے، جیسے ایک قریب دوسری قریب چیز سے سوال کرتا ہے اور ایک دوست دوسرے دوست سے مناجات وسرگوشی کرتا ہے، اس طرح نہیں جیسے ایک غیر دوسرے غیر سے منادی کرتا ہے۔ پس جس کا قلب اس قرب خداوندی کا استحضار کرے گا اور اس کا تصوّر رلائے گا وہ حتی الامکان اخفاء ہی کرے گا اور آواز بلند کرنے کو غیر مستحسن جانے گا۔ پس یہ ایک خاص قرب ہے عام قرب نہیں جو سب (مومن وکافر) کو حاصل ہے (لہٰذا جو شخص دعاء میں جہر کرتا ہے اس کو یا تو یہ قرب حاصل نہیں یا اس قرب کا استحضار نہیں)

ساتواں فائدہ

اخفاء کرنے میں یہ ہے کہ زبان ملال اور اعضاء وجوارح تعب وتکان محسوس نہیں کرتے جس سے دیر تک دعاء ومناجات میں لگے رہنا ممکن ہے، بخلاف اس کے بلند آواز سے دعا کرنے والا جلد تھک جاتا ہے جس سے آگے ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ محروم رہ جاتا ہے۔

آٹھواں فائدہ

یہ ہے کہ اخفاء آدمی کو ہمت توڑنے والی، تشویش میں مبتلا کرنے والی اور ہمت کو پست کرنے والی چیزوں سے دور رکھنے میں مفید ہے کیوں کہ جب وہ اخفاء کرتا ہے تو اس کو کوئی نہیں جانتا لہٰذا تشویش وغیرہ بھی اس کو لاحق نہ ہوگی اور جب

جہر کرے گا تو جنات اور انسانوں کی شریر ارواح اس کو جان کر اسے تشویش میں ڈال دیں گی اور ان ارواح کا تعلق ہی اس شخص کی ہمت کو بانٹ دیتا ہے۔ پس (توجہ کی کمی کی وجہ سے) دعاء کا اثر ضعیف ہو جائے گا اور اس کو دیکھ کر اس کی ہمت ٹوٹ جائے گی اور یہ دعاء ہی سے رک جائے گا، بخلاف اس کے جب اخفاء کرے گا تو اس مفسدہ سے مامون ہوگا۔

نواں فائدہ

جو کہ خاص طور پر سالکینِ طریقت کے لیے انمول جوہر اور نسخۂ بے بہا ہے یہ ہے کہ سب سے بڑی نعمت توجہ الی اللہ اور اللہ کی عبادت اور دنیا سے منقطع ہو کر اس کی طرف ملتفت ومتوجہ ہونا ہے اور یہ سب باتیں دعاء میں ہوتی ہیں، کہ بندہ سب سے الگ ہو کر خدائے عزوجل کی طرف باشتغال کلی متوجہ ہوتا ہے تو دعاء کرنے والے کو یہ نعمت و دولتِ عظیم حاصل ہے جو ساری نعمتوں سے بڑھ کر ہے اور ظاہر ہے کہ ہر نعمت کے خواہ وہ چھوٹی ہو یا بڑی حاسد ہوتے ہیں تو بھلا اس عظیم ترین عبادت کے حاسد کیوں نہ ہوں گے۔ لہٰذا سلامتی کی بات یہ ہے کہ حاسد سے نعمت کو چھپایا جائے اور اس سے اخفاء کیا جائے۔ اسی لیے حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کا خواب سن کر فرمایا تھا کہ تمہارے بھائیوں سے اس خواب کو بیان نہ کرنا کہ کہیں حسد کرنے لگیں۔

حافظ ابن القیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"کتنے صاحب قلب وصاحب حال تھے کہ جنہوں نے اپنے احوال کو دوسروں سے بیان کر دیا اور انہیں اس کی خبر کر دی تو غیروں نے ان احوال وکیفیات کو سلب کر لیا اور یہ لوگ ہاتھ ملتے رہ گئے۔ پس

یہ دعا جس کے اخفا کا حکم ہے، بڑے خزانوں میں سے ہے جس کو
حاسدین کی آنکھوں سے چھپا کر رکھنا چاہئے، اس لیے دعاء خفی وسری
ہونی چاہئے۔''

یہ مختلف فوائد ہیں جن کو ہم نے علامہ ابن القیم رَحِمَہُ اللہُ کے کلام سے اخذ کر کے اپنے الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی دعاء سری میں بے شمار فوائد ہیں جو انسان غور کرے تو خود سمجھ میں آسکتے ہیں۔

فصل ثالث

استحبابِ جہر کے دلائل کا جواب

اب ہم ان لوگوں کے دلائل اور اس کے جوابات کو ذکر کرتے ہیں جو دعاء جہری کے مستحب ہونے کے قائل ہیں۔ ان لوگوں میں سے علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ بھی ہیں۔ ہم یہاں ان کی اصل دلیل کے علاوہ بعض ان دلائل کو بھی معرضِ بحث میں لائیں گے جو ان حضرات کے مستدل بننے کا احتمال بھی رکھتے ہیں۔

استحبابِ جہر کی پہلی دلیل

« عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَضِيَ اللّٰه عنه قَالَ كنتُ اَعْرِفُ اِنْقِضَاءَ صَلوٰةِ رَسُوْلِ اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم بالتَّكْبِيْرِ. » (۱)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز سے فراغت کو تکبیر سے پہچانتا تھا۔)

علامہ ابن حزم ظاہری رحمہ اللہ اور بعض لوگوں نے اس حدیث سے جہر کے مستحب ہونے پر استدلال کیا ہے؛ کیوں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ ہی سے بخاری شریف میں نقل کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بلند آواز سے ذکر ہوتا تھا، جب کہ لوگ فرض نماز سے فارغ ہوتے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ تکبیر و ذکر و دعاء میں جہر مستحب ہے۔

---

(۱) مشکوۃ:۸۸

استدلال مذکور پر نظر

مگر اس حدیثِ ابن عباس سے استحباب جہر پر استدلال محل نظر اور مخدوش ہے؛ کیوں کہ اس میں سنیت واستحباب کے قرائن و آثار معلوم نہیں ہوتے ؛ کیوں کہ سنیت کے لیے مع ترکہ احیاناً ثبوت استمرار شرط ہے اور استحباب میں اگرچہ استمرار و دوام شرط نہیں۔ مگر اس قدر ضروری ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فعل کے ساتھ یا بلا فعل اس پر آپ سے ترغیب منقول و ثابت ہو۔ جیسا کہ کتب فقہ بحر الرائق، در مختار مع رد المختار وغیرہ میں اس کی وضاحت اور تحقیق ہے اور اس حدیث سے صرف اتنا ثابت ہوا ہے کہ عہد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں جہر بالذکر ہوا ہے اور یہ بات کہ آپ کا یہ عمل استمراری تھا یا صحابہ کا فعل دوامی تھا اس پر نہ تو خود حدیث مذکور دلالت کرتی ہے اور نہ ہی خارج سے اس کی تائید ہوتی ہے اور لفظ وصیغۂ ''کان'' سے استمرار و دوام پر استدلال ممکن نہیں اس (لفظ کان) کی تحقیق کچھ آگے چل کر ہم بیان کریں گے۔

پس حاصل یہ ہے کہ سنیت کے لیے استمرار ضروری ہے اور یہ ثابت نہیں اور استحباب کے لیے کم از کم ترغیب ضروری ہے، حالاں کہ جہر پر ترغیب تو درکنار اس کے خلاف سر و اخفاء پر ترغیب کا اوپر ثبوت ہو چکا جس سے خود ہی اس کی عدمِ ترغیب ثابت ہوتی ہے، لہٰذا اس سے نہ سنیت ثابت ہوتی ہے اور نہ استحباب۔

پھر اگر یہ بات سنت یا مستحب تھی تو سوال یہ ہے کہ کیا یہی ابن عباس رضی اللہ عنہ جو اس فعل رسول صلی اللہ علیہ وسلم وفعلِ صحابہ کے ناقل ہیں اس پر عامل تھے؟ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ یہ بات نقل کر رہے تھے اس وقت نہ آپ جہر پر عامل تھے اور نہ ہی دیگر صحابۂ کرام اس کے پابند تھے، ورنہ حضرت ابن

عباس رضی اللہ عنہ یوں نہ کہتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا ہوتا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ تو ابن عباس کے نزدیک کوئی سنت تھی نہ ہی صحابہ کرام کے نزدیک اور ظاہر ہے کہ صحابہ کرام اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دعاء وذکر میں جہر پر استمرار ومداومت کرتے دیکھتے تو کبھی اس کو ترک نہ کرتے۔

محدث ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”وقولُ ابن عباس رضی اللہ عنہ كَانَ عَلَىٰ عهد النبی صلی اللہ علیہ وسلم فِيْهِ دَلَالَةٌ اَنَّهُ لَمْ يَكنْ يفعل حِيْنَ حَدَّث بِهِ لِاَنَّهُ لَوْ كَانَ يَفعل لَمْ يَكُنْ لِقَوْلِهِ معناًفكان التكبيرُ لَمْ يُوَاظِب الرّسول صلی اللہ علیہ وسلم طولَ حياته. (۱)

(حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کے اس قول ”کا ن علی عهدالنبی صلی اللہ علیہ وسلم “ میں اس بات پر دلالت ہے کہ جس وقت انہوں نے یہ حدیث بیان کی ہے تو وہ ایسا نہیں کرتے تھے کیوں کہ اگر وہ ایسا کرتے تھے تو اس قول کے کوئی معنی نہ رہیں گے پس تکبیر پر رسول اللہ نے پوری عمر مواظبت اور ہمیشگی نہیں فرمائی ہے)

حاصل یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تکبیر کہنے پر مواظبت نہیں فرمائی، اس لیے صحابہ نے بھی اس کو ترک فرمایا تھا، ورنہ کیا مجال کے صحابہ اس کو ترک کرتے، جب تکبیر کہنے کا ہی یہ حال ہو تو جہر بالتکبیر تو بدرجۂ اولیٰ اور لازمی طور پر ترک ہوا۔ پس سنیت واستحباب کہاں سے ثابت ہوا۔ اور یہ بات کہ صحابہ کرام نے اس عمل کو ترک کر دیا تھا اس طرح اس روایت سے مستفاد ہوتی ہے ایسے ہی خارج سے بھی

---

(۱) فتح الملہم: ۲/۱۷۱

اس کی تائید اور اس کا ثبوت ملتا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ ۔حضرت حسن بصری رحمہ اللہ (۱) سے صحابہ کرام کا دعاء میں طریق کار نقل فرماتے ہیں:

"وَلَقَدْ كَانَ الْمَسْلمونَ تَجْهِدُوْنَ فِي الدُّعَاء وَمَايُسْمَعُ لَهُمْ صَوت اِنْ كَانَ اِلَّاهَلْساً بَيْنهم وَبَيْنَ رَبّهُمْ وَذٰلِكَ اِنَّ اللّٰهَ تَعَالىٰ يَقُوْلُ اُدعُوْارَبّكَ تضرعاً وخُفية." (۲)

(مسلمان (صحابہ) دعاء کرنے میں بڑی جدوجہد کرتے تھے، اوران کی کوئی آواز نہ سنائی دیتی تھی، بس ان کے اور ان کے پروردگار کے مابین ایک گھس گھسی وکانا پھوسی سی ہوتی اور یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ادعوا ربکم تضراً وخفیۃً۔)

حسن بصری رحمہ اللہ جو صحابہ کرام کے دور میں پلے اور انہیں سے علم وفقہ حاصل کیا یہ فرماتے ہیں:

"صحابہ کرام کا عمل یہ تھا کہ دعاء میں سوائے ایک آہٹ کے ان کی کوئی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام نبی کریم ا کے اس عمل کو سنت نہیں خیال کرتے تھے ورنہ اس کو ہر گز نہ ترک کرتے اور سنت نہ سمجھنا اسی لیے ہوگا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یہ عمل استمراری نہ تھا۔"

یہ تو استدلال پر ردوقدح تھا۔ اب ہم یہاں حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ثابت شدہ جہر کی مصلحت وحکمت پر کلام کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جہر کیوں فرمایا تھا۔

---

(۱) یہاں پر امام بغوی رحمہ اللہ نے حسن بن علی رضی اللہ عنہ لکھا ہے (معالم التنزیل ۲/۸)

(۲) بدائع الفوائد: ۳/۵۱۷، کشاف: ۲/۱۰۶، تفسیر کبیر: ۱۴/۱۰۷

جہر کی وجہ اول

امام نووی رحمہ اللہ نے ''شرح مسلم'' اور علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے ''فتح الملھم'' میں نقل فرمایا ہے:

''حَمَلَ الشافِعِی رحمہ اللہ ھٰذاالْحَدِیث عَلیٰ انّہٗ جَھَرَ لیعلمھم صفة الذّکر لاانّہٗ کَانَ دَائِما.'' (۱)

(امام شافعی رحمہ اللہ نے اس (ابن عباس رضی اللہ عنہ کی) حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ رسول اللہ نے طریقہ ذکر صحابہ کرام کو سکھانے کے لیے جہر فرمایا تھا، یہ بات نہیں کہ ایسا ہمیشہ ہوتا تھا۔)

حاصل یہ ہے کہ آپ نے اس لیے جہر فرمایا تھا کہ لوگوں کو طریقۂ ذکر و دعاء معلوم ہو جائے، کیوں کہ آپ اسی غرض سے مبعوث ہوئے تھے، اگر آپ یہ طریقہ تعلیم نہ فرماتے تو امت کو کیسے معلوم ہوتا کہ ذکر و دعاء کا طریقہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ جو کام کسی ضرورت سے کیا جاتا ہے وہ اس ضرورت کے پورا ہو جانے کے بعد ترک کر دیا جاتا ہے، اسی لیے آپ نے بھی اس کو کبھی کبھی کیا ہے، دائماً واستمراراً نہیں اور احادیث میں اس کی نظیریں ملتی ہیں کہ آپ نے اور آپ کے صحابہ بغرض تعلیم ان چیزوں کو بھی بلند آواز سے پڑھا جو بالاتفاق آہستہ پڑھی جاتی ہیں، تاکہ لوگوں کو ان چیزوں کا علم ہو جائے۔ مثلاً

(۱) حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ظہر اور عصر میں (والسماء والطارق) اور (والسماء ذات البروج) اور اس کے مانند سورتیں

(۱) فتح الملھم: ۲/۱۷۱

پڑھتے تھے۔“(۱)

ظاہر ہے کہ ان صحابی کو ان سورتوں کے پڑھنے کا علم، ظہر اور عصر میں آپ کو پڑھتے ہوئے سنکر ہی ہوا ہوگا اور سننا بلا جہر کے ناممکن، حالاں کہ ظہر وعصر میں اخفاء واسرا احناف کے نزدیک واجب اور شوافع کے نزدیک سنت موکدہ ہے۔

(۲) حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

”کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں ظہر وعصر میں آیت سنا دیتے تھے۔“(۲)

اس میں بھی تصریح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظہر وعصر میں کبھی کبھی زور سے پڑھتے تھے۔ کیوں کہ سنانا جہر کی صورت میں ہوسکتا ہے۔

(۳) دارقطنی نے اپنی سند سے نقل کیا ہے کہ اسود کہتے ہیں:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب نماز شروع فرماتے تو (**سُبْحَانَکَ اللّٰھُمَّ وَبِحَمْدِکَ وَ تَبَارَکَ اسْمُکَ وَتَعَالیٰ جَدُّکَ وَلاَاِلٰہَ غَیْرُکَ**) کہتے اور یہ ہم کو سناتے اور ہمیں تعلیم دیتے تھے۔(۳)

یہ روایت عمر رضی اللہ عنہ مسلم شریف میں بھی ہے جس کو منقطع قرار دیا گیا ہے اس لیے ہم نے دارقطنی کے حوالہ سے بسند صحیح نقل کیا ہے اس میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے ثناء کا زور سے پڑھنا ثابت ہے حالاں کہ کوئی اس کا قائل نہیں؛ بل کہ سب اس کو تعلیم پر محمول کرتے ہیں۔

---

(۱) طحاوی: ۱/۱۰۱

(۲) طحاوی: ۱/۱۰۱

(۳) اخرجه دارقطنی : ۳۰۰،نحوه فی مسلم: ۱/۱۷۲

(۴) بخاری میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

''انہوں نے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ زور سے پڑھی اور نسائی میں یہ بھی ہے کہ انہوں نے سورہ فاتحہ اور دوسری ایک سورہ کو جہر سے پڑھا۔''(۱)

حالاں کہ جن ائمہ کے نزدیک نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھی جاتی ہے، ان کے نزدیک بھی جہر کرنا درست نہیں؛ بل کہ اس کو آہستہ پڑھنا چاہیے، پس یہاں بھی اس کو تعلیم پر محمول کیا جاتا ہے۔

افادہ وانتباہ

اس جگہ یہ بات عرض کر دینا مناسب ہے کہ اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جو یہ معلوم ہو رہا ہے کہ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا چاہیے۔ یہ امام شافعی رحمہ اللہ کا مسلک ہے اور احناف کے نزدیک نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھنا چاہیے۔ یعنی یہ پڑھنا سنت نہیں ہے۔ اور کتب فقہ میں احناف کے مسلک پر مفصل کلام اور ساتھ ہی اس کے دلائل مذکور ہیں۔ جس کو دیکھنا ہو وہ ان کی مراجعت کرے۔ ہم یہاں صرف حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی اور اس روایت کے یہاں سامنے آجانے کی وجہ سے اس کا ایک جواب دیتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ حدیث سے نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کا پڑھنا اگرچہ ثابت ہے لیکن محض ثبوت سے چوں کہ سنیت کا ثبوت نہیں ہوتا؛ بل کہ اس کے لیے استمرار و مداومت شرط ہے، اس لیے نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ بھی سنت نہ ہوگی کیوں کہ اس پر بھی استمرار و مداومت ثابت نہیں البتہ جواز ثابت ہوگا اور احناف اس کے جواز کے قائل ہیں؛ بل کہ بعض علماء احناف نے بطور دعاء سورۂ فاتحہ

(۱) نسائی: ۲۸۱

پڑھنے کو مستحب قرار دیا ہے۔ مگر بطور تلاوت پڑھنا درست نہیں ہے۔

علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کی امالی ''فیض الباری'' میں ہے:

''یہ (یعنی قرأت سورہ فاتحہ) ہمارے نزدیک بھی جائز ہے جیسا کہ امام قدوری رحمہ اللہ کی ''کتاب التجرید'' میں لکھا ہے اور یحییٰ بن منقاری زادہ نے جو علامہ شرنبلالی رحمہ اللہ کے استاذ ہیں اپنے رسالہ ''الاتباع فی مسئلہ الاستماع'' میں اس کے مستحب ہونے کی تصریح فرمائی ہے۔ مگر یہ ہمارے نزدیک مثل ثناء کے ہوگا نہ کہ مثل قرأت کے۔''(۱)

حاصل یہ ہے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا محض جائز ہے یا اگر مستحب بھی ہے تو وہ بطور دعاء کے پڑھا جائے نہ کہ بطور قرأت۔ اور چوں کہ عوام ان دو باتوں میں فرق نہیں کرتے؛ بل کہ عام طور پر فاتحہ کو بطور تلاوت ہی پڑھتے ہیں، اس لیے اس سے منع کیا جائے گا۔ اس کے علاوہ خاص ابن عباس رضی اللہ عنہ کے فعل سے اگر شوافع استدلال کرتے ہیں تو یہ ان کے لیے مضر ہے کیوں کہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے تو سورۂ فاتحہ کے علاوہ دوسری سورت بھی تلاوت کی ہے۔ حالاں کہ اس کا کوئی قائل نہیں، تو شوافع کو چاہئے کہ وہ اس کو بھی اختیار کریں۔

الغرض یہ ایک اختلافی مسئلہ ہے جس میں زیادہ کھود کرید کی ضرورت نہیں۔ ہر ایک اپنے دلائل اپنے پاس رکھتا ہے۔ ہم یہاں پر حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کا ایک فتویٰ ملخصاً نقل کرتے ہیں جس سے انشاء اللہ العزیز ناظرین کو کسی قدر تشفی ہو جائے گی۔

---

(۱) امالی: ۲/۴۷۴

سورہ فاتحہ کے بارے میں حکیم الامت کا فتویٰ

جاننا چاہئے کہ نماز جنازہ میں سنت کا لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ کبھی کبھی بیان جواز کے لیے یا دیگر مصالح شرعیہ کے لیے شارع علیہ السلام نے وہ فعل کیا ہو۔ اس معنی کر نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے سنت ہونے کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے معنی سنت کے یہ ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بقصد احسان یعنی اچھا سمجھ کر وہ کام کیا ہو اور سنت کا اکثر اطلاق اسی دوسرے معنی پر ہوتا ہے۔ اسی معنی کر نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ کے سنت ہونے میں کلام ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ نفی فرماتے ہیں۔ اور دیگر فقہاء اس کے ثابت کرنے کے درپے ہیں۔ علاوہ بریں ابن عمر رضی اللہ عنہ جن کو سنت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت تلاش رہتی تھی اور ان کو اتباع سنت کا شدید اہتمام رہتا تھا، نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ نہیں پڑھتے تھے، جیسا کہ موطا میں امام مالک رحمہ اللہ نے روایت کیا ہے۔ یہ روایت بھی امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی مؤید ہے۔ نیز حدیث ابن ماجہ کے الفاظ (**فأخلصوا لله الدعاء**) بھی امام صاحب کی رائے کے موید ہیں کہ نماز جنازہ دراصل دعاء ہی ہے اور ''اخلصوا'' میں کسی قدر لطیف اشارہ ہے کہ غیر دعاء کو دعاء کے ساتھ نہیں ملانا چاہئے۔ لہٰذا اگر ثناء ودعاء کی غرض سے سورۂ فاتحہ پڑھیں تو اجازت دیں گے اور شارع علیہ السلام کے فعل کو اسی پر محمول کرلیں تو بہت مناسب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ مجتہد کا شرحِ صدر ابن عمر رضی اللہ عنہ کی رائے اور حدیث کا لفظ ''اخلصوا'' حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کی رائے کا موید ہے۔ لہٰذا کتنا اچھا ہے

کہ اگر پڑھیں تو بلا التزام بہ نیت دعاء پڑھیں تا کہ حدیث پر بھی عمل ہوجائے اور ائمہ مجتہدین کے اختلاف سے خروج بھی ہوجائے۔ واللہ اعلم۔ اشرف علی۔ (۱)

اوپر جو نظائر پیش کیے گئے ہیں، ان سے یہ بات واضح ہوگئی کہ بسا اوقات کسی غرض سے ان چیزوں کو بھی جو باتفاق آہستہ ہوجانا چاہئے، بلند آواز سے کیا جاتا ہے۔ علماء احناف نے احادیث سے ثابت جہر بسم اللہ کو اور جہر آمین کو اسی قبیل سے شمار کیا ہے جیسا کہ علامہ کشمیری رحمہ اللہ نے اپنے رسالہ میں تصریح کی ہے۔ (۲)

ایک شبہ کا ازالہ

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے جہر ثابت ہے اور آپ نے یہ جہر بغرضِ تعلیم کیا ہے تو پھر اس کی تعلیم میں خود جہر بھی داخل ہے۔ لہٰذا جہر بھی سنت ہوا کہ آپ نے اپنے عمل سے اس کو ثابت کیا ہے؟

تو اس کا جواب یہ ہے کہ دوسری آیات واحادیث اس کی نفی کرتی ہیں اور خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل اس کی سنیت کی نفی کرتا ہے، لہٰذا ایسی صورت میں جہر کی سنیت کا ثبوت اس سے نہیں ہوسکتا۔ اب رہا یہ کہ آپ نے اس کی بھی تو تعلیم کی ہے تو جواب یہ ہے کہ یہاں محض اس چیز کی تعلیم مقصود ہے جو دعاء میں پڑھا جاتا ہے نہ کہ جہر کی تعلیم، جہر تو محض بضرورت اختیار کیا گیا ہے جیسا کہ اوپر کی نظائر سے یہ بات واضح ہے۔ چناں چہ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ عصر میں آیت کے جہر کرنے کے متعلق فرماتے ہیں:

”ثم اِنَّ الْجَهْرَ بِهَا كَانَ لِلتَّعْلِيمِ اَعْنِىْ بِهٖ تَعْلِيم مَايَقْرأ

(۱) امداد الفتاوی: ۱/۲۳۳ تا ۲۳۴

(۲) فصل الخطاب: ۳۱

لَا تَعْلِيم الْجَهْرِ نفسهُ وَهكذا كَانَ الْجَهرُ بالتسمية فلَمْ يكن سنةً بل تعليماً لما يَقْرأه.'' (۱)

(پھر یہ (عصر میں آیت) جہر سے پڑھنا تعلیم کے لیے تھا، یعنی اس چیز کی تعلیم جو پڑھا جاتا ہے نہ کہ جہر کی تعلیم اسی طرح بسم اللہ کا جہر بھی ہے، پس جہر کرنا سنت نہ ہوگا؛ بل کہ (یہ جہر کرنا) تعلیم کے لیے تھا کہ کیا پڑھے۔)

حاصل یہ ہے کہ کبھی کبھی تعلیم کے لیے کہ دعاء میں کیا پڑھیں اور کس طرح پڑھیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے زور سے دعاء فرمائی ہے؛ مگر اس سے سنیت ثابت نہیں ہوتی، جیسا کہ اور بھی بعض چیزیں آپ نے بلند آواز سے کی ہیں؛ مگر ان کی سنیت کا کوئی قائل نہیں۔

جہر کی دوسری وجہ

بعض علماء نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ جہر کرنا بیان جواز کے لیے تھا، نہ کہ بیان سنیت کے لیے۔

چناں چہ علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ اپنی محققانہ تالیف ''سعایه شرح وقایه'' میں فرماتے ہیں:

''واختار غيره (اى ابن حزم رحمہ اللہ) السر وحملوا حديث ابن عباس رضی اللہ عنہ على الجهراحياناً بياناً للجواز.'' (۲)

(اور ابن حزم رحمہ اللہ کے علاوہ دوسرے علماء نے سر و اخفاء

---

(۱) فيض الباری: ۲/۲۸۴

(۲) سعایه: ۲/۲۶۱

کو اختیار فرمایا اور ابن عباس رضی اللہ عنہ کی حدیث کو ان علماء (جمہور) نے بیان جواز کے لیے کبھی کبھی جہر کرنے پر محمول کیا ہے۔)

اس کی بھی حدیث میں نظیریں ملتی ہیں کہ کبھی کبھی آپ نے بیان جواز کے لیے غیر احسن و غیر مستحب امر بھی کیا ہے، جیسا کہ بخاری شریف میں آپ کا کھڑے ہو کر پیشاب کرنا (اس حکمت کے تحت) منقول ہے، حالاں کہ اس کا غیر مستحسن ہونا سب کے نزدیک مسلم امر ہے۔ حاصل یہ ہے کہ جہر کرنا محض جائز ہے نہ کہ سنت و مستحب اس جواز کو بتلانے کے لیے کبھی کبھی آپ نے ایسا فرمایا ہے۔

جہر کی تیسری وجہ

بعض علماء وائمہ نے جہر کی ایک وجہ یہ بیان فرمائی ہے کہ یہ جہر سفر غزوہ میں دشمن کو خوفزدہ کرنے کے لیے تھا۔

علامہ لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"وَبَعْضُهُمْ حَمَلُوْه عَلیٰ اَنَّهٗ کان فی سفر الغزوة لارهاب العدو کذافی عمدة القاری." (۱)

(بعض علما نے اس حدیث کو اس پر محمول کیا ہے کہ یہ (جہر کرنا) سفر غزوہ میں تھا تا کہ دشمن کو خوف زدہ کیا جائے۔)

معلوم ہوا کہ جمہور علماء وائمہ کے نزدیک حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ سے جہر کی سنیت پر استدلال صحیح نہیں اور اس کے محامل مختلف ہیں۔ انہیں محامل پر اس حدیث کو رکھنا چاہئے۔ پس اگر تعلیم کی غرض سے باآواز بلند دعاء کی جائے تو درست ہے؛ مگر تعلیم تو ساری عمر نہیں ہوتی، چند دن ہوتی ہے، اس لیے چند دن ایسا کرے تو مضائقہ

(۱) سعایہ: ۲/۲۶۱

نہیں۔ جب لوگ سیکھ لیں تو پھر اس کو ترک کر دینا لازم ہوگا۔

علامہ ابن بطال رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

”واختار (ای الشافعی) للامام والماموم ان یذکر اللّٰہ بعد الفراغ من الصلوۃ ویخفیان ذلک الا ان یقصد التعلیم فیُعّلما ثم یُسرّا.“ (۱)

(امام شافعی رحمہ اللہ نے امام و مقتدی دونوں کے لیے اس بات کو پسند فرمایا ہے کہ نماز سے فراغت کے بعد ذکر کریں اور اخفاء کریں، الا یہ کہ تعلیم کا قصد ہو تو تعلیم کریں، پھر سر و اخفاء اختیار کریں۔)

اسی طرح دوسرے مقاصد صحیحہ کے تحت زور سے دعاء کی جا سکتی ہے، مگر رواج بنانا درست نہ ہوگا؛ بل کہ جوں ہی وہ مقصد حاصل ہو جائے اس کو ترک کرنا بھی لازم ہوگا اور اس کے متعلق پوری بحث اور اس کے احکام آخری فصل میں آئیں گے۔

استحباب جہر کی دوسری دلیل

امام مسلم رحمہ اللہ نے حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اپنی نماز سے سلام پھیرتے تو بلند آواز سے یہ دعا پڑھتے:

”لَااِلٰہَ وَحْدَہٗ لَاشَرِیْکَ لَہٗ لَہُ الْمُلْکُ وَلَہُ الْحَمْدُ وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیٍٔ قَدِیْرٌ لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ اِلَّا بِاللّٰہِ لَااَلٰہ الا اللّٰہ ولا نَعْبُدُ اِلَّا اِیَّاہُ له النعمة وَلَہُ الْفَضْلُ وَلَہُ الثَّنَاءُ الْحَسَنُ لَااِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ وَلَوْ کَرِہَ الْکَافِرُوْنَ.“ (۲)

(۱) فتح الملہم: ۲/۱۷۱

(۲) مشکوٰۃ: ۸۸

اس حدیث میں چوں کہ (بصوتہ الاعلی) کے الفاظ ہیں اس لیے علامہ ابن حزم رحمہ اللہ اور بعض حضرات نے دعاء وذکر میں جہر کو سنت قرار دیا ہے۔

دوسری دلیل کا جواب

مگر یہاں بھی یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیوں کہ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ سنیت واستحباب کے لیے استمرار یا کم ازکم ترغیب کا ثبوت ہونا چاہئے اور یہاں نہ ترغیب کا ثبوت ہے کہ مستحب قرار دیں، نہ دوام واستمرار کا ثبوت کہ سنت قرار دیں۔ لہٰذا اس حدیث سے بھی سنیت جہر یا استحباب جہر پر استدلال صحیح نہیں ہے۔

لفظ کان کی تحقیق

اب رہی یہ بات کہ حدیث میں تو یہ الفاظ ہیں: ''کانَ یقول بصوتہِ الاعلیٰ'' یہاں مضارع پر کان داخل ہے جس سے استمرار ثابت ہوتا ہے کیوں کہ یہ صیغہ ماضی استمراری کا ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ قاعدہ کہ کان مضارع پر داخل ہوکر استمرار کا فائدہ دیتا ہے مسلم نہیں اور کئی جگہ اس پر نقض وارد ہوتا ہے۔

چناں چہ علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

''فان المختارالذی علیه الاکثرون والمحققون من الاصولیین ان لفظة کان لایلزم منها الدوام ولاالتکرار وانماهی فعل ماضٍ بدل علی وقوعه مرةً فان دل دلیل علی التکرارعمل به والافلاتقتضیه بوضعها.'' (۱)

---

(۱) شرح مسلم: ۲۵۴/۱

(اکثر محققین اصولیین نے جو اختیار فرمایا ہے وہ یہ ہے کہ لفظ کان سے دوام و تکرار لازم نہیں آتا۔ وہ (لفظ کان) تو بس فعل ماضی ہے جو ایک مرتبہ فعل کے وقوع پر دلالت کرتا ہے۔ پس اگر کوئی (دوسری) دلیل تکرار پر دلالت کرے تو اس کے مطابق عمل ہوگا ورنہ یہ (کان) اپنی وضع کے اعتبار سے دوام کا تقاضا نہیں کرتا۔)

اس کے بعد علامہ نووی رحمہ اللہ نے ایک مثال بھی بطور نقض وارد کی ہے وہ یہ ہے کہ حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''كنت أطيّب رسول الله ا لحله قبل أن يطوف.''

(میں نے رسول اللہ کو (احرام سے) حلال ہونے کے لیے طواف سے قبل خوشبو لگائی۔)

علامہ نووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس جگہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ''کنت اطیب'' صیغہ استعمال فرمایا ہے جس میں مضارع پر کان داخل ہے، حالاں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے صحبت کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف ایک ہی مرتبہ حج فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک مرتبہ کسی فعل کے وقوع پر بھی ''کان'' استعمال ہوسکتا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

اگر یہ شبہ ہو کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو عمرہ میں حالت احرام میں بھی خوشبو لگایا ہو جس کو یہ بیان کر رہی ہیں کہ میں آپ کو عطر لگاتی تھی، تو یہ تکرار، حج و عمرہ کا ملا کر ہے۔

علامہ نووی رحمہ اللہ اس شبہ کا جواب دیتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں ہے،۔

کیوں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے یہاں قبل الطّواف خوشبو لگانے کا ذکر کیا ہے جو حج ہی میں جائز ہے۔ عمرہ میں قبل الطّواف خوشبو کا استعمال بالا جماع جائز نہیں تو یہ بات عمرے سے کیسے متعلق ہو سکتی ہے۔

الغرض ''کان'' سے استمرار پر استدلال درست نہیں جب تک خارج سے اس کا ثبوت نہ ہو۔ یہی تحقیق ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مرقات میں اور دوسرے علماء نے اپنی تالیفات میں ذکر فرمائی ہے۔

جب استمرار کا ثبوت نہ ہوا تو سنیت ثابت نہ ہوئی، لہٰذا اس جہر کو بھی ان محامل پر محمول کیا جا سکتا ہے جو اوپر مذکور ہوئے۔

استحباب جہر کی تیسری دلیل

قرآن کریم میں فرمایا گیا ہے۔

﴿وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا.﴾ (بنی اسرائیل:۱۱۰)

(اور اپنی نماز کو نہ تو بلند آواز سے پڑھیے اور نہ بالکل آہستہ سے پڑھیے؛ بل کہ ان دونوں کے درمیان ایک راستہ اختیار کیجیے)

اس آیت سے ممکن ہے کہ کوئی استحباب جہر پر استدلال کرے، کیوں کہ اس آیت میں بہت زور سے پڑھنے کی جس طرح ممانعت کی گئی ہے، اسی طرح اخفاء کی بھی ممانعت کی گئی ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اخفاء بھی مطلوب نہیں؛ بل کہ درست بھی نہیں، لہٰذا کچھ جہر ہونا چاہیے۔ اور یہ آیت حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا کے مطابق دعاء ہی کے بارے میں نازل ہوئی ہے، جیسا کہ امام مسلم رحمہ اللہ نے اس کی تخریج کی ہے۔ لہٰذا دعاء میں بالکل اخفاء کے بجائے کچھ جہر مطلوب ہے اور مستحب ہے۔

جواب

مگر علماء کے کلام سے اس آیت سے استدلال مخدوش ثابت ہوتا ہے، کیوں کہ

(۱) بخاری اور ترمذی رحمہما اللہ نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ یہ آیت بالا نماز میں قرأت کے سلسلہ میں نازل ہوئی ہے اور علما نے اس حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو راجح قرار دیا ہے۔ کیوں کہ حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا تو مسلم کی ہے اور حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ بخاری کی۔ اور بخاری کی حدیث راجح ہوتی ہے۔

چناں چہ علامہ عثمانی رحمہ اللہ نے فرمایا:

> ''امام نووی رحمہ اللہ نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے قول کو ترجیح دی ہے کہ یہ آیت قرأت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور محدث الطبری نے بھی حدیث ابن عباس رضی اللہ عنہ کو راجح قرار دیا ہے؛ کیوں کہ یہ روایت مخرج کے اعتبار سے اصح ہے۔''(۱)

(۲) بعض علماء کرام نے آیت بالا ''**لاتجهر بصلوتک**'' کو دعاء کے بارے میں مان کر بھی یہ فرمایا ہے کہ یہ آیت اس آیت سے منسوخ ہے جو شروع رسالہ میں گذری، یعنی ﴿اُدعوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعاً وَخُفيَةً﴾ جس سے دعا کا اخفاء واسراء مندوب ومستحب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چناں چہ ''**فتح الملهم**'' میں حافظ ابن حجر عسقلانی رحمہ اللہ کی فتح الباری سے علماء کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ آیت ''**ولاتجهر بصلوتک**'' منسوخ ہے آیت ''**ادعوا**'' الخ سے۔(۲)

(۳) بعض علماء نے یہ فرمایا ہے کہ حدیثِ عائشہ رضی اللہ عنہا میں جو آیا کہ یہ آیت بالا

---

(۱) فتح الملهم: ۲/۱۷

(۲) فتح الملهم: ۲/۱۷

دعاء کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس دعاء سے مراد وہ ہے جو تشہد میں پڑھی جاتی ہے، اور ان حضرات نے اس قول کی تائید میں حاکم کی روایت پیش کی ہے، جس میں "في التشهد" کی زیادتی موجود ہے۔

اور سب جانتے ہیں کہ تشہد میں جو دعاء پڑھی جاتی ہے وہ بالاتفاق آہستہ ہوتی ہے تو اس سے اس کا علم ہوا کہ آیت سے دراصل جہر کا استحباب ہی ثابت نہیں ہوتا، ورنہ علماء کے اس قول کا کوئی مطلب ہی نہ رہے گا۔ فافہم

استحباب جہر کی چوتھی دلیل

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کسی شخص کو یہ حلال نہیں کہ کسی قوم کی امامت کرے اور دعاء میں صرف اپنے کو خاص کر لے، اگر کوئی شخص ایسا کرے تو اس نے قوم کی خیانت کی ہے۔"(۱)

بعض لوگوں سے جہر کے مستحب ہونے پر یہ دلیل سنی گئی؛ کیوں کہ اس میں قوم کو چھوڑ کر صرف اپنے کو دعاء میں خاص کرنا ممنوع قرار دیا ہے اور اس کو خیانت فرمایا ہے۔ اس سے ان لوگوں نے یہ سمجھا کہ دعاء زور سے کر کے قوم کو شامل کرنا چاہئے، ورنہ خیانت ہوگی۔ پس اس سے جہر کا مستحب ہونا ثابت کیا ہے۔

جواب

یہ ہے کہ اولاً تو علماء کو اس حدیث کی صحت میں کلام ہے حتی کہ محدث ابن خزیمہ رحمہ اللہ نے اس حدیث کو موضوع تک کہہ دیا۔ کیوں کہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

(۱) ترمذی: ۸۲/۱

کا عمل اس کے خلاف ہے کہ آپ دعاء میں جہر تو کجا جو صیغے استعمال فرماتے تھے وہ بھی واحد ہی کے منقول ہیں، سوائے چند مواقع کے آپ نے جمع کا صیغہ استعمال نہیں فرمایا، خواہ نماز میں ہو یا نماز کے باہر جیسا کہ علامہ یوسف صاحب بنوری رحمہ اللہ نے معارف السنن (۲/ ۴۰۷) میں اور علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے سعایہ (۲/ ۲۴۵) میں تصریح کی ہے۔ اس وجہ سے بعض علماء نے اس حدیث ہی کو موضوع قرار دے دیا اگر چہ حق یہ ہے کہ یہ حدیث موضوع نہیں؛ بل کہ ثابت ہے اس کے رجال ورواۃ قابلِ احتجاج ہیں۔ چناں چہ امام ترمذی اور امام ابوداؤد رحمہما اللہ وغیرہ نے اپنی سنن میں اس حدیث کی تخریج کی ہے اور علماء کا فیصلہ ہے کہ ان کتابوں میں اگر چہ ضعیف روایات ہیں۔ مگر موضوع کوئی نہیں اور جن محدثین نے ان کتابوں کی بعض احادیث پر وضع کا حکم لگایا ہے۔ دوسرے علماء محققین نے ان کا مدلل جواب محدثانہ طریقہ پر دے دیا ہے جو اپنی جگہ مذکور ہے۔ اس لیے یہ حدیث ثابت ضرور ہے۔

لیکن اس سے جہر کا استحباب یا سنیت ثابت نہیں ہوتی، کیوں کہ حدیث میں صرف یہ ہے کہ امام مقتدیوں کو بھی دعاء میں شریک کرے ورنہ خیانت ہوگی اور شرکت کے لیے بلند آواز سے دعاء کرنا ضروری نہیں؛ بل کہ بغیر جہر کے بھی شرکت اس طرح ہوسکتی ہے کہ ان کے حق میں دعاء کرے۔ چناں چہ علماء نے اس حدیث کے کئی مطالب بیان کیے ہیں۔ مگر کسی نے اس سے جہر پر استدلال نہیں کیا۔

(۱) چناں چہ اس حدیث کا بعض علماء نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ مراد حدیث کی یہ ہے کہ جن دعاؤں میں امام کے ساتھ مقتدی بھی شریک ہوتے ہیں جیسے دعائے قنوت وغیرہ اس میں صیغہ جمع استعمال کرے صیغۂ افراد کا استعمال اس جگہ درست نہیں۔ علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ اسی کے قائل ہیں جیسا کہ علامہ ابن القیم

رحمہ اللہ سے معارف السنن میں نقل کیا گیا ہے۔(۱)

(۲) بعض نے یہ مطلب بیان کیا کہ فرض نمازوں میں جو دعاء پڑھی جاتی ہے وہ بصیغۂ جمع ہونا چاہئے۔

علامہ بنوری رحمہ اللہ نے اس کو امام اعظم رحمہ اللہ کا مذہب قرار دیا ہے۔(۲)

(۳) علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ:

"ظاہر یہ ہے کہ منع وہ صورت ہے کہ امام تمام ارکانِ صلوۃ اور اس کے بعد کے افعال جو نماز سے متعلق ہیں، سب میں اپنے کو دعاء میں خاص کرے، لیکن اگر امام نے درمیان نماز میں مثل رکوع، سجدہ، تشہد وغیرہ میں اپنے کو خاص کیا اور بعد نماز سب کے لیے دعائیں عموم کرلیا تو پھر وہ اس نہی سے عہدہ برآمد ہو جائے گا۔"(۳)

(۴) راقم کہتا ہے:

"میرے خیال میں حدیثِ پاک کی یہ مراد آتی ہے کہ امام خود ہی دعاء کرتا رہے اور دعاء کرنے میں اپنے آپ کو خاص کرلے اور مقتدیوں کو دعاء کرنے کی فرصت نہ دے تو یہ درست نہیں اور یہ خیانت ہے، اس لیے امام کو چاہئے کہ مقتدیوں کو بھی دعاء کرنے کا موقع دے اور خود آہستہ دعاء کرے یا خاموش رہے۔ کیونکہ نمازوں کے بعد کا وقت قبولیتِ دعاء کا وقت ہے۔ اس توجیہہ پر اس حدیث سے تو سر و اخفاء کا مستحب و مطلوب ہونا ثابت ہوتا ہے نہ کہ جہر کا۔" فافہم

---

(۱) معارف السنن: ۳/۴۸

(۲) ایضا

(۳) سعایہ: ۲/۲۴۵

استحبابِ جہر کی پانچویں دلیل

حضرت حبیب بن سلمہ الفہری کی حدیث میں ہے:

''لَایَجْتَمِعُ مَلأُفَیَدعوُبَعْضهم وَیُؤَمِّنُ بَعْضُهُمْ اِلَّا اَجَابَهُمُ اللّٰه.'' (۱)

(کوئی مجمع جمع ہو کر بعض دعاء اور بعض اس پر آمین نہیں کہتے مگر اللہ (ان کی دعاؤں) کو قبول کر لیتا ہے)

اس حدیث سے ممکن ہے کوئی دعاء جہری کی مندوبیت پر استدلال کرنے لگے کہ اس میں بعض کے دعاء کرنے اور بعض کے آمین کہنے پر قبولیتِ دعاء کو متفرع کیا ہے اور قبولیتِ دعاء مرغوب تو جہر بھی مندوب ہوا۔

جواب

مگر جو دلائل استحبابِ اخفاء وسر کے اوپر مذکور ہوئے ان کے مقابلہ میں صرف اس حدیث کو اختیار کرنا اور ان سب کو ترک کرنا صحیح نہیں، کیوں کہ وہ دلائل صاف وصریح بھی ہیں اور محکم بھی اور یہاں یہ احتمال ہے کہ ملأ پر تنوین نوعیت کے لیے ہو۔ لہٰذا اس سے خاص کسی موقع پر اجتماع مراد ہوگا یا یہ تنوینِ عظمت ہو، جس کا مطلب یہ ہوگا کہ مراد وہ مجمع ہے جو بڑا عظیم الشان ہو اور ممکن ہے کہ یہ تنوین تنویع و تعظیم دونوں کے لیے ہو جیسے لفظ ''غشاوۃٌ'' جو قرآن میں آیا ہے، اس کی تنوین کے بارے میں بھی علماء نے تنویع و تعظیم کا قول کہا ہے جیسا کہ روح المعانی (۱/۱۳۷) میں ہے کہ خود رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو اور صحابہ کرام نے اس طرح جمع ہو کر دعاء کرنے کا اہتمام نہیں فرمایا۔ اگر یہ حضرات اس کا اہتمام کرتے تو یہ بات ضرور منقول ہوتی،

(۱) کنز العمال: ۱/۱۸۷، کذا فی المعارف: ۳/۱۲۳

حالاں کہ یہ بات منقول نہیں؛ بل کہ اس کے خلاف سر و اخفاء کا اہتمام منقول ہے جیسا کہ حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا قول استحباب جہر کی پہلی دلیل کے جواب کے ذیل میں ہم نقل کر چکے ہیں۔

اس لیے اس حدیث کا محمل یہ ہوگا کہ کبھی کبھی جمع ہو کر دعاء بھی کر لی جائے مگر دوام و استمرار کے ساتھ اس طرح کرنا دوسرے دلائل کے خلاف ہوگا۔

استحباب جہر کی چھٹی دلیل

« عن ابی هريرة رضي الله عنه قال قال: رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول الله تعالىٰ أناعند ظن عبدى بى وأنا معه اذاذكرنى فان ذكرنى فى نفسه ذكرته فى نفسى وان ذكرنى فى ملاءٍ ذكرتهٗ فى ملاءٍ خيرٍ منهم الخ. » (۱)

(حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ میں بندہ کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کرتا ہوں جیسا وہ میرے ساتھ گمان رکھتا ہے اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں، پس اگر وہ مجھے اپنے دل میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو اپنے دل میں یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجھے مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اس کو اس سے بہتر مجمع میں (یعنی فرشتوں کے مجمع میں) یاد کرتا ہوں۔)

جواب

اس کا جواب دو طرح دیا جا سکتا ہے: ایک علی سبیل الترجیح دوسرے علی سبیل التطبیق۔

(۱) بخاري: ۶۸۵۶، مسلم: ۴۸۳۲، ترمذي: ۳۵۲۷

علی سبیل الترجیح جواب یہ ہے کہ اس حدیث سے جہر کا استحباب وفضیلت اشارۃً ثابت ہوتی ہے اور جو روایات ودلائل فصل اول میں ذکر کیے گئے ان میں اخفاء واسرار کا استحباب وفضیلت صراحتاً مذکور ہے۔ چناں چہ حدیث نمبر (۳) میں دعاء جہری پر دعاء سری کو ستر گونہ فضیلت کا ہونا صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس طرح حدیث نمبرا ایک اور چار وغیرہ میں بھی سر واخفاء کا مستحب وافضل ہونا بالتصریح مذکور ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ عبارۃ النص اور اشارۃ النص میں اگر تعارض ہو تو عبارۃ النص کو ترجیح دی جاتی ہے جیسا کہ ''نور الانوار'' (ص: ۱۴۷) میں ہے۔

لہٰذا یہاں بھی اس حدیث سے ثابت شدہ جہر کی فضیلت پر ان روایات سے ثابت شدہ استحباب اخفاء کو ترجیح دی جائے گی کیوں کہ وہ عبارۃ النص سے ثابت ہے۔

اور علی سبیل التطبیق اس کا جواب یہ ہے کہ جہر کی فضیلت وہاں ہے جہاں کوئی فائدہ معتد بہا مرتب ہو اور حاصل ہو۔ مثلاً دوسروں کو توجہ الی اللہ وانابت الی اللہ ہو وغیرہ اور اس صورت میں جہر کا مستحب ہونا فصل رابع میں مع دلائل مذکور ہوگا۔

پس حاصل یہ ہے کہ اصل سر واخفاء ہی ہے، مگر کسی جگہ اگر جہر پر فائدہ مرتب وحاصل ہونے کا یقین یا احتمال غالب ہو تو پھر جہر افضل ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مطلقاً جہر خواہ فائدہ مرتب ہو یا نہ ہو مثلاً تنہا بیٹھ کر بلا کسی غرض صحیح کے جہر کرے تو یہ افضل نہیں ؛ بل کہ افضل ایسے حالات میں سر واخفاء ہی ہے۔ اس کی تائید الفاظ حدیث سے بھی ہوتی ہے؛ کیوں کہ حدیث میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جب بندہ اپنے جی میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں بھی اپنے جی میں اس کو یاد کرتا ہوں اور اگر وہ مجمع میں میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کا اس سے بہتر مجمع میں ذکر کرتا ہوں یوں نہیں فرمایا کہ اگر وہ میرا ذکر زور سے کرے تو میں ایسا کروں گا؛ بل کہ فرمایا کہ مجمع میں ذکر کرے تو

میں ایسا کرتا ہوں۔ معلوم ہوا کہ مقصود ذکر جہری سے اگر دوسروں کو توجہ دلانا وغیرہ فوائد ہوں تو افضل ہے ورنہ افضل نہیں اگر ملطلقاً ذکر جہری افضل ہوتا تو یوں فرماتے کہ جب میرا ذکر زور سے کرے، حالاں کہ ایسا نہیں فرمایا گیا۔ خوب سمجھ لو۔

اور بعض حضراتِ علماء نے یہ توجیہہ کی ہے کہ جن روایات سے جہر ثابت ہے وہ اس وقت پر محمول ہیں جب کہ ریا نہ ہو اور جن میں سر و اخفاء کا استحباب ہونا بیان ہوا ہے، وہ اس وقت پر محمول ہیں جب کہ ریاء ہو۔ مگر یہ محل نظر ہے۔ کیوں کہ ریا کے ہونے کے وقت سر و اخفاء مستحب ہی نہیں؛ بل کہ واجب ہوگا اور اس وقت جہر کرنا غیر مستحب ہی نہیں؛ بل کہ ناجائز ہوگا تو ریا کے ہونے نہ ہونے پر اگر جہر و سر کا مدار ہوگا تو مسئلہ جواز و عدم جواز کا بنتا ہے نہ کہ افضل و غیر افضل کا۔ لہٰذا اس کو استحباب و عدم استحباب کا مدار قرار دینا صحیح نہیں۔ فافہم ولا تغفل۔

افادہ علمیہ

بعض حضرات نے اس طرح کی بعض احادیث کی بنا پر آیت ”اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاً وَ خُفْیَةً“ کو منفرد کے ساتھ خاص کیا ہے کہ کوئی تنہا دعاء کرے تو آہستہ کرنا چاہیے اور اگر مجمع میں دعاء کرے تو بلند آوز سے کرنا چاہیے؛ مگر یہ تخصیص کا قول بچند وجوہ باطل ہے۔

اولاً: تو اس لیے کہ وہ حضرات وجہ تخصیص میں جن روایات کو پیش کرتے ہیں وہ یا تو محض بیان جواز پر محمول ہوسکتی ہیں یا زیادہ سے زیادہ کسی خاص فائدہ کے مرتب ہونے کی وجہ سے خاص موقع اور محل میں استحباب جہر پر نہ کہ مطلقاً ہر مجمع میں فضیلت جہر پر۔ لہٰذا اس سے اس حکم عام کی تخصیص ممکن نہیں۔

ثانیاً: اس لیے کہ تخصیص کا قول ظاہر آیت کے خلاف ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ

نے اس آیت میں صیغۂ جمع (أدعوا) سے خطاب فرمایا ہے اور اس سے بظاہر اجتماع (۱) ہی مفہوم ہوتا ہے اور ظاہر سے صرف بلا دلیل درست نہیں۔

ثالثاً: اس لیے کہ یہ حکم منفرد و غیر منفرد سب کو عام ہے اور عام کا بلا وجہ خاص کرنا بتصریح اصولیین ناجائز ہے۔ لہٰذا اس کا بھی منفرد کے ساتھ خاص کرنا صحیح نہیں ہے اور جو دلائل تخصیص مذکور ہوئے یہ مفید جواز ہیں، نہ کہ مفید سنیت یا استحباب۔ لہٰذا ان سے اس آیت کا خاص کرنا صحیح نہیں۔

---

(۱) اس سے میرا مطلب یہ نہیں کہ جہاں بھی صیغۂ جمع استعمال ہوگا اس سے اجتماع ہی مراد ہوگا۔ بل کہ صرف یہ مقصود ہے کہ صیغۂ جمع سے ظاہر اجتماع ہے تو اس کے خلاف کی کیا دلیل ہے (فافہم)

فصلِ رابع
جہری دعاء کا حکم

گذشتہ صفحات میں یہ بات واضح طریقہ پر آچکی ہے کہ دعاء میں سر واخفاء ہی مستحب ہے اور دعاء جہری مستحب نہیں ہے۔ اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دعاء جہری اگر کرلی جائے تو اس کا کیا حکم ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟

اس لیے ہم کسی قدر تفصیل سے اس سوال کا جواب حوالہ قرطاس کرتے ہیں جس سے انشاء اللہ ہر قسم کے اشکالات وتوہمات مندفع ہوجائیں گے۔ سوملاحظہ ہو کہ:

دعاء وذکر میں جہر دو طرح ہوتا ہے۔ ایک تو جہر مفرط یعنی حد اعتدال سے متجاوز جس کو چیخنا چلّانا کہا جاتا ہے۔ دوسرے جہر معتدل کہ حدِ اعتدال میں ہو چیخنا، چلّانا نہ ہو۔ اور ہر صورت کا جدا جدا حکم ہے۔

جہر مفرط کا حکم

پہلی صورت یعنی ذکر ودعاء بجہر مفرط بالاتفاق ناجائز ہے اور اس سے صرف وہ مواقع مستثنیٰ ہیں جن میں شریعت نے جہر مفرط کی اجازت وتاکید وترغیب دی ہے۔ جیسے ''اذان'' میں جہر مفرط موکد ہے۔ چناں چہ امام بخاری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے اس کے لیے اپنی جامع میں ''باب رفع الصوت بالنداء'' منعقد فرمایا ہے۔ اسی طرح حج کے موقع پر خوب چیخ چیخ کر ذکر یعنی لبیک کہنا مشروع ہے اور ایسے حج کو جس میں بجہر

مفرط ''لبیک'' کہی گئی ہو حدیث میں افضل حج قرار دیا گیا ہے۔لہٰذا ان خاص مواقع کے علاوہ دیگر مقامات ومواقع میں جہر مفرط ناجائز اور بدعت مذمومہ ہے۔

علامہ جلال الدین السیوطی علیہ الرحمۃ نے اپنی تفسیر جلالین میں آیت ''اُدْعُوْا رَبَّکُمْ تَضَرُّعاًوَّ خُفْیَةً اِنَّهٗ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ'' کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

''اِنَّهٗ لَایُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ فِی الدُّعَاءِ بِالتشدُّق وَرَفْعِ الصّوتِ.'' (۱)

(بلاشبہ اللہ تعالیٰ دعاء میں چیختے ہوئے اورآواز بلند کرتے ہوئے حد سے گذر جانے والوں کو پسند نہیں فرماتے۔)

اور امام ابن جریج رحمہ اللہ نے فرمایا:

''معتدین یعنی حد سے گذر جانے والوں سے مراد اپنی آوازوں کو بلند کرنے والے ہیں۔ نیز فرمایا کہ چیخنا مکروہ اور بدعت ہے اور فرمایا کہ حد سے تجاوز کرنا (جو آیت میں مذکور ہے) یہ ہے کہ آواز بلند کرے اور دعاء میں چیخے، پکارے۔'' (ہٰکذا فی حاشیۃ جلالین)

امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ اپنی تفسیر کبیر میں اسی آیت میں واقع ''معتدین'' کی تفسیر کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''ثم قال تعالیٰ بعده (انه لایحب المعتدین) والاظهران المرادانهٗ لایحب المعتدین فی ترک هذین الامرین المذکورین وهماالتضرع والاخفاء فان الله لایثیبه البتة ولایحسن الیه ومن کان کذلک کان من أهل العقاب لامحالة فظهران قوله تعالیٰ لایحب المعتدین کالتهدید

(۱) جلالین: ۱۳۴

والتشدیدعلی ترک التضرع والاخفاء." (۱)

(پھر اللہ تعالیٰ نے (تضرعاً اوراخفاء کا حکم دینے) کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ بلاشبہ حد سے گذر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ظاہر یہ ہے کہ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جوان مذکورہ دوامور کے ترک کرنے میں حد سے گذر جانے والے ہیں اوروہ دوچیزیں تضرع (گڑگڑانا) اوراخفاء (آہستہ دعاء کرنا) ہیں پس اللہ تعالیٰ (ایسے شخص کو جوان چیزوں کو ترک کردے) ثواب نہیں دیتا اوراس پر احسان نہیں کرتا۔اور جو شخص ایسا ہے وہ اہل عقاب میں سے ہے لامحالہ۔پس اس سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کا قول ﴿انه لایحب المعتدین﴾ میں ترک تضرع وترک اخفاء مثل تہدید وتشدید کے ہے۔)

امام المفسرین علامہ محمود آلوسی بغدادی رحمہ اللہ اپنی نادر تفسیر ''روح المعانی'' میں اس آیت کے تحت رقمطراز ہیں:

''ومن هنا قال جمع بکراهة رفع الصوت به وفی الانتصاف حسبک فی تعین الاسرار فیه اقترانه فی الاية بالتضرع فالاخلال به کالاخلال بالضراعة الی اللّٰه...... وتری کثیراً من اهل زمانک تعتمدون الصراخ فی الدعاء خصوصاً فی الجوامع حتی یعظم اللغط ویشتد وتستک المسامع وتشدّ ولایدرون انهم جمعوابین بدعتین رفع

(۱) تفسیر کبیر: ۱۴/۱۳۰

الصوت فی الدعاء و کون ذلک فی المسجد." (۱)

(یہیں سے ایک جماعت علماء نے دعاء میں آواز بلند کرنے کو مکروہ کہا ہے اور کتاب الانتصاف میں ہے کہ تجھے دعاء میں اخفاء وسر کی تعیین میں دعاء کا تضرع کے ساتھ آنا ہی کافی ہے۔ لہٰذا اخفاء میں خلل ڈالنا (یعنی جہر کرنا) گویا تضرع میں خلل ڈالنا ہے (کہ جب اخفاء نہ رہا تو تضرع بھی نہ رہا...........آگے چل کر فرماتے ہیں......کہ تو تیرے زمانہ والوں میں سے بہت ساروں کو دیکھے گا کہ وہ دعاء میں چیخ پکار کرنے والے پر اعتماد کرتے ہیں۔ خصوصاً مجمعوں (جامع مسجد) میں حتی کہ خوب ہی شور وغوغا ہوتا ہے اور کان بہرے ہوجاتے ہیں اور بند ہوجاتے ہیں۔ اور یہ لوگ اتنا بھی نہیں جانتے کہ انہوں نے دو بدعتوں کو جمع کر رکھا ہے ایک تو دعا میں آواز کا بلند کرنا اور دوسرے اس کا مسجد میں ہونا۔)

اسی طرح ملا علی قاری رحمہ اللہ نے مسجد میں بلند آواز سے ذکر کرنے کو نا جائز فرمایا ہے اور درمختار میں مسجد میں ذکر جہری کو مکروہات میں شمار کیا ہے۔ یہ سب اسی جہری مفرط پر محمول ہے۔

ان علماء وفقہاء کے اقوال سے بات خوب واضح ہوگئی کہ دعاء میں چیخنا پکارنا جیسا کہ آج کل عام طور پر رائج ہوگیا ہے اور لوگ اس کو پسند کرتے ہیں اور ایسے ہی چیخنے والوں پر اعتماد کرتے ہیں۔ یہ سب نا جائز اور بدعتِ مذمومہ ہے اس کا ترک لازم اور ضروری ہے۔

---

(۱) روح المعانی: ۱۳۹/۸

جہر معتدل کا حکم

دوسری صورت یعنی جہر معتدل ومتوسط کا حکم یہ ہے کہ وہ فی نفسہٖ جائز ہے۔ چناں چہ جو روایات فصلِ ثالث میں گذری ہیں ان سے جہر کا جواز ثابت ہوتا ہے۔ البتہ ان سے جہر کی سنیت یا اس کا استحباب ثابت نہیں ہوتا جیسا کہ مفصل گذر چکا ہے۔

یہیں سے یہ بات بھی واضح ہوگئی کہ ذکر جہری یا دعاء جہری کو مطلقاً بدعت یا معصیت ونامشروع قرار دینا غلط ہے کیوں کہ جہر کا ثبوت متعدد روایات سے ہوتا ہے۔ پھر اس ثبوت کے بعد اس کا انکار درست نہیں۔ اس لیے اکثر جمہور فقہاء وعلماء نے جس طرح استحبابِ سر واخفاء پر اجماع واتفاق کیا ہے ایسے ہی جہر کے جواز ومشروع ہونے پر بھی اتفاق کیا ہے۔ یعنی جب کہ جہر حدِ اعتدال میں ہو اور بعض حضرات نے جہر کے ممنوع ہونے اور ناجائز ہونے پر اس حدیث سے استدلال کیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض صحابہ کرام کو جہراً ذکر کرتے ہوئے دیکھ کر فرمایا تھا کہ اپنے نفسوں پر رحم کرو۔ یہ حدیث فصل اول میں گذر چکی ہے اور اس استدلال کا جواب بھی اشارۃً وہاں پر ہم نے ذکر کر دیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ نہی شفقت ہے جیسا کہ علماء نے فرمایا ہے۔ اور اس کی تائید الفاظ حدیث سے بھی ہوتی ہے کیونکہ فرمایا گیا ہے ''اربعوا علی انفسکم'' کہ اپنے نفسوں پر رحم کرو۔ اور نہی شفقت سے اس فعل کا عدم جواز ثابت نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ اتنا یاد رہے کہ نہی شفقت امر مستحب پر نہیں ہو سکتی جائز پر ہو سکتی ہے۔ اس لیے اس حدیث سے عدمِ استحبابِ جہر پر استدلال درست ہے اور عدمِ جوازِ جہر پر غلط۔ فافہم

جب یہ بات معلوم ومتحقق ہو چکی کہ دعاء وذکر اگر بجہر معتدل ومتوسط ہو تو فی نفسہٖ جائز ومباح ہے کہ اس جہر کے کرنے سے نہ ثواب ہے اور نہ ترک پر عتاب، تو اب یہ

ملاحظہ فرمایئے کہ امر مباح کبھی تو عارضی کراہت وحرمت کا شکار ہوجاتا ہے اور کبھی امور مستحبہ بل کہ امور واجبہ سے ملحق ہوجاتا ہے بالفاظ دیگر امر مباح کسی عارض کی وجہ سے مکروہ وحرام بھی ہوسکتا ہے اور کبھی مستحب و واجب بھی اس طرح دعاء ذکر جہری بھی جب مباح ٹھہرے تو ممکن ہے کہ کسی عارض غیر مناسب کی وجہ سے مکروہ یا ناجائز ہوجائیں یا کسی عارض محمود یا مقصود کے لحوق سے مستحب یا واجب ہوجائیں۔

تفصیل الاجمال

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ شرع میں فقہی قاعدہ اور اصول مسلم ہے کہ مباح اپنی ذات میں نہ طاعت ہے نہ معصیت، لیکن عوارض کے اعتبار سے ممکن ہے کہ کبھی وہ طاعت بن جائے اور کبھی معصیت ہوجائے مثلاً چلنا کہ ایک مباح فعل ہے کہ نہ اس کے کرنے پر ثواب ہے اور نہ ترک پر عتاب، مگر ممکن ہے کہ اس میں کوئی ایسی مصلحت ومنفعت ہو جس سے یہ عبادت بن جائے مثلاً مسجد یا مجلس وعظ کی طرف چلنا یا بنیت عبادت یا بغرض عیادت چلنا کہ یہ سب عبادت میں داخل ہوکر طاعت ہوگیا۔ اور اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ اس چلنے میں کوئی مضرت یا مفسدہ ہو جس سے یہ مباح فعل معصیت ہوجائے، مثلاً ناچ دیکھنے کو چلنا یا شراب خوری کے لیے چلنا یہ سب معصیت میں داخل ہے۔

حاصل یہ ہے کہ مباح اگرچہ اپنی ذات میں نہ طاعت ہے نہ معصیت لیکن بعض عوارض خارجیہ کی وجہ سے وہ کبھی معصیت اور کبھی طاعت بن جاتا ہے اگر مفاسد کا لحوق ہوا تو وہ معصیت اور اگر مصالح کا عروض ہوا تو وہ طاعت بن جاتا ہے۔

پھر مفاسد ومصالح بھی متفاوت المراتب ہوتے ہیں۔ بعض مراتب مفاسد اشد اور بعض اخف، ایسے ہی بعض مصالح اعلیٰ اور بعض ادنیٰ ہوتے ہیں۔ اسی

اعتبار سے اس امر مباح کے معصیت وطاعت ہونے میں تفاوت ہوتا ہے کہ کبھی تو امر مباح بعض مفاسد کے منضم ہو جانے سے حرام ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ مفاسد بھی اشد بل کہ اشد ترین ہوتے ہیں جیسے سنیما بینی کے لیے چلنا۔ اور بعض اوقات وہ مکروہ ہو جاتا ہے کیونکہ وہ مفاسد اشد نہیں ہوتے اخف اور ہلکے ہوتے ہیں۔

اور کبھی امر مباح بعض مصالح کی وجہ سے واجب وفرض ہو جاتا ہے، کیوں کہ وہ مصالح اعلی اور مقصود ہوتے ہیں۔ مثلاً حج بیت اللہ کے لیے ہوائی جہاز یا سمندری جہاز کا سفر کرنا کہ یہاں ہندوستان وغیرہ ممالک کے لیے حج کا فریضہ ادا کرنا، اس کے سواء ممکن نہیں۔ جب حج اس پر موقوف ہوا کہ ہوائی جہاز یا سمندری جہاز کا سفر اختیار کیا جائے تو حج کی طرح یہ بھی فرض وواجب ہو گیا، حالاں کہ ہوائی جہاز کا یا سمندری جہاز کا سفر محض ایک مباح کام ہے اور کبھی امر مباح بعض مصالح کے عارض ہونے سے محض مستحب ومندوب ہوتا ہے۔ جیسے دینی وشرعی احکام کا لکھنا اور شائع کرنا کہ چونکہ اس میں فریضۂ تبلیغ ادا ہوتا ہے اور یہ مقصود ہے اس لیے یہ ذریعہ تبلیغ بھی مستحب ہوگا، حالاں کہ لکھنا محض ایک مباح کام ہے۔ اگر کسی کو شبہ ہو کہ جب حج بیت اللہ فرض تھا تو اس کا ذریعہ بھی فرض ہوا اور یہاں جب تبلیغ بھی فرض ہے تو اس کا ذریعہ کیوں نہ فرض ہو؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ذریعہ دو قسم کا ہے ایک وہ جو مقصود کے حصول کے لیے عقلاً یا عادۃً موقوف علیہ کا درجہ رکھتا ہو۔ اور دوسرا وہ کہ وہ ذریعہ حصولِ مقصود کے لیے موقوف علیہ نہ ہو؛ بل کہ اس کے علاوہ دیگر ذرائع بھی اس کے حصول کے لیے ہوں۔ پس قسم اول کو اگر وہ فرض کا ذریعہ ہو فرض قرار دیں گے اور اگر مستحب کا ذریعہ ہو تو مستحب...... لیکن قسم ثانی میں مطلق ذریعہ تو فرض ہوگا، لیکن کسی خاص ذریعہ کو فرض نہ کہیں گے، اس لیے حج بیت اللہ کے اس خاص ذریعہ کو ہم

نے موقوف علیہ ہونے کی وجہ سے فرض کہا اور ذریعہ تبلیغ چوں کہ ایک ہی نہیں ہے اس لیے خاص اس ذریعہ کو یعنی لکھنے کو فرض نہیں کہا بل کہ مستحب کہا ہے۔ فافہم

جب یہ ممہد ہوگیا کہ امر مباح مفاسد ومصالح کے عروض ولحوق کے اعتبار سے مکروہ ،حرام یا مستحب وفرض بھی ہوجاتا ہے، تو اب دعا یا ذکر میں جہر معتدل کا حکم دریافت کرنا نہایت ہی آسان ہے، کیونکہ اب صرف یہ بات دیکھنے کی ہے کہ اس دعاء جہری میں کوئی مفسدہ اعتقادی یا عملی ہے یا نہیں؟ بل کہ یہ تمام مفاسد سے خالی ہے۔

مروجہ دعاء جہری میں اعتقادی مفسدہ

سوغور کرنے سے اور حالات کا جائزہ لینے سے معلوم ہوتا ہے کہ مروجہ دعاء جہری میں اعتقادی وعملی دونوں قسم کے مفاسد منضم ہیں۔

اعتقادی مفسدہ تو اس طرح کہ ہمارے ان علاقوں میں لوگوں نے اس مباح امر کو اس کے درجہ سے گذار کر واجب کا درجہ دے دیا ہے، جس کی علامت یہ ہے کہ اگر کوئی امام نماز کے بعد سری دعاء کرے جو کہ افضل ہے، تو لوگ اس پر ملامت کرتے ہیں اور اسے مجبور کرتے ہیں کہ دعاء جہری کرے اور ظاہر ہے کہ ملامت کسی امر مباح کے ترک پر نہیں کی جاتی ؛ بل کہ امور مستحبہ پر بھی اس قسم کی ملامت اور تشدید نہیں کی جاتی کہ مستقل جھگڑا قائم کر دیا جائے ؛ بل کہ بعض جگہ تو یہاں تک دیکھا گیا کہ ایک عالم امام کے سری دعاء کرنے پر لوگ اس قدر برگشتہ ہوئے کہ اس عالم امام کی جگہ جاہل شخص کو اپنا امام بنا دیا، جسے قرآن پاک بھی ٹھیک ٹھاک پڑھنا نہیں آتا تھا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اس مروجہ طریقہ پر دعاء جہری کرنے کو ضروری خیال کرتے ہیں۔

اور اصول میں یہ امر محقق ہو چکا ہے کہ کسی امر مباح بل کہ امر مستحب کو بھی اس

کے درجہ سے گذار کر وجوب کا درجہ دے دینا فسادِ عقیدہ ہے اور علمائے کرام نے اس کے فساد اعتقادی ہونے کی تصریح کی ہے۔ اسی طرح کسی امر مباح یا مستحب پر اس طرح پابندی کرنا جیسے واجب وفرض پر کرتے ہیں فسادِ عملی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ اپنی کتاب ''اصلاح الرسوم'' میں فرماتے ہیں:

''**قاعدہ اول:** کسی امر غیر ضروری کو اپنے عقیدہ میں ضروری اور موکد سمجھ لینا یا عمل میں اس کی پابندی اصرار کے ساتھ اس طرح کرنا کہ فرائض وواجبات کی مثل یا زیادہ اس کا اہتمام ہو اور اس کے ترک کو مذموم اور تارک کو قابلِ ملامت وشناعت جانتا ہو، یہ دونوں امر ممنوع ہیں؛ کیوں کہ اس میں حکمِ شرعی کو توڑنا ہے اور تقیید وتعیین وتخصیص والتزام وتحدید وغیرہ اسی قاعدہ اور مسئلہ کے عنوانات وتعبیرات ہیں''۔ (۱)

قرآنی استدلال

یہ جو قاعدہ بیان کیا گیا کہ کسی امر مباح کو واجب خیال کرنا فسادِ عقیدہ ہے اور مذموم وممنوع ہے یہ قرآن پاک کی آیت سے مستنبط ہوتا ہے:

﴿وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ ظُهُوْرِهَا وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقٰى وَاْتُوا الْبُيُوْتَ مِنْ اَبْوَابِهَا﴾ (البقرۃ: ۱۸۹)

(اس میں کوئی نیکی کی بات نہیں کہ گھروں میں ان کی پشت کی جانب سے آؤ ہاں لیکن نیکی یہ ہے کہ کوئی حرام چیزوں سے بچے اور گھروں میں (آنا چاہو) تو ان کے دروازوں سے آؤ۔)

واقعہ یہ ہے کہ اسلام سے پہلے اہلِ عرب اور بعض انصار احرام حج کی حالت

(۱) اصلاح الرسوم: ۷۳

میں کسی وجہ سے اپنے گھر جانا چاہتے تو گھروں میں ان کے دروازوں کے بجائے گھروں کی پشت کی جانب سے داخل ہوتے اور اس کو فضیلت خیال کرتے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔(۱)

اور ان کے اس خیال کی تردید فرمائی کہ پشت کی جانب سے داخل ہونا کوئی نیکی اور فضیلت کی بات ہے اور گھروں کے دروازوں سے داخل ہونا بری بات ہے۔

اس جگہ لائق تامل وقابل التفات یہ امر ہے کہ گھروں میں دروازوں سے جانا بھی ایک امر مباح تھا اور پشت کی جانب سے داخل ہونا بھی ایک امر مباح تھا، لیکن جب ان لوگوں نے ایک مباح کو واجب اور دوسرے کو ناجائز قرار دے دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی تردید کی اور اس زعم کا باطل ہونا بصراحت بیان فرمایا جس سے بقول حضرت حکیم الامت مجدد الملت تھانوی رحمہ اللہ یہ بات مستفاد ہوئی کہ ''جو شئی شرعاً مباح ہو اس کو طاعت وعبادت اعتقاد کر لینا، اسی طرح اس کو معصیت اور محل ملامت اعتقاد کر لینا شرعاً مذموم ہے اور بدعت میں داخل ہے۔(۲)

مروجہ دعاء جہری بدعت ہے

پس آیت شریفہ سے یہ واضح ہو گیا کہ مباح کو باعث فضیلت عبادت وطاعت سمجھ لینا مفسدہ اور بدعت ہے۔ اور امر غیر ضروری وغیر مطلوب عند الشرع میں کوئی مفسدہ پیدا ہو جائے تو اس فعل کو ترک کر دینا واجب ہوتا ہے (اس کی تفصیل کے لیے رسالہ اصلاح الرسوم: ۳۰۷ تا ۳۰۷ ملاحظہ فرمائیں) جب یہ تین مقدمے ممہد ہو گئے کہ دعاء جہری فی نفسہٖ مباح ہے اور آج کل اس میں اعتقادی مفسدہ منضم ہو گیا ہے اور

(۱) بخاری: ۲/۶۴۸

(۲) تفسیر بیان القرآن: یسئلونک عن الأهلة کے تحت

جو شئ مباح مفسدہ سے مقترن ہو وہ ممنوع وواجب الترک ہے تو خود دعاء جہری کا ممنوع اور بدعت اور واجب الترک ہونا ثابت ہو گیا۔

پس یہ مروجہ دعاء جہری بدعت ہے اور چاہئے کہ اس کو ترک کر دیا جائے۔ البتہ اگر کسی علاقے میں عوام کا حال ایسا نہ ہو اور وہ اس دعاء جہری کو واجب نہ سمجھتے ہوں جس کی علامت یہ ہے کہ کہ ترک جہر پر ملامت نہ کرتے ہوں یا بلا التزام جہر نہ کرتے ہوں تو پھر ان لوگوں کے لیے وہ اپنی اصل یعنی جواز پر باقی رہے گی۔

چناں چہ حضرت حکیم الامت تھانوی رحمہ اللہ اپنے رسالہ ''استحباب الدعوات'' میں فرماتے ہیں:

''قد کثر الناس فی هٰذه المسئلة اعنی دعاء الامام عقیب الصلوٰة وتامین الحاضرین علیٰ دعائه وحاصل ماانفصل عنه الامام الغبرینی وابن عرفة ان ذلک ان کان علیٰ نیة انه من سنن الصلوٰة وفضائلها فهوغیرجائز وان کان مع السلامة من ذلک فهوباق علی حکم الاصل.'' (۱)

(لوگوں نے اس مسئلہ یعنی امام کے بعد نماز دعا مانگنے اور حاضرین کے اس پر آمین کہنے میں بہت کلام کیا ہے اور امام غبرینی اور امام ابن عرفہ نے جو تحقیق بیان کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ یہ نماز کی سنتوں میں سے ہے اور اس کے فضائل میں سے ہے تو پھر نا جائز ہے اور اگر اس (عقیدہ سنیت) سے سلامتی کے ساتھ ہے تو وہ اپنی اصل (یعنی جواز) پر باقی ہے۔)

(۱) رسالہ استحباب الدعوات مندرجہ امداد الفتاویٰ:۳/ ۸۰

دعاء جہری میں عملی مفاسد

یہاں تک اعتقادی مفسدہ کی تحقیق تھی۔ اب ہم دعاء جہری کے عملی مفاسد کا ذکر کرتے ہیں، اگرچہ دعاء جہری کے بدعت وواجب الترک ہونے کے لیے اعتقادی مفسدہ کا تحقق ہی کافی ہے، لیکن تکمیل بحث کی خاطر اور اس کی مزید شناعت وقباحت کی تحقیق کے لیے ان عملی مفاسد کا ذکر بھی مناسب ہے، سو اس میں کئی عملی مفاسد جمع ہیں:

(۱) سب سے پہلے اور عظیم مفسدہ تو یہ ہے کہ دعاء جہری سے طریق سنت کا ترک لازم آتا ہے؛ کیوں کہ سنت تو سر واخفاء ہی ہے جیسا کہ اوپر ثابت ہو چکا۔ البتہ کبھی کبھی کسی غرض صحیح و مصلحت کی خاطر ترکِ سر خلاف سنت نہیں، کیوں کہ اس کا ترک بھی ثابت ہے جیسا کہ فصل ثالث میں بتایا گیا ہے۔

(۲) دوسرا عملی مفسدہ اور خرابی یہ ہے کہ بعض حضرات مسبوق ہوتے ہیں یعنی نماز میں اتنی تاخیر سے آتے ہیں کہ ایک دو رکعات جماعت سے چھوٹ جاتے ہیں اور امام کے سلام پھیرنے کے بعد یہ لوگ اپنی باقی ماندہ نماز ادا کرنے کھڑے ہو جاتے ہیں، اب اگر دعاء بلند آواز سے کی جائے تو ان مسبوقین کے خیالات بٹ جاتے ہیں اور منتشر ہونے لگتے ہیں اور ان کے خشوع وخضوع میں خلل واقع ہوتا ہے۔ اسی لیے علماء اوقاتِ جماعت کے علاوہ بھی مسجد میں اس وقت بلند آواز سے قرآن پاک کی تلاوت کو ناجائز فرماتے ہیں جب کہ وہاں کوئی نماز پڑھ رہا ہو۔ تو پھر عین اوقات جماعت میں دعاء جہری کی کیونکر اجازت دی جاسکتی ہے؟

(۳) تیسرا عملی مفسدہ وہ ہے کہ جس کی جانب علامہ محمود آلوسی رَحمَہُ اللہُ کی منقولہ بالا عبارت میں اشارہ ہے کہ سر واخفاء کے ترک کرنے سے تضرع میں خلل

پڑتا ہے۔اور یہ بات مشاہدو مجرب ہے کہ جہاں سر و اخفاء مفقود ہوتا ہے وہاں خضوع بھی اور تضرع بھی رخصت ہوجاتے ہیں۔غالبًا یہی وجہ ہے کہ آیت شریفہ ''اُدْعُوْرَبَّكُم تَضَرُّعاً وَخُفْيَةً'' میں تضرع کا حکم دینے کے بعد فوراً اخفاء کا حکم دیا ہے کہ تضرع بلا اخفاء کے یا تو حاصل ہی نہیں ہوتا یا نہایت ہی مشکل ہے۔

(۴) چوتھا مفسدہ وہ ہے جو رسالہ استجاب الدعوات میں امام مالک رحمہ اللہ کے مذہب کی تحقیق کرتے ہوئے لکھا ہے:

''ففي ابى الحسن على الرسالة ما نصه القرافى كره مالك رحمہ اللہ وجماعة من العلماء الائمة المساجد والجماعات الدعاء عقيب الصلوات المكتوبة جهراً للحاضرين فتجمع لهذاالامام التقدم وشرف كونه نصب نفسه واسطة بين الله وعباده فى تحصيل مصالحهم على يد يه فى الدعاء فيوشک ان تعظم نفسه ويفسد قلبه وتعصى ربه فى هذه الحالة اكثر ممايطيعه.''

(امام ابوالحسن رحمہ اللہ کے حاشیۂ رسالہ میں یہ الفاظ ہیں۔قرافی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام مالک رحمہ اللہ اور علماء کی ایک جماعت نے مساجد کے اماموں اور جماعت کے اماموں کے لیے جہراً دعا مانگنا مکروہ سمجھا ہے، کیوں کہ اس صورت میں امام کے لیے دو چیزیں بڑائی اور سیادت کی جمع ہوں جائیں گی ایک امامت کے سبب سب سے آگے ہونا دوسرے یہ کہ اس نے اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ اور اس کے بندوں کے درمیان دعاء میں ایک واسطہ بنا کر قائم کردیا ہے، تو عجب نہیں کہ

اس کے نفس میں تکبر پیدا ہوجائے اوراس کا قلب فاسد ہوجائے۔
لہٰذا اس حالت میں حق تعالیٰ کی جتنی عبادت کررہا ہے اس سے زیادہ
گناہ میں مبتلا ہوجائے)(۱)

راقم السطور کہتا ہے کہ اس مفسدہ کا کچھ مشاہدہ ان دیہاتوں اوران علاقوں میں دورہ کرنے سے ہوسکتا ہے کہ جہاں لوگ امام ومؤذن کے پاس دعاء کرانے اور ایصال ثواب کروانے کے لیے کھڑے رہتے ہیں۔ کیوں کہ ان جاہل اماموں نے عوام کو یہ سمجھا رکھا ہے کہ ایصال ثواب، فاتحہ خوانی اورقرآن خوانی وغیرہ انہیں اماموں کے توسط سے کی جاسکتی ہے،ورنہ فاتحہ خوانی اور قرآن خوانی کا ثواب پہنچنا تو درکنار خود فاتحہ ہی صحیح نہیں ہوتی۔ اس طرح یہ لوگ خدا کی نافرمانی کرکے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔

(۵) پانچواں مفسدہ یہ ہے کہ مقتدیوں اور مصلیوں کو اس خاص وقت میں جس میں بحوالہ حدیث نبوی دعائیں قبول ہوتی ہیں (یعنی فرض نمازوں کے بعد کے وقت میں) اپنی حاجات اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ اگر ایسے ہی موقع میں اپنی ضروریات وحاجات کو اللہ کے سامنے نہ رکھیں گے تو پھر کب رکھیں گے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ قبولیت کے اورمواقع نہیں ہیں؛ بل کہ مطلب یہ ہے کہ یہ نمازوں کے بعد کا وقت تو بہت ہی اہم ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کی تاکید فرمائی ہے کہ فرض نمازوں کے بعد دعا کیا کرو۔ (۲)

(۶) چھٹا مفسدہ یہ ہے کہ آج کل عام طور پر ائمہ مساجد بعض دعاؤں کو رٹ کر

---

(۱) رسالہ استحباب الدعوات مندرجہ امداد الفتاوی:۸۰۱

(۲) رسالہ استحباب االدعوات مندرجہ امداد الفتاوی:۸۰۵

بلا سمجھے ویسے ہی پڑھ دیتے ہیں جس پر بے چارے عوام آمین آمین کہتے جاتے ہیں۔ ان رٹی رٹائی دعاؤں کے مطلب و معنی پر نہ ائمہ ہی توجہ کرتے ہیں نہ عوام، بس ایک رسم کے طور پر چند دعاؤں کو پڑھ دیتے ہیں اور ایسی دعاؤں کے بارے میں حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ جان لو اللہ تعالیٰ غافل قلب سے دعاء قبول نہیں کرتا۔ (۱)

پھر دعا محض پڑھ دینے کا نام نہیں ہے؛ بل کہ دعاء تو مانگنے کا نام ہے۔

پس جب اس مروجہ دعاء جہری میں کئی کئی مفاسد بھرے پڑے ہیں تو اس مباح کے مکروہ و ناجائز ہونے میں کیا تردد ہے؟ کیونکہ جیسا کہ اوپر عرض کر چکا ہوں کہ مباح میں اعتقادی یا عملی مفاسد منضم ہو جائیں تو وہ مباح مکروہ و ناجائز ہو جاتا ہے اور اس کا ترک واجب و لازم ہوتا ہے۔ پس یہ مروجہ دعاء بھی واجب الترک ہے۔

مستحب بھی مکروہ ہو سکتا ہے

مباح تو مباح ہی ہے وہ اگر کسی عارض کی وجہ سے مکروہ و ناجائز ہو جائے تو چنداں تعجب نہیں۔ فقہاء کرام نے بعض امور مستحبہ تک کو فساد عقیدہ یا خرابی عمل کی وجہ سے مکروہ فرمایا ہے جب کہ کبھی کبھی ترک نہ کیا جائے، حالاں کہ بعض سورتوں کا متعین کرنا خود شارع علیہ السلام سے ثابت ہے۔ (۲)

---

(۱) ترمذی: ۳۴۰۱

(۲) یہیں سے امام کے لیے عمامہ اور خطیب کے لیے عصا کے استعمال کا مسئلہ بھی معلوم ہو گیا کہ چونکہ ہمارے ان علاقوں میں ان چیزوں کو ضروری و واجب سمجھا جاتا ہے اس لیے ان پر بھی مداومت و استمرار مکروہ و بدعت ہوگا۔ اس موقع پر میرے ایک غیر مطبوعہ رسالہ ''اصلاح المفاسد'' سے چند سطور اس سلسلہ میں ملخصاً نقل کرتا ہوں، وہ یہ کہ:

''عمامہ کے بارے میں دو خرابیاں ہیں، ایک تو یہ کہ عوام و بعض خواص کالعوام نے اس کو وجوب کا درجہ دے دیا ہے، یہی وجہ ہے کہ عوام عمامہ کے بغیر امامت پر شدت سے انکار کرتے ہیں۔

اس سے بھی عجب یہ ہے کہ ڈاڑھی کٹانے والے کی امامت کو تو بلانکیر وکراہت درست رکھتے ہیں لیکن کیا مجال کہ کوئی بلاعمامہ نماز پڑھاوے۔اس سے عوام کے اعتقاد باطل وخیال فاسد کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ مستحب کو تو واجب گردانا اور واجب کو مباح سے گھٹا دیا۔یہی حال ہے عصا کے استعمال کا (جس کی تفصیل اصل رسالہ میں ہے)''

کیا اب بھی ان لوگوں کی آنکھیں نہیں کھلتیں جو مصلحت کی رٹ لگائے عوام کے عقائد باطلہ کی اصلاح سے دست کش ہیں؟ افسوس ہے کہ مصلحت کا نام لے کر بجائے اصلاح کے فساد پھیلایا جاتا ہے۔اس پر طرہ یہ کہ یہ حضرات بڑے زور سے کہہ دیا کرتے ہیں کہ اصلاح کرنے سے عوام میں فتنہ ہوگا اور قرآن میں فتنہ کو قتل سے اشد قرار دیا ہے۔مگر میں کہتا ہوں کہ یہ'' **کلمۃ حق ارید بھا الباطل**'' کی قبیل سے ہے۔کیونکہ قرآن میں لفظ فتنہ عقائد باطلہ یا اعمال قبیحہ یا اخلاق رذیلہ کے لیے استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ برے عقائد واعمال واخلاق قتل سے بھی اشد وسخت ہیں۔قرآن میں اردو والا فتنہ مراد نہیں ہے۔لہٰذا اس کو مراد لینا اپنی جہالت کا اظہار یا تحریف قرآن کا جرم اپنے سر لینا ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ عمامہ نماز وغیر نماز میں اور مقتدی وامام سب کے لیے سنت تھا۔مگر عوام نے اس کو ایک تو نماز کے ساتھ خاص کر دیا، دوسرے امام کے ساتھ۔

یہ اپنی جانب سے تخصیص وتقیید باطل ہے۔

بعض لوگ نماز میں خصوصیت کے ساتھ عمامہ باندھنے کی فضیلت پر بعض روایات سے استدلال کرتے ہیں۔مثلاً حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عمامہ کے ساتھ دو رکعت بلاعمامہ ستر رکعت سے افضل ہے۔اور ابن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نفل یا فرض نماز عمامہ کے ساتھ بلاعمامہ کے پچیس درجہ برابر ہے۔مگر اولاً تو محدثین نے ان روایات کو موضوع قرار دیا ہے (دیکھو فیض القدیر اور موضوعات صغریٰ وکبریٰ)

دوسرے اس میں امام کی تخصیص نہیں ہے اور وہی محل عبث ہے۔

الغرض ان خرابیوں کی وجہ سے ان چیزوں کو مداومۃً نہیں کرنا چاہئے۔یہ رسوم قابل اصلاح ہیں تاکہ حدود شرع سے تجاوز نہ ہو۔(**تلک حدود اللہ فلاتعتدوھا**) فقط۔

علامہ شامی رحمہ اللہ اس پر طویل بحث فرمانے کے بعد آخر میں رقمطراز ہیں:

”حاصل کلام هذين الشيخين بيان وجه الكراهة فى المداومة وهوأنه ان راى ذلک حتماً يكره من حيث تغيير الم شروع والايكره من حيث ايهام الجاهل.“ (۱)

(ان دو بزرگوں (علامہ ابن ہمام وابن نجیم) کے کلام کا حاصل (ان مستحب سورتوں پر) مداومت وہمیشگی میں کراہت یہ ہے کہ وہ (مستحب سورتوں پر التزام کرنے والا ان سورتوں کے پڑھنے کو) اگر ضروری خیال کرتا ہے یعنی واجب جانتا ہے تو یہ مکروہ ہے تغییر شرع کی وجہ سے، ورنہ مکروہ ہے جاہل کو (وجوب کے) وہم میں ڈالنے کی وجہ سے (کہ لوگ اس کو واجب سمجھیں گے)

الغرض جہاں تغییر شرع لازم آئے یا عوام جہلا کے واجب سمجھ جانے کا اندیشہ ہو تو اس مستحب کو بھی ترک کرنا لازم ہو جاتا ہے اور وہ مکروہ وممنوع ہو جاتا ہے۔ اسی وجہ سے ایک جلیل القدر وعظیم المرتبت صحابیِ رسول حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ:

”لايجعل أحدكم الشيطان شيئاً من صلوته يرى أن حقاً عليه أن لاينصرف عن يمينه لقد رايت رسول اللّٰه ا كثيراً ينصرف عن يساره.“ (۲)

(تم میں سے کوئی اپنی نماز میں شیطان کا حصہ مقرر نہ کرے کہ اپنے

---

(۱) رد المختار: ۱/۳۶۶

(۲) بخاري: ۱/۱۱۸

اوپر واجب جاننے لگے کہ سوائے داہنی طرف کے (بعد نماز) دوسری جانب سے نہ گھومے میں نے رسول اللہ کو بہت مرتبہ بائیں جانب سے بھی مڑتے دیکھا ہے)

اس حدیث میں حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے بعد نماز صرف داہنی طرف مڑنے کے ضروری سمجھنے پر اس کو شیطانی حصہ اور شیطانی عمل قرار دیا ہے۔ حالاں کہ داہنی جانب مڑنا رسول اللہ سے بیشتر احادیث سے ثابت ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی سنت کو واجب کا درجہ دیدینا بھی درست نہیں۔ اس حدیث کے تحت علامہ طیبی رحمہ اللہ شارح مشکوۃ فرماتے ہیں:

”وفيه أن من أصر على مندوب وَجَعلهُ عزماً ولم يعمل بالرخصة فقدأصاب منه الشيطان من الاضلال فكيف من أصرّعلى بدعةٍ اومنكر.“ (۱)

(اس حدیث میں یہ بات بتائی گئی کہ جو شخص امر مستحب پر اصرار اور پابندی (اس طرح) کرے کہ اس کو واجب سمجھے (خواہ اعتقاداً خواہ عملاً) اور رخصت پر عمل بالکل نہ کرے تو شیطان نے اس سے گمراہ کرنے کا حصہ حاصل کرلیا (جب امر مندوب پر اصرار اور اس کو واجب جاننے کا یہ حال ہے) تو بدعت اور منکر پر اصرار کرنے والے کا کیا حال ہوگا؟)

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اگر تھوڑی دیر کے لیے دعاء جہری کو مستحب ہی مان لیں تب بھی آج کل کی مروجہ دعاء جہری ان مفاسد اعتقادی و عملی کی وجہ سے بدعت و واجب الترک ٹھہرتی ہے۔

---

(۱) مرقاة المصابيح: ۲/۳۵۳

پس یہ بات واضح ہوگئی کہ مروجہ دعاء جہری بدعتِ مذمومہ وامرِ منکر ہے، اس کا ترک لازم اور ضروری ہے۔

دعاء جہری مفاسد سے خالی ہوتو؟

یہ سب کلام تھا اس مروجہ دعاء جہری میں جو مفاسد اعتقادیہ وعملیہ سے مرکب ہو لیکن جو دعاء جہری مفاسد سے خالی ہو وہ اپنی اصل پر باقی رہے گی اور جائز ومباح ہوگی جیسا کہ ہم نے رسالہ استحباب الدعوات سے نقل کیا ہے۔

دعاء جہری میں مصالح ہوں تو؟

اور اگر دعاء جہری مفاسد سے خالی ہونے کے ساتھ مصالح مطلوبہ عندالشرع پر مبنی ہو تو پھر یہ دعاء جہری افضل وعبادت ہوسکتی ہے۔ جیسا کہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ مباح میں اگر مصالح کا اعتبار کیا جاوے تو وہ مباح طاعت بن جاتا ہے۔ جس طرح چلنا ہے کہ یہ فی نفسہٖ مباح ہے، مگر بنیت عبادت یا بغرض عیادت افضل وعبادت ہے۔ اسی طرح دعاء جہری کسی مصلحت پر مشتمل ہو تو وہ بھی افضل ومستحب قرار دی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

تعلیم کی غرض سے دعاء میں جہر کرنا درست اور نفع متعدی ہونے کی وجہ سے افضل ہے۔ مگر یہ صرف اسی حد تک کہ غرض تعلیم پوری ہو جب یہ غرض پوری ہوجائے تو پھر اس کو ترک کر دینا چاہئے جیسا کہ اسی رسالہ میں امام شافعی رحمہ اللہ کا قول ''فتح الملهم'' سے نقل کیا گیا ہے کہ بقصد تعلیم جہر جائز تو ہے لیکن جب غرض پوری ہوجائے تو پھر دعا میں اسرار واخفاء کرنا چاہئے مگر یاد رہے کہ آج کل جو عام مساجد میں جہری دعاء کا رواج ہے اس میں اول تو یہ قصہ نہیں دوسرے مفاسد ہونے

کی وجہ سے اگر چہ اس میں مصالح ہوں تو یہ درست نہیں ہوگی۔ جیسا کہ عنقریب اس کی وضاحت آتی ہے۔

اس طرح اگر کوئی اس غرض سے جہر کرے کہ قلب میں تیقظ و بیداری پیدا ہو اور سستی دور ہو تو بھی جہر کی اجازت کے ساتھ استحباب کا قول بھی کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ یہ بھی ایک مطلوب عندالشرع مصلحت ہے۔ اسی مصلحت سے صوفیاء کرام نے ذکر میں جہر کو افضل قرار دیا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اصل و افضل جہر ہے؛ بل کہ یہ فضیلت و استحباب عارضی ہے، جو ایک غرض صحیح پر مبنی ہے، یہی محمل و مطلوب ہے ان روایات فقہیہ کا جن میں ذکر جہری کو افضل گردانا ہے۔ مثلاً علامہ ابن عابدین الشامی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"فان خلامما ذکرفقال بعض اھل العلم ان الجھر افضل لانه اکثرعملاً ولتعدی فائد ته الی السامعین ویوقظ قلب الذاکرفیجمع همه الی الفکرویصرف سمعه الیه ویطردالنوم ویزید النشاط." (۱)

(اگر (ذکر جہری) مفاسد مذکورہ سے خالی ہو تو بعض اہل علم نے فرمایا کہ جہر افضل ہے، کیونکہ یہ عمل کے اعتبار سے زیادہ ہے۔ نیز اس کا فائدہ سامعین کو بھی پہنچتا ہے اور یہ قلب کو بیدار کرتا ہے جس سے اس کا ارادہ وقصد غور وفکر کی طرف جمع ہوتا ہے اور اس کے کام بھی اس ذکر کی طرف لگ جاتے ہیں اور نیند کو دور کرتا ہے اور نشاط پیدا کرتا ہے)

---

(۱) ردالمحتار: ۳۴۴/۲

امام فخر الدین الرازی رحمہ اللہ تفسیر کبیر میں حکیم الترمذی رحمہ اللہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں:

”وان كان قد بلغ فى الصفاوقوة اليقين الى حيث صار آمناً عن شائبة الرياء كان الاولىٰ فى حقهٖ الاظهار لتحصيل فائدة الاقتداء. (۱)

(اگر (دعا یا ذکر کرنے والا) مقام صفا وقوت یقین کے اس مرتبہ کو پہنچ گیا ہے کہ ریاء کے شائبہ سے بھی مامون ومحفوظ ہو گیا تو اس کے حق میں اظہار یعنی جہر ہی اولی وافضل ہے تا کہ دوسروں کے اقتداء کرنے کا فائدہ حاصل ہو)

علامہ محمود آلوسی رحمہ اللہ نے بھی نقل کیا کہ دعاء جہری اس وقت افضل ہے جب کہ فائدہ متعدی ہو یا کسی مقصود کی تسہیل وغیرہ کا فائدہ حاصل ہو۔ ان کی عبارت تقریباً علامہ ابن عابدین رحمہ اللہ کی عبارت کے مثل ہے۔

ان سب عبارتوں اور اس کے علاوہ دیگر عبارات فقہاء میں دعاء جہری یا ذکر جہری کو جو افضل قرار دیا ہے، یہ ان مصالح مطلوبہ کے پیش نظر ہے جو خود ان عبارات میں مجملاً یا مفصلاً، صراحتاً یا اشارۃً مذکور ہیں۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں یہ شبہ نہ ہونا چاہیئے کہ جب دعاء سری افضل ہے تو پھر جہری کس طرح افضل ہو جاوے گی۔ کیونکہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ کسی عارض کی وجہ سے غیر افضل افضل ہو جاوے اور موخر مقدم ہو جائے چناں چہ اس کی نظیر حدیث میں بھی ملتی ہے۔

(۱) تفسیر کبیر: ۱۴/۱۳۱

وہ یہ کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ اگر بوقت اقامت کھانا حاضر ہو جائے (اور کھانے کا تقاضا بھی ہو تو) تو پہلے کھانا کھالے پھر جماعت میں شریک ہو۔ (۱)

اس مضمون کی احادیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا، انس رضی اللہ عنہ و ابن عمر رضی اللہ عنہما وغیرہ سے بخاری وغیرہ میں مروی ہیں۔ اسی بنا پر فقہاء نے لکھا ہے کہ ایسی صورت میں کھانا پہلے کھالینا افضل و مستحب ہے تا کہ نماز میں کھانے کا دھیان رہنے کے بجائے کھانے میں نماز کا دھیان ہو۔ یا یوں کہو کہ خشوع و خضوع میں خلل سے بچنے کے لیے کھانے کو مقدم کرنا افضل ہے۔

اس میں غور کیجیے کہ کھانے پر جماعت کی افضلیت ایک امر مسلم ہے، لیکن ایک مصلحت کی خاطر حدیث میں کھانے کو مقدم و افضل قرار دیا گیا اور وہ مصلحت مطلوب عند الشرع ہے۔ یعنی نماز میں خشوع میں خلل نہ پڑنا۔ مگر اس سے کوئی یہ استدلال ہرگز نہیں کرسکتا کہ مطلقاً کھانا کھانا جماعت میں شرکت سے افضل ہے۔

اس کی دوسری نظیر صوفیاء کرام کا یہ قول ہے جو ان کے یہاں مشہور ہے یعنی ''شیخ کی ریاء مرید کے اخلاص سے بہتر ہے''۔

سب جانتے ہیں کہ اخلاص افضل عبادت بل کہ مغز عبادت ہے اور اس کے مقابلہ میں ریاء افضل تو کیا بدترین چیز بل کہ عبادت کو بھی برباد کر دینے والی ہے، مگر محض ظاہر میں لوگوں کو دکھا کر عمل کرنا اگر شیخ کامل کی طرف سے ہو تو اس میں مفاسد تو ہوتے نہیں اور مصالح مرتب ہوتے ہیں۔

مفاسد تو اس لیے نہیں کہ وہ شیخ کامل قوت یقین و صفا کے اعلیٰ مراتب پر فائز ہوتا ہے۔ لہٰذا دل میں کوئی خرابی مثل لوگوں کو دکھانے یا خوش کرنے کی نہیں ہوتی اور مصالح اس لیے مرتب ہوتے ہیں کہ اس کے معتقدین و منسلکین اس کو دیکھ کر عبادت

(۱) بخاري: ۹۲/۱

میں رغبت حاصل کرتے اور طریقِ عبادت سیکھتے ہیں۔ اس لیے صوفیاء نے اس ریا کاری کو مرید کے اخلاص سے بھی افضل قرار دیا ہے، مگر اس کا کیا یہ مطلب ہوسکتا ہے کہ ریاء افضل ہے اور اخلاص غیر افضل؟ ہرگز نہیں۔

پس معلوم ہوا کہ اگر کوئی غیر افضل چیز مصالح پر مبنی ہو تو وہ بھی افضل ہوسکتی ہے، اس طرح دعاء جہری اگر مصالح شرعیہ پر مبنی ہو تو افضل ہو جائے گی۔

ایک سوال و جواب

یہاں اگر کوئی یہ سوال کرے کہ یہ مروجہ دعاء جہری بھی بعض مصالح پر مبنی ہے مثلاً لوگوں کو اس میں دعاء کی تعلیم ہے تو پھر مروجہ دعاء بھی افضل ہونا چاہئے۔ پھر اس کو بدعت کیوں قرار دیا گیا؟

اس کا جواب اولاً تو یہ ہے کہ آج کل یہ بات بالکل مفقود ہے۔ برسہابرس سے لوگ امام کی دعاء سنتے ہیں مگر خال خال ہی کوئی ہوں گے جو اس سے فائدہ اٹھاتے ہوں، کیونکہ اس کے لیے طالب و متعلم میں قصد و ارادہ کا ہونا شرط ہے، اور لوگ اس نیت سے دعائیں سنتے ہی نہیں، پھر ان کو کیونکر فائدہ ہوگا؟ لہٰذا آج کل یہ محض ایک رسم ہے جس میں کوئی فائدہ نہیں۔

ثانیاً اگر اس فائدہ کو تسلیم کر لیں تو پھر بھی یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ان مصالح کی بنا پر دعاء جہری کی وہاں اجازت ہے جہاں کہ اس میں مفاسد عملیہ و اعتقادیہ نہ ہوں۔ ہم اس کی طرف اس رسالہ میں اشارہ کر چکے ہیں۔

کیوں کہ فقہی و شرعی اصل اور قاعدہ ہے کہ اگر کوئی عمل مصالح و مفاسد سے مرکب ہو تو اعتبار مفاسد کا ہوگا۔

حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ اپنی تحریر "مکتوب محبوب القلوب" میں فرماتے ہیں:

''اب دوسرا قاعدہ سمجھنے کے قابل ہے کہ بعض افعال مباحہ تو ایسے ہوتے ہیں کہ ان میں سرتا پا مفسدہ ہی مفسدہ ہے، اس لیے اس کے ممنوع ہونے میں کلام نہیں ہوتا۔ بعض افعال ایسے ہیں جن میں کچھ مصلحت اور کچھ مفسدہ ہوتا ہے، کسی کی نظر مصلحت پر ہوتی ہے اور مفسدہ کی طرف یا تو التفات نہیں ہوتا یا اس کو قابلِ اعتبار نہیں سمجھتے یا اس میں کچھ تاویل کی گنجائش سمجھ لیتے ہیں۔

ایسا شخص اس کو جائز بل کہ مستحسن کہتا ہے اور کسی کی نظر مفسدہ پر بھی ہوتی ہے خواہ مفسدہ لازم ہو یا متعدی ،ایسا شخص اس کو ممنوع ٹھہراتا ہے، خواہ مصلحت پر نظر ہی نہ ہو یا اس پر بھی نظر ہو۔ کیونکہ قاعدہ مقررہ ہے کہ جب حلّت وحرمت کے اسباب کسی ٹئ میں جمع ہوجاتے ہیں تو وہاں حرمت ہی کو ترجیح ہوتی ہے۔''(۱)

اسی طرح علامہ عمیم الاحسان رحمۃ اللہ نے قواعد الفقہ میں علامہ ابن النجیم المصری رحمۃ اللہ کی مشہور کتاب ''الاشباہ والنظائر'' سے نقل کرتے ہیں:

''اذااجتمع الحلال والحرام والمحرم والمبیح غلب الحرام والمحرم.'' (۲)

(جب (کسی شی میں) حلال وحرام یا (اسباب حلت وحرمت جمع ہوجائیں تو حرام اور سبب حرمت کو ترجیح ہوتی ہے)

حاصل یہ ہے کہ اگر کسی چیز میں مصالح ومفاسد جمع ہوجائیں تو مفاسد کا اعتبار کرکے اس کو حرام وناجائز کہیں گے یا مکروہ قرار دیں گے۔ ہاں اگر مفاسد نہ ہوں

(۱) قواعد الفقه : ۵۵

(۲) قواعد الفقه : ۵۵

اور مصالح بھی ملحوظ ہوں تو پھر مصالح معتبر ہوں گے۔ اس لیے جن فقہاء نے دعاء جہری کو افضل کہا ہے انہوں نے یہ بھی قید لگائی کہ مفاسد سے خالی ہو۔ چناں چہ منقولہ بالا علامہ شامی رحمہ اللہ کی عبارت میں ''فان خلا مماذکر'' (اگر مفاسد مذکورہ سے خالی ہو) اور علامہ رازی رحمہ اللہ کی کتاب میں ''فان کان قد بلغ (الی ان قال) صار آمناً عن شائبة الریاء'' اس پر صریح دال ہیں کہ مفاسد سے خالی ہونے کی صورت میں مصالح کا اعتبار ہوگا۔

پس مروجہ دعاء جہری کے جواز کی کوئی تاویل نہیں کی جاسکتی، لہٰذا یہ قابل ترک ہے۔ اس جگہ حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ کا ایک مضمون معارف سے نقل کرتا ہوں جس سے میری تائید ہوتی ہے۔

چناں چہ مفتی صاحب رحمہ اللہ معارف القرآن میں فرماتے ہیں:

''ہمارے زمانے کے ائمہ مساجد کو اللہ تعالیٰ ہدایت فرمادیں کہ قرآن وسنت کی اس تلقین کو اور بزرگانِ سلف کی ہدایات کو یکسر چھوڑ بیٹھے، ہر نماز کے بعد دعا کی ایک مصنوعی سی کارروائی ہوتی ہے، بلند آواز سے کچھ کلمات پڑھے جاتے ہیں جو آدابِ دعاء کے خلاف ہونے کے علاوہ ان نمازیوں کی نماز میں بھی خلل انداز ہوتے ہیں، جو مسبوق ہونے کی وجہ سے امام کے فارغ ہونے کے بعد اپنی باقی ماندہ نماز پوری کررہے ہیں۔ غلبہ رسوم نے اس کی برائی اور مفاسد کو ان کی نظروں سے اوجھل کردیا ہے۔ کسی خاص موقع پر خاص دعاء پوری جماعت سے کرانا مقصود ہو، ایسے موقع پر ایک آدمی کسی قدر آواز سے دعاء کے الفاظ کہے اور دوسرے آمین کہیں، اس کا مضائقہ نہیں۔

شرط یہ ہے کہ دوسروں کی نماز وعبادت میں خلل کا موجب نہ بنیں۔اور ایسا کرنے کی عادت نہ ڈالیں کہ عوام یہ سمجھنے لگیں کہ دعاء کرنے کا طریقہ یہی ہے جیسا کہ آج کل عام طور سے یہ ہو رہا ہے۔یہ بیان اپنی حاجات کے لیے کرنے کا تھا اگر دعا کے معنی اس جگہ (آیت ادعوا) میں ذکر وعبادت کے لیے جاویں تو اس میں بھی علماء سلف کی تحقیق یہی ہے کہ ذکرِ سر ذکر جہر سے افضل ہے۔اور صوفیاء کرام میں مشائخ چشتیہ جو مبتدی کو ذکر جہر کی تلقین فرماتے ہیں وہ اس شخص کے حال کی مناسبت سے بطور علاج کے ہے تا کہ جہر کے ذریعہ کسل اور غفلت دور ہو جاوے اور قلب میں ذکر اللہ کے ساتھ ایک لگاؤ پیدا ہو جائے،ورنہ فی نفسہ ذکر میں جہر کرنا ان کے یہاں بھی مطلوب نہیں۔گو جائز ہے اور جواز بھی اس کا حدیث سے ثابت ہے بشرطیکہ ریا و نمود نہ ہو۔"(۱)

خلاصۃ المرام

پوری بحث اور سارے رسالہ کا ماحصل و نچوڑ یہ ہے کہ قرآنی وحدیثی دلائل کی روشنی میں دعاء میں سر و اخفاء ہی اصل وافضل ہے اور اس پر جمہور علماء امت کا بالخصوص ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے تو گویا یہ مسئلہ قرآن وحدیث کے ساتھ اجماع امت سے بھی مؤید و مدلل ہے۔اور جن حضرات نے اس میں اختلاف کرتے ہوئے دعاء جہری کو افضل و مستحب کہا ہے،علماء محققین و جمہور ائمہ کے نزدیک ان کا قول نا قابلِ التفات ہے اور جن دلائل پر اس قول مخالف کی بنیاد ہے،علماء نے ان دلائل کو مخدوش

(۱) معارف القرآن: ۳/۵۷۸

اور اپنے مدعی پر غیر صحیح یا غیر صریح وماؤّل قرار دے کر ان کے مدلل جوابات دید یئے ہیں۔لہٰذا دعاء جہری کا حکم کہ اگر کوئی کرے تو کیسا ہے؟

تو اس میں تفصیل یہ ہے کہ دعا اگر جہر مفرط سے ہوتو بالاتفاق ناجائز ہے۔جس پر علمائے کرام کی بے شمار تصریحات ہیں، جن میں سے بعض کو ہم نے بھی نقل کر دیا ہے۔اور اگر دعاء جہر متوسط ومعتدل سے ہوتو پھر اس میں یہ تفصیل ہے کہ مفاسد ومصالح دونوں سے قطع نظر فی نفسہ جائز ہے۔اور اگر اس میں مفاسد اعتقادیہ یا عملیہ منضم ہوں تو پھر ناجائز ہے۔اگر چہ اس میں مصالح بھی ہوں، لیکن ان مصالح کا اعتبار نہ ہوگا۔اور اگر دعاء جہری مفاسد سے خالی اور پھر اس میں مصالح بھی ملحوظ ومضمر ہوں تو افضل واولیٰ ہوگی۔

پس دعاء بجہر معتدل فی نفسہ جائز ہے، لیکن اس میں کبھی عارضی کراہت آجاتی ہے اور کبھی عارضی فضیلت لاحق ہو جاتی ہے اور اصل اور ذاتی فضیلت دعاء سری ہی کی ہے۔

اس تقریر سے تمام دلائل قرآنیہ وحدیثیہ وروایات فقہیہ میں پوری تطبیق ہوگئی اور مسئلہ کی وضاحت کے ساتھ سبھی قسم کے اشکالات وشبہات کے جوابات بھی ہو گئے۔

وللّٰہ الحمد اولاً وآخراً ولہٗ الشکر ظاھراً وباطناً علی ما وفقنی لتحریر ھذہ العجالۃ و ألھمنی الصواب علی وفق طریقہ الفقھاء ھذا ما اردت ایرادہ فی ھذا المقام.

محمد شعیب اللّٰہ خان

۲۵ . ۱۱ . ۲۰۰۳

عمرہ کیسے کریں؟

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تمہیدی گزارش

الحمد للہ کہ اللہ تعالیٰ اسی سال ماہ مئی میں عمرہ کی سعادت بخشی تو مدینۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم میں حاضری کے موقعہ پر روضۂ خضرا کے قریب بیٹھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ عمرہ کے متعلق ایک مختصر رسالہ تحریر کروں جس میں آسان پیرائے میں سنت نبوی کے مطابق عمرے کا طریقہ و احکام درج ہوں۔ اس خیال کے پیدا ہونے کا باعث اگر ایک جانب یہ تھا کہ اس مقدس بقعہ میں کوئی علمی کام مجھ حقیر سے ہو جائے تو یہ میرے لیے سعادت کی بات ہوگی تو دوسری جانب یہ بھی تھا کہ عموماً عمرے کے احکام و مسائل کے لیے حج پر لکھی ہوئی کتابوں کو دیکھنا پڑتا ہے اور خاص عمرے ہی کے عنوان پر کتابیں کم ملتی ہیں۔ لہٰذا صرف عمرے ہی کے متعلق ضروری احکام و مسائل اور اس کا طریقہ لکھا جانا مناسب معلوم ہوا۔

احقر نے اسی خیال کو عملی جامہ پہناتے ہوئے یہ سطور بتاریخ: ۲۵/ جمادی الاولی ۱۴۳۱ھ ہجری مطابق ۱۰/ مئی ۲۰۱۰ء عیسوی بعد نماز عصر و مغرب دو نشستوں اور ۱۱/ مئی بعد عصر و مغرب کی دو نشستوں میں روضۂ اقدس کے قریب بیٹھ کر لکھیں۔ جو کتب پاس موجود تھیں ان کی مدد سے اور اپنے حافظہ میں موجود باتوں کو پیش نظر رکھ کر لکھتا گیا اور یہ بات دل میں تھی کہ بعض تشنہ امور کی تکمیل اور حوالوں کی تحقیق واپسی کے بعد مراجعت کر کے کر دوں گا؛ لہٰذا بعض امور کی وضاحت و تکمیل اور حوالوں کی تحقیق بعد

مراجعتِ کتب یہاں آنے کے بعد کردی۔اس طرح الحمد للہ یہ مختصر رسالہ جوار نبوی میں بیٹھ کر لکھنے کی سعادت ملی۔

اور اس موقعہ پر جوار نبوی کی یہ عظیم برکت بھی ظاہر ہوئی کہ مختصر سے وقت میں اللہ تعالی نے اس کام کو کروادیا اور مزید یہ کہ احقر کو کئی سالوں سے گردن اور ہاتھ کے درد کی شدید تکلیف ہے جس کی وجہ سے میں سال ہا سال سے لکھ نہیں پاتا اور اگر لکھتا ہوں تو دو چار منٹ ہی کے بعد انتہائی شدید تکلیف کی وجہ سے بے قابو ہوجاتا اور لا محالہ تحریری کام کو بند کردیتا ہوں؛ لیکن اس جگہ میں مسلسل یہ رسالہ وہیں بیٹھ کر لکھتا رہا؛ مگر کوئی کسی قسم کی تکلیف نہیں ہوئی۔ وللہ الحمد علی ذلک۔

دعا ہے کہ اللہ تعالی اس مختصر رسالے کو اپنے دربار عالی اقدار میں اور اپنے نبی محبوب کے دربار گہر بار میں مقبول بنائے اور زائرین حرم کے لیے اس کو مشعل راہ بنائے اور میری نجات کا وسیلہ وذریعہ فرمائے۔آمین یارب العالمین

محمد شعیب اللہ خان

مہتمم جامعہ اسلامیہ مسیح العلوم، بنگلور

۲۱/شوال/۱۴۳۱ھ/ہجری

مطابق: یکم اکتوبر/۲۰۱۰عیسوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عمرہ

عمرے کی فضیلت

عمرہ ایک بہت عظیم الشان عبادت ہے، اس کی فضیلت میں حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« وَفْدُ اللّٰهِ ثَلاثَةٌ :الغَازِيْ وَالْحَاجُّ وَالْمُعْتَمِرُ. »

(اللہ کے مہمان تین ہیں: ایک غازی دوسرا حاجی اور تیسرا عمرہ کرنے والا۔)(۱)

ایک حدیث میں یہ آیا ہے:

« اَلْحُجَّاجُ وَالْعُمَّارُ وَفْدُ اللّٰهِ، إِنْ دَعَوْهُ أَجَابَهُمْ وَإِنِ اسْتَغْفَرُوْهُ غَفَرَلَهُمْ. »

(حاجی وعمرہ کرنے والے لوگ اللہ کے مہمان ہیں، اگر وہ اس سے مانگیں تو اللہ ان کی دعا قبول کرتا ہے اور اگر گناہوں سے معافی چاہیں تو ان کو معاف کر دیتا ہے۔)(۲)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ:

---

(۱) سنن النسائی: ۲۶۲۵، سنن بیہقی: ۵/۲۶۵م

(۲) سنن ابن ماجہ: ۲۸۹۲،سنن بیہقی: ۵/۲۶۲

« مَنْ أَتٰى هٰذَا الْبَيْتَ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَمَا وَلَدَتْهُ أُمُّهُ. »

(جو شخص اس اللہ کے گھر یعنی کعبہ میں حاضر ہوا پھر نہ کوئی بے حیائی کی بات کی اور نہ کوئی گناہ کا کام کیا، تو وہ اس طرح واپس ہوگا جیسے اس کی ماں نے جنا ہو یعنی اس پر کوئی گناہ نہ ہوگا۔)(۱)

ایک حدیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے ہی مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« اَلْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِّمَا بَيْنَهُمَا وَ الْحَجُّ الْمَبْرُوْرُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةَ. »

(عمرہ دوسرے عمرے تک کے تمام گناہوں کا کفارہ ہے اور حج مبرور یعنی مقبول کی جزا جنت ہی ہے۔)(۲)

اور خاص طور پر رمضان میں عمرے کا ثواب بہت زیادہ ہے، ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« عُمْرَةٌ فِيْ رَمَضَانَ تَعْدِلُ حَجَّةً. »

(رمضان میں عمرہ ایک حج کے برابر ہے۔)(۳)

ان احادیث سے عمرے کی فضیلت معلوم ہوتی ہے، بالخصوص رمضان مبارک کے

---

(۱) مسلم: ۳۳۵۷، سنن کبری بیهقی: ۲۶۲/۵

(۲) مسلم: ۳۳۵۵، ترمذی: ۹۳۳، سنن النسائی: ۲۶۲۹، سنن بیهقی: صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان: ۹/۹

(۳) مسلم: ۳۰۹۷، ترمذی: ۹۳۹، سنن النسائی: ۲۱۱۰، صحیح ابن حبان بترتیب ابن بلبان: ۱۳/۹، ابن ماجه: ۲۹۹۱، سنن دارمی: ۱۹۱۳

مہینہ میں عمرے کی فضیلت کہ وہ حج کے برابر ہے؛ لہٰذا ہر مسلمان کو جسے اللہ نے اس قدر وسعت دی ہے کہ وہ عمرے کے لیے جائے، عمرہ کر لینا چاہیے تا کہ یہ فضیلت اس کو نصیب ہو۔

عمرے کا حکم

عمرے کا حکم کیا ہے کہ یہ سنت ہے یا واجب؟ اس میں علما کا اختلاف ہے۔ بعض ائمہ نے اس کو فرض و واجب کہا ہے، حضرت قتادہ اور حضرت حسن بصری رحمہما اللہ نے حج و عمرے کو فرض کہا ہے اور حضرت عطا رحمہ اللہ کا بھی یہی قول ہے۔ اور صحابہ میں سے حضرت عمر و ابن عمر رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے۔ اور امام شافعی رحمہ اللہ کا قول جدید یہی ہے اور شوافع نے اسی کو اصح قرار دیا ہے اور امام احمد و امام سفیان ثوری اسحاق بن راہویہ رحمہم اللہ وغیرہ ائمہ کا بھی یہی قول ہے۔ (۱)

اور علماء احناف میں سے بھی بعض نے اسی کو اختیار کیا ہے، جیسے علامہ کاشانی صاحب رحمہ اللہ البدائع اور علامہ صاحب الجوہرۃ النیرۃ وغیرہ اور اکثر نے اس کو سنت مؤکدہ قرار دیا ہے۔ اور یہی امام مالک، امام نخعی، امام ابو ثور رحمہم اللہ وغیرہ ائمہ کا مسلک ہے۔ (۲)

الغرض عمرے کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ فرض و واجب ہے یا سنت؟ اور خود علمائے حنفیہ میں بھی اس بارے میں دو قول ہیں؛ لہٰذا زندگی میں کم از کم ایک بار اس کا اہتمام کر لینا چاہیے۔ ہاں اس صورت میں اس کے واجب ہونے کی وہی شرائط ہیں جو حج کے فرض ہونے کے شرائط ہیں۔ (۳)

---

(۱) المناسک لابن ابی عروبہ و المجموع للنووی: ۷/۷

(۲) المجموع: ۷/۷، بدائع: ۳/۲۲۶، الجوہرۃ النیرۃ: ۲/۷۸، شامی: ۲/۵۲۰

(۳) بدائع الصنائع: ۳/۲۲۷

عمرے سے پہلے

اے زائرِ حرم بھائی! اگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو عمرہ کرنے کے لیے وسعت وسہولت دی ہے اور اسی کے ساتھ اس کا ارادہ وشوق دیا ہے تو سب سے پہلے اللہ کی بارگاہ اقدس میں شکر ادا کیجیے کہ اس نے بہت بڑی سعادت آپ کے لیے مقدر کی ہے۔ کتنے لوگ ہیں کہ مال و دولت ان کے پاس ہے مگر یہ سعادت ان کے حصے میں نہیں آئی، اور بہت سے ایسے ہیں کہ اس کا ارادہ وشوق بھی کرتے ہیں پھر بھی کامیاب نہیں ہوتے۔ لہٰذا یہ سمجھیے کہ یہ محض اللہ عزوجل کا فضل واحسان ہے جو اس نے بلاکسی استحقاق کے عطاء کیا ہے، اور جان لیجیے کہ:

ایں سعادت بزور باز ونیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ
(یہ سعادت زور بازو سے حاصل نہیں ہوسکتی
جب تک کہ عطا کرنے والا خدا عطا نہ کرے)

امام علی بن الموفق رحمہ اللہ بڑے پائے کے محدث وعابد وزاہد تھے، انھوں نے جب ساٹھ حج کر لیے تو طواف کے بعد میزاب رحمت کے نیچے بیٹھ کر سوچنے لگے کہ میں نے حج تو اتنے کر لئے مگر معلوم نہیں کہ اللہ کے نزدیک میرا کیا مقام ہے؟ کہتے ہیں کہ اسی سوچ میں نیند لگ گئی تو خواب میں کیا دیکھتا ہوں کہ ایک شخص کہہ رہا ہے کہ اے علی! تم اپنے گھر کیا کبھی اس کو بھی بلاتے ہو جس کو تم نہیں چاہتے؟ مطلب یہ کہ تم بھی ہمارے ہو، اس لئے ہم نے تم کو اپنے گھر بلایا ہے۔ (۱)

لہٰذا اس کو نہ اپنا کمال سمجھیے اور نہ اپنے مال و دولت کی دین، بلکہ محض اللہ کا فضل

---

(۱) صفة الصفوة: ۲/۱۰۷، طبقات ابن الملقن: ۱/۵۷

سمجھ کر اس کا شکر کرتے ہوئے، عمرہ کی تیاری کیجیے، تا کہ عمرہ صحیح معنی میں عمرہ ہو اور وہ فضائل مرتب ہو جو اس کے بتائے گئے ہیں۔

عمرے کی تیاری کے سلسلے میں چند اہم امور کی جانب آپ کی توجہ ہونا چاہیے، ان میں سے ایک یہ ہے کہ اپنے آپ کو ظاہر و باطن کے لحاظ سے پاک وصاف کرنے اور اللہ عزوجل کے دربار عالی میں حاضری کے قابل بنانے کی فکر کریں؛ کیوں کہ یہ دربار کسی معمولی حاکم و بادشاہ کا نہیں؛ بل کہ اس کا دربار ہے جس کے سامنے سارے حاکم و بادشاہ، امیر و رئیس سب کے سب سر جھکاتے ہیں، یہ احکم الحاکمین و رب العالمین کی بارگاہ ہے، یہ وہ جگہ ہے جہاں بادشاہ بھی فقیر بن کر آتے ہیں، اور جہاں:

ایک ہی صف میں کھڑے ہوگئے محمود وایاز
نہ کوئی بندہ رہا، نہ کوئی بندہ نواز

کا ایک عجیب و روح پرور منظر دکھائی دیتا ہے۔ جہاں امیروں کی امارت، رئیسوں کی ریاست، شاہوں کی شاہی، اور وزیروں کی وزارت خاک میں ملتی نظر آتی ہے۔ ایسے عالی شان دربار میں جانے کے لیے اپنے آپ کو کس قدر آراستہ و پیراستہ کرنا چاہیے؟ اس کا اندازہ ہر شخص خود کر سکتا ہے۔ لہٰذا تمام ظاہری و باطنی گناہوں سے صدق دل کے ساتھ رو رو کر اللہ کے سامنے توبہ کیجیے، اس کو منا لیجیے اور آئندہ گناہ نہ کرنے کا عزم مصمم کیجیے، پھر ذکر و اذکار اور عبادات کے ذریعے اپنے دل کو روشن و منور کر لیجیے اور بار بار اللہ کے دربار کی عظمت و سطوت کا تصور جمائیے۔

عمرے کی تیاری کے بارے میں ایک بہت اہم بات یہ پیش نظر ہونا چاہیے کہ اللہ کے گھر کی زیارت اور نبی کے روضہ مقدسہ کا دیدار اور عمرہ جیسی عبادات کسب حلال کے ذریعے حاصل ہونے والی کمائی سے انجام دی جائیں، کوئی ایک حبہ بھی

ناجائز کمائی کا، غصب وظلم کا، سود ورشوت کا ہرگز ہرگز نہ ہو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس قسم کے روپے پیسے کی وجہ سے ایسی عظیم عبادات ضائع چلی جائیں۔

ملا علی قاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب: "أنوار الحجج في أسرار الحج" میں اور علامہ حطاب الرعینی رحمہ اللہ نے "مواھب الجلیل" میں ایک حدیث نقل کی ہے کہ جب آدمی مال حرام سے حج کرتا ہے اور کہتا ہے: "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ" تو اللہ تعالی فرماتے ہیں: "لَا لَبَّیْکَ وَلَا سَعْدَیْکَ." (۱)

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے کہ جب کوئی شخص مال حرام سے حج کرتا ہے اور "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ" کہتا ہے تو اللہ تعالی اس سے کہتے ہیں کہ: لَا لَبَّیْکَ وَلَا سَعْدَیْکَ وَحَجُّکَ مَرْدُوْدٌ عَلَیْکَ" (تیرا لبیک منظور نہ سعدیک اور تیرا حج تجھ پر مردود ہے۔)(۲)

لہٰذا یہ کوشش ہونا چاہیے کہ حلال روپے سے حج وعمرہ کیا جائے تا کہ وہ مقبول ہو، ورنہ نہ حج مقبول ہوگا نہ عمرہ مقبول ہوگا؛ کیوں کہ مقبولیت کی شرط یہ ہے کہ حلال روپیہ اللہ کے لیے خرچ کیا جائے۔

عمرے کے سفر کے لیے ایک کوشش یہ ہونا چاہیے کہ نیک وصالح لوگوں کی معیت وصحبت میں یہ سفر کیا جائے، بالخصوص حضرات علما ومشائخ کے ساتھ سفر کی کوشش کی جائے، اس کے بہت سے فائدے ہیں: ایک تو یہ کہ نیک لوگوں کی صحبت کا نیک اثر مرتب ہوگا، دوسرا یہ کہ وقت صحیح طور پر گزرے گا، بیکار باتوں اور فضول کاموں سے بچنا نصیب ہوگا، اور تیسرا یہ کہ عمرہ وحج صحیح طریقہ اور سنت کے مطابق

(۱) انوار الحجج تحقیق دکتور احمد الحجی: ۳۷، مواھب الجلیل: ۷/۱۷۳

(۲) امالی ابن مردویہ: ۲۲۰

کرنا آسان ہوگا؛ کیوں کہ آپ کو کسی بات میں بھول ہوگی تو یہ حضرات یاد دہانی کریں گے، اگر کوئی بات دین کی یا حج وعمرے کی معلوم نہ ہوتو وہ سکھائیں گے، سستی ہوگی تو ان کی صحبت سے نیکی کرنے میں نشاط پیدا ہوگا اور ان کو دیکھ کر بہت سی عبادات ونیکیوں کے کرنے کا جذبہ پیدا ہوگا۔ اس کے برخلاف جاہلوں یا برے لوگوں کے ساتھ جائیں گے تو وہ خود ہمارا وقت خراب کریں گے، کبھی غیبت ہوگی، کبھی فضول باتیں ہوں گی کبھی دنیوی امور پر خوامخواہ باتیں ہوں گی، حتی کہ دل فاسد و خراب ہو جائے گا۔ اس لیے اچھے و نیک لوگوں کی صحبت اختیار کرتے ہوئے یہ سفر ہو تو خوب رہے گا اور اگر اپنے وطن سے کسی نیک و بزرگ شخصیت کی معیت نصیب نہ ہوئی تو پھر یہ کوشش کیجیے کہ وہاں پہنچنے کے بعد کوئی اللہ والے مل جائیں، وہاں تو بہت اللہ والے آتے ہیں، دنیا کے چپہ چپہ سے آتے ہیں، تلاش کریں تو مل جائیں گے۔ مگر افسوس کہ اب لوگ اس سے اس قدر بے خبر ہیں کہ ان کو کوئی اللہ والے مل بھی جائیں تو ان کی طرف رخ نہیں کرتے۔

اے بھائی زائر حرمین! یہاں ایک اور اہم بات کی جانب آپ کی توجہ مبذول کرانا ضروری خیال کرتا ہوں، وہ یہ کہ اس راہ میں خصوصاً اور ہر عبادت میں عموماً اخلاص کی بڑی ضرورت ہے، اخلاص ہر عبادت کی اساس و بنیاد ہے، اس کے بغیر کوئی نیکی وعبادت اللہ کے یہاں قابل قبول نہیں ہوسکتی، اور اخلاص کا مطلب یہ ہے کہ صرف اور صرف اللہ کی خوشنودی کے لیے عبادت انجام دی جائے اور کوئی مقصد دنیوی پیش نظر نہ ہو۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا:

« يَأْتِي عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ يَحُجُّ أَغْنِيَاءُ أُمَّتِي لِلتَّنَزُّهِ وَ أَوْسَاطُهُمْ لِلتِّجَارَةِ وَ قُرَّاءُ هُمْ لِلرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ وَفُقَرَاءُ هُمْ

لِلْمَسْئَلَةِ.»

(ایک زمانہ لوگوں پر ایسا آئے گا کہ اس میں میری امت کا مال دار طبقہ سیر وتفریح کے لیے اور درمیانہ طبقہ تجارت کے لیے، علما وقراء کا طبقہ ریا وشہرت کی خاطر اور فقیر ومسکین لوگوں کا طبقہ مانگنے کے لیے حج کرے گا۔)(۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے اپنی امت کو پہلے ہی سے اس بات کی جانب متوجہ کر دیا ہے کہ اللہ کے گھر کی زیارت حج وعمرہ میں اخلاص کا فقدان نہ ہونا چاہئے ؛بل کہ اس کا اہتمام ہونا چاہیے۔ ملا علی قاری رَحِمَہُ اللّٰہُ نے "انوار الحجج" میں لکھا ہے کہ ایک نیک آدمی نے خواب دیکھا کہ حج کے اعمال اللہ کے دربار میں پیش کیے جا رہے ہیں اور عرض کیا گیا کہ یہ فلاں کے اعمال ہیں، تو اللہ نے فرمایا کہ اس کو حاجی لکھو، پھر کسی کا عمل پیش کیا گیا تو فرمایا کہ اس کو تاجر لکھو، یہاں تک کہ معاملہ خود ان خواب دیکھنے والے شخص تک پہنچا کہ ان کے اعمال پیش کیے گئے تو فرمایا کہ اس کو تاجر لکھو، یہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ کیوں؟ میں تو تاجر نہیں ہوں، تو فرمایا کہ کیوں نہیں، تم کتب غزل لے جا کر اہل مکہ کو بیچنا چاہا تھا۔(۲)

لہٰذا ہمارا مقصود اس سفر سے صرف اللہ کی خوشنودی ہونا چاہیے کوئی اور دنیوی غرض کا دور دور تک ہمارے دلوں کی جانب سے گزر بھی نہ ہونا چاہیے۔

اس سلسلے میں یہ بات بھی نا قابل فراموش ہے کہ جس طرح اخلاص کے بغیر نیکی و طاعت بے کار ہے، اسی طرح یہ بھی ذہن نشین کر لیں کہ اتباع سنت کے بغیر

---

(۱) جمع الجوامع للسیوطی: ۱/۲۵۶۹۴، کنز العمال: ۵/۲۳۰، حدیث: ۱۲۳۶۳

(۲) انوار الحجج: ۳۲

بھی کوئی عبادت و نیکی اللہ کے یہاں کسی قابل شمار نہیں ہوتی ،اس لیے عمرے کے تمام ارکان واعمال نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے اور سکھائے ہوئے طریقہ پر انجام دینے کی فکر بھی بہت ضروری ہے؛ لہٰذا عمرہ پر جانے سے پہلے اپنی تیاری کا ایک اہم باب یہ ہے کہ عمرے کے احکام و مسائل، اس کے سنن و آداب کا مطالعہ کا یا کسی عالم سے سیکھنے کا اہتمام کریں ۔ بہت سے لوگ اس کے بغیر حج یا عمرے کے لیے آتے ہیں اور من مانے طریقہ سے اعمال و مناسک ادا کرتے ہیں، جس سے بسا اوقات عبادت ہی ضائع ہو جاتی ہے یا کم از کم سنت کے مطابق نہ ہونے کی وجہ سے نا مقبول ہو جاتی ہے؛ اس لیے اپنے ساتھ کوئی معتبر کتاب بھی لیتے جائیں جیسے ''معلم الحجاج'' وغیرہ۔

عمرہ کا سفر اور میقات

اے محترم بھائی! جب عمرہ کا سفر کرو تو اس کو عام سفر کی طرح نہیں ؛ بل کہ ایک مقدس سفر سمجھ کر کرو اور اس میں ذکر اذکار اور مسنون دعاؤں کا اہتمام کرو؛ اس کے لیے مسنون دعاؤں کی کوئی معتبر کتاب جیسے ''حصن المسلم'' یا ''مسنون دعائیں'' اپنے ساتھ رکھ لو اور موقعہ موقعہ سے پڑھتے رہو۔ یاد رہے کہ عورت کو سفر میں اپنے ساتھ محرم کو لیجانا ضروری ہے، بغیر محرم کے عورت کا سفر کرنا نا جائز ہے۔

یاد رہے کہ حج یا عمرہ کرنے والے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ وہ میقات پر احرام باندھ لے، کوئی بھی شخص مکہ جانا چاہتا ہو تو اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ میقات پر احرام باندھ لے ، بغیر احرام کے میقات پار کرے گا تو اولاً اس کو چاہیے کہ میقات واپس آ کر احرام باندھ کر جائے اور اگر واپس نہیں آیا تو اس پر ایک دم یعنی قربانی واجب ہو جائے گی۔ (۱)

---

(۱) اس کے تفصیلی مسائل کے لئے ''معلم الحجاج'' کا مطالعہ کرو

میقات وہ مقامات ہیں جن کو حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے مختلف علاقوں سے حرم مکہ کو آنے والوں کے لیے مقرر کر دیا ہے کہ جو بھی شخص مکہ مکرمہ جانے کے لیے یہاں سے گزرے خواہ وہ حج یا عمرے کے لیے مکہ جائے یا کسی اور مقصد کے لیے تو اس پر واجب ہے کہ احرام باندھے۔ یہ میقات الگ الگ علاقوں کے لیے الگ الگ ہیں اور ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش وغیرہ کے لیے میقات ''یلملم'' ہے جس کو آج کل ''سعدیہ'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اور یہ میقات مکۃ المکرّمہ سے ایک سو بیس کلو میٹر پر واقع ہے۔ لہٰذا جو لوگ ہندوستان، پاکستان وغیرہ سے جاتے ہیں ان کو ''یلملم'' سے یا اس سے پہلے احرام باندھ لینا چاہیے۔ اور سہولت کی خاطر اپنے گھر ہی سے احرام باندھ لے یا احرام کی چادریں پہن لے اور یلملم پر نیت کر لے تو بھی درست ہے۔

احرام کیسا ہو؟

محترم زائرِ حرم! احرام کے لیے کپڑے کیسے ہوں اور کیا ہوں؟ اس بارے میں مختصر وضاحت سن لیں کہ مرد کے لیے سفید دو چادریں ہوں، ایک بدن کے اوپر والے حصے پر اوڑھنے کے لیے اور ایک بطور لنگی کے استعمال کرنے کے لیے، سفید ہونا بہتر ہے، واجب نہیں اور احرام میں سلا ہوا کپڑا استعمال نہیں کیا جا سکتا؛ لہٰذا کرتہ، پاجامہ، صدری بنیان وغیرہ ممنوع ہوں گے، ہاں چادر یا لنگی درمیان سے سلی ہوئی ہو تو جائز ہے؛ لیکن بہتر نہیں۔ اور عورت کے لیے اس کا معمولی عام لباس ہی احرام ہے، جو سارے بدن کو اچھی طرح ڈھانک لے۔

یہاں ایک بات نوٹ کر لیجیے کہ احرام ان کپڑوں کا نام نہیں؛ بل کہ یہ تو احرام کے کپڑے ہیں اور احرام نام ہے حج یا عمرے کی نیت کر کے تلبیہ پڑھنے کا، جس سے

بعض جائز ومباح چیزیں اس پر حرام ہو جاتی ہیں، لہٰذا احرام اس نیت کے ساتھ تلبیہ پڑھنے کا نام ہے۔ مجازاً ان چادروں کو بھی احرام کہہ دیا کرتے ہیں، اور احرام حج یا عمرے کے لئے ایسا ہے جیسے نماز کے لئے تکبیر تحریمہ، جس کی وجہ سے نماز کے دوران آدمی پر کھانا پینا وغیرہ باتیں حرام ہو جاتی ہیں۔

احرام کیسے باندھیں؟

جب آپ احرام باندھنا چاہیں تو پہلے ناخن تراش دیں، جسم کے زائد بال (موئے بغل وزیر ناف) مونڈ دیں، سر کے بال یا تو منڈوا دیں یا کنگھی سے درست کرلیں، پھر یہ بھی مسنون ہے کہ احرام کی نیت سے غسل کریں، اگر غسل نہ کرو تو مضائقہ نہیں، پھر احرام کی چادریں پہن لیں، اور جسم اور احرام کی چادروں کو ایسی خوشبو لگاؤ جس کا جسم کپڑوں پر نہ لگے، بلکہ صرف خوشبو لگے۔ تصویر دیکھئے:

پھر دو رکعت نفل نماز احرام کی نیت سے پڑھو، پہلی رکعت میں ﴿قُلْ يَآاَيُّهَا الْكَافِرُوْنَ﴾ اور دوسری میں ﴿قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ﴾ پڑھو، پھر سلام کے بعد مرد سر سے ٹوپی یا کپڑا اتار دے اور عورت سر کو حسب معمول ڈھانک کر رکھے، ہاں وہ

اپنے چہرے کو احرام میں نہیں ڈھانک سکتی؛ لہٰذا چہرہ پر کوئی کپڑا نہ ڈالے، پھر عمرے کی نیت کریں، نیت اصل تو دل سے ہوتی ہے؛ لہٰذا دل سے نیت کریں اور زبان سے بھی یہ الفاظ کہہ لیں:

"أَللّٰهُمَّ إِنِّىْ أُرِيْدُ الْعُمْرَةَ فَيَسِّرْهَا لِىْ وَ تَقَبَّلْ مِنِّىْ"

(اے اللہ! میں عمرہ کی نیت کرتا ہوں؛ لہٰذا تو اس کو میرے لیے آسان کردے اور قبول فرمالے۔)

اس کے بعد مرد حضرات ذرا بلند آواز سے تلبیہ پڑھیں اور عورت آہستہ آواز سے اور تلبیہ یہ ہے:

"لَبَّيْکَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْکَ، لَبَّيْکَ لَا شَرِيْکَ لَکَ، لَبَّيْکَ، إِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَکَ وَالْمُلْکَ، لَا شَرِيْکَ لَکَ."

(حاضر ہوں اے اللہ! حاضر ہوں، حاضر ہوں، آپ کا کوئی شریک نہیں، بلا شبہ سب تعریفیں آپ ہی کو سزاوار ہیں اور سب نعمتیں آپ ہی کی ہیں اور ملک بھی آپ ہی کا ہے، آپ کا کوئی شریک نہیں۔)

پھر نبی کریم صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم پر درود بھیجے:

"اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّعَلٰى آلِهٖ وَأَصْحَابِهٖ أَجْمَعِيْنَ."

پھر جو چاہے دعاء کرے اور یہ دعا مسنون ہے:

"اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْئَلُکَ رِضَاکَ وَالْجَنَّةَ وَأَعُوْذُ بِکَ مِنْ غَضَبِکَ وَالنَّارِ." (۱)

---

(۱) سنن صغری بیهقي: ۴۶۱/۱، اعانة الطالبين: ۳۵۱/۲

اے زائرِ حرم بھائی، بہن! جب تلبیہ پڑھو تو ذرا یہ بھی خیال کرو کہ میں اللہ کے حضور یہ کہہ رہا ہوں کہ میں حاضر ہوں؛ اس لیے مجھے اپنے پورے دل کے ساتھ، پورے اخلاص کے ساتھ اور پوری دلجمعی و جذبے کے ساتھ کہنا چاہیے، ورنہ کہیں ہمارے اس ''لبیک'' پر ''لا لبیک'' نہ کہہ دیا جائے۔ حضرت سفیان بن عیینہ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حضرت زین العابدین علی بن الحسین رحمہ اللہ نے حج کے ارادہ سے احرام باندھا اور سواری پر سوار ہوئے تو آپ کا رنگ فق ہوگیا، سانس پھولنے لگی اور بدن پر کپکپی طاری ہوگئی اور لبیک نہیں کہی جاسکی۔ ان سے پوچھا گیا کہ آپ کیوں لبیک نہیں کہتے؟ تو کہا کہ مجھے اس بات کا اندیشہ ہے کہ کہیں '' **لا لبیک و لا سعدیک**'' نہ کہہ دیا جائے، پھر جب لبیک کہا تو بے ہوش ہو گئے، اور سواری سے گر پڑے، اور حج پورا ہونے تک یہ بات برابر پیش آتی رہی۔ (۱)

ایک اور اللہ والے کے احرام اور تلبیہ کی کیفیت سنو، حضرت عبد اللہ بن الجلاء رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ حج کے ارادے سے میں ذو الحلیفہ (مدینہ کی جانب سے میقات) میں تھا، لوگ احرام باندھ رہے تھے، میں نے ایک نوجوان کو دیکھا کہ اس نے اپنے اوپر احرام کے لیے غسل کرنے پانی ڈالا پھر کہنے لگا کہ اے میرے رب! میں ''**لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْکَ**'' کہنا چاہتا ہوں؛ لیکن ڈرتا ہوں کہ کہیں آپ مجھ کو ''**لَا لَبَّیْکَ وَلَا سَعْدَیْکَ**'' سے جواب نہ دے دیں۔ وہ برابر یہ کہتا جا رہا تھا اور میں سن رہا تھا، جب اس نے حد کر دی تو میں نے اس سے کہا کہ احرام تو ضروری ہے، کہنے لگا کہ اے شیخ! ڈر ہے کہ میں '' **لَبَّیْکَ** '' کہوں اور مجھے اللہ جواب میں ''**لَا لَبَّیْکَ**''

---

(۱) تاریخ ابن عساکر: ۴۱/۳۷۸، تاریخ الاسلام للذهبی: ۲/۲۶۷، تهذیب التهذیب: ۷/۲۶۹، تهذیب الکمال: ۲۰/۳۹۰

نہ فرمادیں۔حضرت ابن الجلاء رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے کہا کہ اللہ سے اچھا گمان رکھنا چاہیے۔لہٰذا میرے ساتھ تم بھی "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْک " کہو۔ پس اس نے "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ" کہا اور اس کو کھینچ کر کہا اور اسی کے ساتھ اس کی روح نکل گئی۔(۱)

الغرض اللہ تعالیٰ کی عظمت وجلالت اور اپنی بے مائیگی و بے چارگی عاجزی و غلامی کا تصور کرتے ہوئے "لَبَّیْک" کہیں۔اب آپ کا احرام شروع ہوگیا اور آپ پر احرام کی پابندیاں عائد ہوگئیں،لہٰذا آپ کو اب پوری احتیاط سے کام لینا چاہئے تاکہ کوئی کام احرام کے خلاف نہ ہوجائے۔

احرام کا فلسفہ

اے محترم زائرِ حرم! آپ نے احرام پہن لیا ہے، ذرا یہ بھی غور کیا کہ یہ احرام کا لباس اور یہ انداز کیا اور کیوں ہے؟ اس میں ایک پہلو یہ ہے کہ یہ عاشقانہ لباس ہے، جس میں اس کا کوئی التزام واہتمام نہیں کہ یہ سلا ہوا ہو، بنا ہوا ہو، اپنے جسم پر فٹ ہو، عمدہ طریقہ کا ہو، اسی طرح اس کی بھی کوئی فکر نہیں کرتا کہ بالوں کو سنوارے، ناخن بنائے؛ بل کہ ایک عاشق جب اپنے محبوب کی یاد میں مضطرو بے تاب ہو اور اس کی جانب والہانہ چلا جارہا ہو تو جس طرح وہ اپنے جسم وکپڑوں کی کوئی فکر نہیں کرتا، اسی طرح عمرے وحج کو جانے والا اللہ کا عاشق، اللہ کی محبت میں چور اور اس کے عشق میں سرشار بندہ بھی اس لباس میں یہ بتاتا ہوا اللہ کے دربار میں پہنچتا ہے کہ میں اللہ کا سچا عاشق ہوں، مجھے دنیا کی کوئی فکر نہیں، میرے لباس وپوشاک کی کوئی فکر نہیں، میرے بالوں اور ناخنوں کی کوئی فکر نہیں ہے؛ بل کہ میری پوری توجہات کا مرکز اللہ کی محبوب

(۱) تاریخ ابن عساکر: ۴۳۶/۵۲،تاریخ بغداد: ۲۶۶/۵

ذات اور اس کا گھر ہے۔ لہذا اس پہلو کے پیش نظر احرام والے کو چاہئے کہ وہ احرام پہن کر واقعتہً اللہ کا عاشق و محبّ ہونے کا ثبوت دے۔

اس میں دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ لباس و انداز فقیرانہ لباس و انداز ہے، اللہ کے گھر جانے والوں کے لیے اس لباس و انداز کو مشروع کر کے اللہ کی جانب سے یہ درس دیا جا رہا ہے کہ تم سب اللہ کے فقیر ہو، خواہ تم اپنی جگہ کچھ بھی ہو، بادشاہ ہو، رئیس ہو، وزیر ہو، امیر کبیر؛ لیکن میرے دربار میں سب فقیر ہی فقیر ہیں، گویا احرام پہن کر اللہ کے گھر جانے والا یہ ثابت کرتا ہے کہ میں واقعی اللہ کا فقیر ہوں، وہ غنی و داتا ہے میں محتاج و بے نوا ہو، اس کے دربار میں فقیرانہ حاضری دے رہا ہو؛ لہٰذا احرام والے کو اپنے دل و دماغ سے سارا تکبر، عجب و پندار نکال کر عاجزانہ وفقیرانہ اللہ کے دربار میں جانا چاہیے۔

اس میں ایک تیسرا پہلو بھی ہے جو قابل غور ہے کہ یہ احرام کی چادریں اور احرام کی پابندیاں، یہ انداز و طریقہ دراصل انسان کو اپنی موت اور موت کے بعد کے احوال کی یاددہانی کرتے ہیں کہ جس طرح موت کے وقت اللہ کے دربار میں حاضری کے موقعے پر انسان کو کفن میں لپیٹ دیا جاتا ہے اور وہ اس وقت اپنی خواہشات و لذات کو پورا کرنے پر قادر نہیں ہوتا، اسی طرح آج وہ اللہ کے دربار میں مردے کی چادریں لپیٹ کر حاضر ہو رہا ہے اور اپنی خواہشات جیسے بیوی سے ملنی کی، اپنے آپ کو سنوارنے اور بنانے کی، عطر و خوشبو سے معطر ہونے کی، میل کچیل دور کرنے کی اور من پسند لباس و پوشاک پہنے کی کوئی خواہش پوری نہیں کر سکتا، پھر اللہ کے حضور حساب و کتاب کے لیے اس کے دربار عالی میں پیش کیا جا رہا ہے، جہاں دنیا بھر کے انسان جمع ہیں، گویا کہ ایک میدان حشر برپا ہے۔ لہٰذا زائر حرم کو اس پہلو پر بھی توجہ دیتے ہوئے اپنے آپ کو اللہ کے دربار میں پیش کیے جانے کے قابل بنانا چاہیے۔

احرام کے ممنوعات

احرام کی حالت میں بعض کام منع ہیں اوران کے ارتکاب سے بعض صورتوں میں دم اور بعض میں صدقہ واجب ہوتا ہے۔ان کی پوری تفصیل کتب فقہ میں درج ہے۔یہاں صرف چند اہم وزیادہ پیش آنے والے امور ذکر کرتا ہوں:

مرد کے لیے سلے ہوئے کپڑے پہننا حرام ہے،البتہ لنگی بیچ سے سلی ہوتو جائز ہےاور تہبند،لنگی کوکسی پیٹی (بلٹ) سے باندھنا جائز ہے۔

اسی طرح دستانے اورموزے پہننا بھی مرد کے لیے ناجائز ہے،ہاں عورت کے لیے سلے ہوئے کپڑے پہننا بھی جائز ہےاورموزے ودستانے پہننا بھی جائز ہے۔

مرد کے لیے ایسا جوتا پہننا بھی احرام میں ناجائز ہے جس سے پیر کی بیچ والی ہڈی چھپ جائے؛ لہٰذا بہتر ہے کہ ہوائی چپل کا استعمال کیا جائے ،ہاں عورت کے لیے اس طرح کا جوتہ جائز ہے۔

احرام میں بدن کے کسی بھی حصے کے بالوں کودور کرنا حرام ہے،اسی طرح ہاتھ پیر کے ناخنوں کاتراشنا بھی حرام ہے۔

عطر یا کسی بھی قسم کی کوئی خوشبولگانا احرام میں ناجائز ہے،اسی طرح سر یا ڈاڑھی میں مہندی لگانا بھی ناجائز ہے۔لہٰذا خوشبوتیل ،دارمنجن ، پیسٹ ،صابون وغیرہ سے پرہیز کرنا چاہیے۔

احرام کی حالت میں کھانے یا پینے کی چیز میں کوئی خوشبودار چیز بغیر پکائے ڈال کراستعمال کرنا منع ہے۔ہاں کھانے کی چیز میں خوشبودار چیز کوپکادیا جائے تو اس کا استعمال احرام کی حالت میں جائز ہے؛ مگر پینے کی چیز میں خوشبودار چیز خواہ پکائی جائے یا نہ پکائی جائے ہر صورت میں منع ہے۔

حالتِ احرام میں بیوی سے مجامعت اور بوس و کنار ہونا بھی حرام ہے، اسی طرح شہوت سے دیکھنا یا محبت کی باتیں کرنا بھی حرام ہے۔

احرام میں خشکی کے جانوروں کا شکار کرنا یا ان کو بھگانا یا کسی کو ان کے شکار کرنے پر مدد دینا حرام ہے اور حدودِ حرم میں ان جانوروں کا شکار سب پر حرام ہے خواہ احرام میں ہوں یا نہ ہوں۔

احرام والے مرد پر حرام ہے کہ کپڑے یا کسی اور چیز سے اپنا سر یا چہرہ ڈھانپے، اور عورت پر حرام ہے کہ وہ چہرہ ڈھانپے، عورت کا احرام صرف اس کے چہرے میں ہے، سر میں نہیں؛ لہٰذا وہ سر کو ڈھانپ کر رکھے گی۔ لیکن نامحرم مردوں کا سامنا ہو تو چہرہ کے سامنے کوئی چیز آڑ کر لے تاکہ بے پردگی نہ ہو؛ مگر چہرے سے کپڑا وغیرہ مس نہ کرے۔ ہاں اگر اوپر سے سایہ کے طور پر کوئی چیز جیسے چھتری وغیرہ استعمال کرے تو مرد کے لیے بھی جائز ہے۔

احرام میں کپڑے سے سر اور چہرہ پونچھنا جائز نہیں، ہاں عورت کو سر کپڑے سے پونچھنا جائز ہے اور عورت کو چہرے کے علاوہ اور مرد کو سر و چہرے کے علاوہ باقی بدن کپڑے سے پونچھنا جائز ہے اور ہاتھ سے سر و چہرہ پونچھنا بھی جائز ہے۔

اہم تنبیہ: عام طور پر حج و عمرے کے موقعہ پر عورتیں احرام میں بھی اور احرام کے علاوہ بھی بے پردہ ہو جاتی ہیں اور وہاں اپنا چہرہ غیر مردوں کے سامنے کھول کر سامنے آجاتی ہیں۔ یاد رہے کہ یہ ناجائز ہے۔ احرام میں عورت کو اپنا چہرہ نہ ڈھانپنے کا مطلب یہ نہیں کہ غیر مردوں کے سامنے بے پردہ ہو جائے؛ بل کہ اس کو اس موقعے پر مردوں کے سامنے آنا ہی نہیں چاہیے تاکہ احرام بھی باقی رہے اور پردہ بھی قائم رہے، اور اگر باہر نکلنے کی ضرورت پڑے تو چہرے کو لگائے بغیر کوئی چیز آڑ کر

لے تاکہ پردہ باقی رہے۔

احرام کے مکروہات

احرام کی حالت میں بعض امور وہ ہیں جو مکروہ ہیں، ان کے ارتکاب سے دم یا صدقہ تو واجب نہیں ہوتے، البتہ ان کی وجہ سے عمرہ میں نقص پیدا ہوجاتا ہے۔ ان میں سے چند امور یہ ہیں:

بدن سے میل دور کرنا، سر یا ڈاڑھی یا بدن کو صابون وغیرہ سے دھونا۔

سر یا ڈاڑھی میں کنگھی کرنا، یا اس طرح کھجانا کہ بال گرنے کا خوف ہو۔

احرام کی چادر یا تہبند میں گرہ لگانا، یا گرہ لگا کر گردن میں باندھنا، یا ان میں سوئی یا پن لگانا۔

خوشبو سونگھنا یا چھونا، یا خوشبودار میوہ سونگھنا، ہاں بلا ارادہ خوشبو آئے تو حرج نہیں۔

تکیہ پر منہ کے بل لیٹنا، ہاں سر یا رخسار کا تکیہ پر رکھنا جائز ہے۔

مکۃ المکرّمۃ میں

اس سفر کے دوران "لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْک الخ" کا ورد جاری رہے، مرد زور سے اور عورتیں آہستہ سے، اور یہ اٹھتے، بیٹھتے، کھاتے پیتے، چلتے پھرتے، چڑھتے اترتے، غرض ہر حالت میں کہتے رہنا چاہیے۔ اور سفر طے کرتے ہوئے جب مکۃ المکرّمۃ کی پاکیزہ سرزمین پر اتریں تو سامان وغیرہ کا بندوبست کریں۔ اور دھیان رہے کہ آپ اس وقت اس شہر میں ہیں جہاں کبھی کوئی فرد بشر دور دور تک دکھائی نہیں دیتا تھا اور اس وقت حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے اپنی زوجۂ محترمہ حضرت ھاجرہ اور لختِ جگر حضرت اسماعیل علیہما السلام کو اسی وادیٔ

غیر ذی زرع میں لا کر چھوڑ دیا تھا، اور کھانے کے لیے چند چیزیں اور پینے کے لیے پانی کا ایک مشکیزہ ان کے حوالہ کر دیا تھا اور واپس ہوتے ہوتے اللہ کی جناب میں یہ دعاء کی تھی:

﴿وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ. رَبِّ اِنَّهُنَّ اَضْلَلْنَ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ فَمَنْ تَبِعَنِيْ فَاِنَّهٗ مِنِّيْ وَمَنْ عَصَانِيْ فَاِنَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ﴾ (ابراهيم: ۳۵-۳۷)

(اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن والا بنا دے اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچالے، ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا ہے، پس جو میری اتباع کرے تو وہ میرا ہے اور جو میری نافرمانی کرے تو تو بلا شبہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، اے ہمارے پروردگار! میں نے میری ذریت کو ایک بے آب وگیاہ وادی میں تیرے محترم گھر کے پاس بسایا ہے، پروردگاررا! تا کہ وہ نماز قائم کریں، پس لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف مائل کر، اور ان کو میوے عطاء کرتا کہ وہ شکر کریں۔)

اللہ عزوجل نے اپنے نبی کی یہ دعاء قبول فرمائی اور اس کو امن والا شہر بنا کر

ساری دنیا کے مسلمانوں کا دل اس جانب مائل فرما دیا اور ہر قسم کی نعمتوں سے اس شہر کو مالا مال کر دیا۔

یہاں پہنچ کر غسل کر لیں، کیوں کہ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا معمول تھا کہ وہ جب مکہ آتے تو مقام ذی طوی میں رات گزارتے اور صبح کو غسل کرتے پھر دن کے وقت مکہ میں داخل ہوتے اور اس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے بیان کرتے۔(۱)

کعبۂ مقدسہ پر

پھر کعبے کی طرف ''تلبیہ'' پڑھتے ہوئے آئیں اور نہایت خشوع وخضوع سے اور اللہ کے جلال وعظمت کا تصور کرتے ہوئے آئیں، یہی اسلاف کرام وصالحین کا طریقہ تھا۔ ایک خاتون کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ مکۃ المکرّمۃ حاضر ہوئیں اور معلوم کیا کہ میرے رب کا گھر کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ ابھی تو دیکھ لے گی۔ پس جب اللہ کا گھر نظر آنے لگا تو اس کو بتایا گیا کہ یہ ہے بیت اللہ، پس وہ شوق سے دوڑ کر گئی اور کعبے کی دیوار سے لپٹ گئی اور جب اس کو اٹھایا گیا تو وہ مردہ پائی گئی۔ (۲)

اور حضرت شبلی رحمہ اللہ کا واقعہ ہے کہ جب انھوں نے کعبے کو دیکھا تو ان پر شدت شوق کی وجہ سے بے ہوشی طاری ہوگئی۔ الغرض بے حد شوق ومحبت کے ساتھ اور اللہ کی عظمت وجلالت کے تصور کے ساتھ کعبے کی جانب آئیں۔

اور مسجد حرام میں دایاں پیر اولاً پھر بایاں پیر رکھیں، مسجد میں داخل ہونے کی دعاء پڑھیں:

---

(۱) مسلم: ۳۲۰۴، ابو داؤد: ۱۸۶۷

(۲) صفة الصفوة: ۴/۴۱۶، المدهش لابن الجوزی: ۱۴۸

"بِسْمِ اللّٰهِ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ ،أَللّٰهُمَّ افْتَحْ لِيْ أَبْوَابَ رَحْمَتِكَ."

پھر جب اللہ کے مقدس گھر کعبہ پر نظر پڑے ہاتھ اٹھا کر "اللّٰه اكبر" کہیں پھر یہ دعاء پڑھیں:

"اللّٰهُمَّ زِدْ هٰذَا الْبَيْتَ تَعْظِيْماً وَّ تَشْرِيْفاً وَّ تَكْرِيْماً وَّ مَهَابَةً وَّ زِدْ مَنْ شَرَّفَهُ وَكَرَّمَهُ مِمَّنْ حَجَّهُ وَاعْتَمَرَهُ تَشْرِيْفاً وَّ تَكْرِيْماً وَّ تَعْظِيْماً وَّ بِرّاً، اللّٰهُمَّ أَنْتَ السَّلَامُ وَ مِنْكَ السَّلَامُ ، فَحَيِّنَا رَبَّنَا بِالسَّلَامِ."

(اے اللہ! اس گھر کی عظمت وشرافت وکرامت وبڑائی کو بڑھا دیجئے اور جولوگ حج وعمرے کرکے اس گھر کی عزت واکرام کرتے ہیں ان کی بھی شرافت وکرامت وعظمت وبھلائی بڑھا دیجئے، اے اللہ! آپ سلام ہیں اور سلامتی آپ ہی کی جانب سے ہے، پس اے ہمارے رب! ہمیں سلامتی کے ساتھ زندہ رکھ۔)(۱)

اس کے بعد دعا کریں، یہ قبولیت کا مقام ہے، علامہ نووی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ کعبے کو دیکھنے کے وقت مسلمان کی دعاء کا قبول ہونا وارد ہوا ہے۔ اورالجوہرۃ النیرۃ میں ہے کہ کعبہ کو دیکھنے کے وقت کی دعاء مقبول ہے۔(۲)

لہٰذا اپنے لیے، اپنے متعلقین کے لیے اور تمام اہل اسلام کے لیے خوب خشوع

---

(۱) مصنف ابن ابی شیبة: ۹۷/۴، مسند شافعي: ۱۲۶، السنن الکبری بیهقي: ۷۳/۵، میں ہے کہ اللہ کے نبی اجب کعبے میں داخل ہوتے تو یہ دعاء پڑھتے تھے۔ لیکن یہ حدیث منقطع وضعیف ہے

(۲) الاذکار: ۱۹۴، الجوهرة النیرة: ۲۲۲/۱

وخضوع سے دعائیں کریں۔سلف صالحین نے اس وقت دعاء کا اہتمام کیا ہے اور جامع دعاء کا انتخاب کیا ہے۔امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ سے کسی نے پوچھا کہ کعبہ پرنظر کے وقت کیا دعاء کروں؟ آپ نے فرمایا کہ یہ دعاء کرلینا کہ اے اللہ!اب جوبھی دعا کروں وہ قبول فرمالیجئے۔لہٰذا دعائیں کرنے کے بعد اب آگے بڑھتے ہوئے کعبے کے پاس طواف کے لیے آئیں۔

بیت اللہ ومسجد حرام کی فضیلت

یاد رہے کہ اب آپ ایک ایسی جگہ ہیں جس سے بڑھکر کوئی مقام نہیں ،محمد بن سوقۃ رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ کے ساتھ کعبے کے سایے میں بیٹھے تھے،حضرت سعید رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«أَنْتُمُ الْآنَ فِيْ أَكْرَمِ ظِلٍّ عَلٰى وَجْهِ الْاَرْضِ.»

(آج تم لوگ زمین کے سب سے زیادہ قابل اکرام سایے میں ہو۔)(۱)

اللہ نے آپ کی دیرینہ تمنا پوری کی اور یہاں پہنچا دیا لہٰذا شکر کیجئے۔یہ وہ اللہ کا گھر ہے جس کو اللہ تعالی نے آسمان وزمین کی پیدائش سے بھی پہلے فرشتوں کے ہاتھوں بنایا ،پھر حضرت آدم علیہ السلام نے اس کو تعمیر کیا اور وہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں طوفان کی نظر ہوگیا ،پھر آج سے تقریباً دس ہزار سال سے بھی زائد عرصہ ہوا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام نے اپنے لخت جگر حضرت اسماعیل ذبیح اللہ علیہ السلام کو ساتھ لے کر تعمیر کیا تھا۔(۲)

(۱) اخبار مکہ ازرقی:۲/۱۹۰

(۲) تفصیل کے لئے دیکھو اخبار مکۃ ازرقی

اور یہ روئے زمین پر پہلا گھر ہے جو عبادت کے لئے بنایا گیا، جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ مُبٰرَکًا وَّهُدًی لِّلْعٰلَمِیْنَ فِیْهِ اٰیٰتٌ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ وَمَنْ دَخَلَهٗ کَانَ اٰمِنًا﴾

(آل عمران: ۹۶)

(بلاشبہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہ وہ ہے جو مکہ شہر میں ہے، برکتوں والا اور تمام عالموں کے لیے ہدایت دینے والا، اس میں کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ان میں سے ایک مقام ابراہیم ہے۔)

اور اس گھر کے اطراف جو مسجد ہے اس کو مسجد حرام کہتے ہیں، حرام کے معنے ''محترم'' کے ہیں، یہ مسجد بہت ہی قابل احترام ہے اس لیے اس کو مسجد حرام کہتے ہیں، اس مسجد کا ذکر قرآن میں آیا ہے:

﴿سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِهٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَی الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَهٗ لِنُرِیَهٗ مِنْ اٰیٰتِنَا، اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾

(پاک ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے کو راتوں رات مسجد حرام سے اس مسجد اقصیٰ تک سیر کرائی جس کے اطراف و اکناف ہم نے برکتیں رکھی ہیں تا کہ ہم ان کو ہماری نشانیاں دکھائیں۔)

بیت اللہ و مسجد حرام میں نماز پڑھنے کا بہت بڑا ثواب ہے، حدیث میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

« صَلَاةٌ فِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ أَفْضَلُ مِنْ مِائَةِ أَلْفِ

صَلاةٍ فِيمَا سِوَاهُ.»

(مسجد حرام میں ایک نماز دوسری مسجدوں میں ایک لاکھ نمازوں سے افضل ہے۔)(۱)

اور کعبے کو دیکھنا بھی عبادت ہے، ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« يَنزِلُ اللّٰهُ عَلٰى أَهْلِ الْمَسْجِدِ مَسْجِدِ مَكَّةَ كُلَّ يَوْمٍ عِشْرِيْنَ وَمِائَةَ رَحْمَةٍ سِتِّيْنَ مِنْهَا لِلطَّائِفِيْنَ، وَأَرْبَعِيْنَ لِلْمُصَلِّيْن ، وَعِشْرِيْنَ مِنْهَا لِلنَّاظِرِيْنَ.»

(اللہ تعالیٰ ہر روز مکہ کی مسجد یعنی کعبے پر ایک سو بیس رحمتیں نازل فرماتے ہیں، جن میں سے ساٹھ طواف کرنے والوں کو، چالیس نماز پڑھنے والوں کو اور بیس کعبے کو دیکھنے والوں کو دی جاتی ہیں۔)(۲)

ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

« اَلنَّظَرُ إِلَى الْكَعْبَةِ مَحْضُ الْإِيْمَانِ.»

(کعبے کو دیکھنا خالص ایمان ہے۔)

اور حضرت مجاہد رحمہ اللہ نے کہا:

"اَلنَّظَرُ إِلَى الْكَعْبَةِ عِبَادَةٌ، وَدُخُوْلٌ فِيْهَا دُخُوْلٌ فِيْ حَسَنَةٍ وَخُرُوْجٌ مِنْهَا خُرُوْجٌ مِنْ سَيِّئَةٍ."

(۱) مسند الحميدى: ۲/۱۵۴، السنن الكبرى للبيهقى: المطالب العالية: ۱/۴۵۹، مشكل الآثار طحاوى: ۲/۷۸

(۲) معجم اوسط طبرانى: ۲/۲۴۸، سنن كبرى بيهقى: الفتح الكبير للسيوطى: ۱/۳۳۸

(کعبے کو دیکھنا عبادت ہے اور اس میں داخل ہونا نیکی میں داخل ہونا اور اس سے نکلنا برائی سے نکلنا ہے۔)

اور ابن المسیب رحمہ اللہ نے کہا کہ جس نے کعبہ کو ایمان ویقین کے ساتھ دیکھا وہ اس طرح لوٹے گا جیسے آج ہی اس کی ماں نے جنا ہو۔ (۱)

الغرض ایک نہایت مبارک ومقدس مقام پر اللہ نے پہنچایا ہے، جس کی قدر کرتے ہوئے اور اللہ کا شکر کرتے ہوئے اس کے حقوق کو ادا کرنے کا اہتمام کرنا چاہئے۔

عمرے کے فرائض وواجبات

اب اس مقدس کام کا وقت ہے جس کے لئے آپ نے دعائیں کی تھیں، ہوسکتا ہے کہ اس کی آرزو اور شوق میں رات رات بھر سویا نہ ہو اور جس کے لیے یہ سفر آپ نے کیا، یعنی ''عمرہ''، لہٰذا جان لیں کہ عمرے میں دو باتیں فرض ہیں: ایک فرض احرام باندھنا کہ یہ شرط ہے اور اس کے بغیر عمرہ نہیں ہوسکتا اور احرام کے لیے نیت کرنا اور تلبیہ پڑھنا شرط ہے، دوسرا فرض طواف کرنا کہ یہ رکن ہے اور طواف کے لیے بھی نیت کرنا شرط ہے۔ اور عمرے میں دو ہی باتیں واجب ہیں: ایک صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا اور دوسرے بال منڈوانا یا کٹانا۔

طواف کی فضیلت

لہٰذا اب آپ طواف کے لیے تیار ہوجائیں اور ذہن میں رکھئے کہ طواف بہت بڑی عبادت ہے اور اس کی فضیلت میں حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

---

(۱) اخبار مکۃ للازرقی: ۲/۱۲۴-۱۲۷

«مَنْ طَافَ بِالْبَيْتِ وَ صَلّٰى رَكْعَتَيْنِ كَانَ كَعِتْقِ رَقَبَةٍ.»

(جس نے بیت اللہ کا طواف کیا اور دو رکعتیں پڑھیں تو وہ ایسا ہے جیسے ایک غلام آزاد کیا ہو۔)(۱)

اور طواف بھی در حقیقت نماز ہی ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

« الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ صَلَاةٌ إِلَّا أَنَّكُمْ تَتَكَلَّمُوْنَ فِيْهِ، فَمَنْ تَكَلَّمَ فِيْهِ فَلَا يَتَكَلَّمُ إِلَّا بِخَيْرٍ.»

(بیت اللہ کے گرد طواف نماز ہے؛ مگر یہ کہ تم اس میں بات چیت کر سکتے ہو؛ لہٰذا جو اس میں بات کرنا چاہے اس کو چاہئے کہ خیر کے سوا کوئی بات نہ کرے۔)(۲)

اس لیے نماز کے شرائط و آداب کی رعایت کے ساتھ طواف کریں اللہ کی عظمت و جلالت کا خیال ہو، وضو کے ساتھ ہوں، نگاہیں نیچی اور سامنے ہوں، ادھر ادھر نہ دیکھیں، دنیا کی باتیں نہ کریں۔

طواف کیسے کریں؟

طواف کے لیے سب سے پہلے حجر اسود کے پاس آئیں اور حجر اسود سے ذرا پہلے کھڑے ہو کر کعبہ کی جانب رخ کرلیں اور طواف کی نیت کریں، نیت کے بعد کعبہ ہی کی طرف رخ کر کے ذرا آگے بڑھیں اور حجر اسود پر آئیں اور کانوں تک ہاتھ اُٹھا کر تین مرتبہ "بِسْمِ اللّٰهِ، اَللّٰهُ أَكْبَر لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ،

(۱) ابن ماجه: ۲۹۵۶

(۲) ترمذي و نسائي، كذا في جامع الاصول: حديث: ۱۴۶۵

وَالصَّلاۃُ وَالسَّلامُ عَلٰی رَسُوْلِ اللّٰہِ'' کہیں اور یہ دعا پڑھیں: ''اَللّٰھُمَّ اِیْمَاناً بِکَ وَ تَصْدِیْقاً بِکِتَابِکَ وَ اتِّبَاعاً بِسُنَّۃِ نَبِیِّکَ '' (۱)

پھر ممکن ہو اور آسانی سے میسر ہو سکے تو حجر اسود کا بوسہ لیں اور اگر مجمع زیادہ ہو اور مجمع میں گھسنے سے دوسروں کو تکلیف ہونے کا امکان ہو تو دور ہی سے ''استلام'' کرے، یعنی ہاتھوں کو دور ہی سے اس طرح رکھے جیسے حجر اسود پر رکھے ہوں اور اپنے داہنے ہاتھ کو بغیر آواز کے بوسہ دیں۔اس کے بعد اپنی دائیں جانب پھر جائیں اور کعبہ کو اپنی بائیں جانب رکھتے ہوئے طواف شروع کریں اور اس طرح سات چکر لگائیں، ایک چکر حجر اسود سے شروع ہو کر حجر اسود پر پر ختم کریں اور جب رکن یمانی پر آئیں تو اس کو ایک یا دونوں ہاتھوں سے چھوئیں مگر بوسہ نہ دیں کہ یہ سنت نہیں ہے، اور جب حجر اسود پر آئیں تو پہلی دفعہ کی طرح ہاتھ اٹھائے بغیر کعبہ کی طرف چہرہ کریں اور ''بِسْمِ اللّٰہِ ،اَللّٰہُ أَکْبَرُ'' کہہ کر حجر اسود کا بوسہ لیں یا مجمع زیادہ ہو تو صرف دور ہی سے استلام کریں اور سات چکروں کے بعد جب آخری مرتبہ ختم طواف پر حجر اسود پر آئیں تو آٹھویں مرتبہ بھی اس کا ستلام کریں۔طواف کے لئے تصویر دیکھئے:

---

(۱) سنن کبری بیھقی: ۷۹/۵،معجم کبیر طبرانی: ۸۲۶
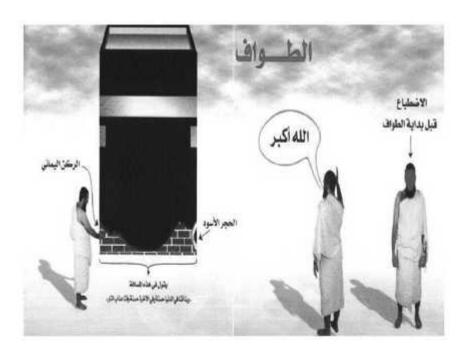
اور عمرے کا طواف کرنے والے مردوں کو طواف میں دو کام اور کرنے ہیں: ایک یہ کہ طواف کے تمام چکروں میں ''اضطباع'' بھی کرنا چاہئے، اور اضطباع یہ ہے کہ احرام کی اوپر والی چادر کو اپنے داہنے ہاتھ کے بغل کے نیچے سے نکال کر اس کا کنارہ بائیں مونڈھے پر ڈال لیں اور داہنا مونڈھا کھلا رکھیں۔ دیکھئے تصویر:

اور دوسرا کام یہ ہے کہ طواف کے اول تین چکروں میں ''رمل'' کرے اور رمل کا

مطلب یہ ہے کہ ذرا اکڑ کر اور اپنے شانوں کو پہلوانوں کی طرح ہلا کر تیزی کے ساتھ قدموں کو قریب قریب رکھ کر چلے۔

اور یاد رہے کہ یہ دونوں باتیں صرف مردوں کو سنت ہیں، عورتوں کے لیے سنت نہیں ہیں؛ لہٰذا عورتیں نہ اضطباع کریں اور نہ رمل کریں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ انھوں نے عورتوں کو رمل کرتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ "کیا تمہارے لیے ہم میں نمونہ نہیں ہے؟ تم پر سعی یعنی رمل نہیں ہے۔"(۱)

اسی طرح حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ انھوں نے کہا کہ: عورتوں پر بیت اللہ کے طواف میں رمل اور صفا و مروہ میں سعی نہیں ہے۔(۲)

طواف کے بعض مسائل

طواف میں یہ باتیں واجب ہیں: پاکی ہونا، یعنی بڑی پاکی غسل و چھوٹی پاکی یعنی وضو کا ہونا، شرمگاہ کا چھپا ہوا ہونا، چلنے کی طاقت ہو تو چل کر طواف کرنا، داہنی طرف سے طواف کرنا، حطیم کو شامل کر کے طواف کرنا۔

اور یہ باتیں سنت ہیں: حجر اسود کا استلام کرنا، عمرہ کے طواف میں مردوں کو میں اضطباع کرنا، عمرہ کے طواف میں مردوں کو پہلے تین چکروں مین رمل کرنا، حجر اسود پر کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھانا، حجر اسود سے طواف شروع کرنا، تمام چکروں کا پے در پے کرنا۔(۳)

---

(۱) سنن بیهقی مع الجوهر النقی: ۵/۴۸

(۲) مسند الشافعی: ۱۴۰، سنن بیهقی مع الجوهر النقی: ۵/۴۸

(۳) معلم الحجاج: ۱۲۸

طواف میں ان باتوں کا خیال رکھیں

طواف میں ان باتوں کا خیال رکھنا چاہئے:

طواف میں دعاء، استغفار اور ذکر کا اہتمام کریں اور جب رکن یمانی و حجر اسود کے درمیان میں ہوں تو "رَبَّنَا اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّ قِنَا عَذَابَ النَّارِ" پڑھیں۔(۱)

اور یاد رہے کہ اس کے علاوہ طواف کی کوئی خاص دعاء حدیث میں وارد نہیں ہے اور ہر ہر چکر کی بھی کوئی مخصوص دعا منقول نہیں ہے؛ لہٰذا جو بھی دل میں آئے اللہ سے مانگیں یا کوئی بھی قرآن یا حدیث کی دعا بلا تخصیص پڑھنا چاہیں تو پڑھ سکتے ہیں۔

طواف کے دوران نگاہیں اپنے سامنے اور نیچی ہوں، ادھر ادھر نہ دیکھیں اور کعبہ کی جانب بھی نہ دیکھیں، بعض لوگ کعبے کو دیکھ کر طواف کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے۔

طواف میں کعبہ کا رخ صرف اس وقت کرنا چاہئے جب حجر اسود پر پہنچیں، اس کے علاوہ کسی اور جگہ کعبے کی طرف رخ کرنے سے طواف فاسد ہو جاتا ہے، لہٰذا اس کا بہت خیال رکھیں۔

بعض لوگ اپنی لاعلمی و ناواقفیت کی وجہ سے طواف میں کعبہ کو جگہ جگہ سے لپٹ جاتے ہیں، کبھی رکن یمانی کے پاس، کبھی رکن عراقی کے پاس، یہ بھی صحیح نہیں؛ بل کہ اس سے طواف فاسد ہو جاتا ہے، رکن یمانی کو بغیر اس کی طرف رخ کئے صرف چھونے کا حکم ہے۔

طواف میں کسی کو تکلیف نہ پہنچائیں، مجمع زیادہ ہو تو اطمینان کے ساتھ چلیں، درمیان میں نہ گھسیں، اسی طرح حجر اسود کو بوسہ دینے کے لیے بھی کسی کو تکلیف نہ

---

(۱) ابو داؤد: ۱۸۹۲، مسند احمد: ۳/۴۱۱، مسند الشافعی: ۱۴۰

دیں، کہ کسی کو تکلیف دینا حرام ہے، خصوصاً بوڑھوں، ضعیفوں، بیماروں کو تکلیف دینا اور بھی برا ہے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ: اے عمر رضی اللہ عنہ! تو قوی آدمی ہے؛ لہٰذا کمزور کو حجر اسود کے پاس تکلیف نہ دینا، اگر خالی ہو تو بوسہ دینا ورنہ صرف استلام کر لینا۔ (۱)

عورتوں کو چاہیے کہ طواف میں پردے کا خیال رکھیں اور مردوں سے الگ کنارے کنارے سے طواف کریں، ان کو مردوں کے درمیان گھسنا جائز نہیں۔ حضرت ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کی ایک آزاد شدہ باندی نے ایک بار آ کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے بتایا کہ میں نے بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا اور دو یا تین مرتبہ میں نے حجر اسود کا بوسہ بھی لیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ اللہ تجھے ثواب نہ دے، اللہ تجھے ثواب نہ دے، کیا تو نے مردوں کا مقابلہ کیا ہے، کیوں نہ تو "اللہ اکبر" کہہ کر گزر گئی۔ (۲)

ملتزم و زمزم

طواف سے فارغ ہونے کے بعد مستحب ہے کہ ملتزم پر آئیں اور اس کو چمٹ کر گڑگڑاتے ہوئے اللہ سے دعائیں مانگیں، حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مقام پر پہنچ کر اسی طرح کیا تھا۔ (۳)

ملتزم کعبہ کا وہ حصہ ہے جو تقریباً ڈھائی گز کے برابر حجر اسود اور کعبے کے دروازے کے درمیان ہے، یہ مقام بھی دعاء کی قبولیت کا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

---

(۱) سنن البیہقی مع الجوہر النقی: ۵/۸۰

(۲) سنن بیہقی مع الجوہر النقی: ۵/۸۱

(۳) ابو داود: ۱/۲۶۱، ابن ماجہ: ۲/۲۱۲

کہ رکن یعنی کعبے کے دروازے اور مقام یعنی حجر اسود کے درمیان کا حصہ ملتزم ہے، کسی مصیبت زدہ بندے نے اس جگہ دعا نہیں کی مگر وہ تندرست ہوگیا۔ (۱)

حضرت عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا سینہ و چہرہ ملتزم سے چمٹا لیا تھا۔ اور ابن عباس رضی اللہ عنہ سے بھی روایت ہے کہ وہ ملتزم سے چمٹ جاتے تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ جس نے بھی یہاں چمٹ کر اللہ سے کچھ سوال کیا اللہ نے اس کو ضرور عطا کیا ہے۔ (۲)

لہٰذا یہاں خوب دل لگا کر دعا کریں؛ مگر یاد رہے کہ کسی کو تکلیف نہ دیں اور مجمع زیادہ ہو تو انتظار کریں یا جس قدر آسانی سے ہو سکے اس پر اکتفاء کریں۔

زمزم کے پاس آئیں اور خوب سیر ہو کر زمزم کا پانی پئیں۔ زمزم کا پانی بہت مقدس ہے اور بڑا فائدہ مند بھی، احادیث میں اس کی فضیلت میں آیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"مَاءُ زَمْزَمَ لِمَا شُرِبَ لَهُ."

(زمزم کا پانی ہر اس چیز کے لئے ہے جس کی نیت کی جائے۔)(۳)

ایک اور حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے زمزم کا ذکر کیا اور ارشاد فرمایا کہ: "یہ مبارک ہے، جو کھانے کا کھانا اور بیماری کی شفا ہے۔"(۴)

اس موقعہ پر اللہ سے بہترین چیز مانگنا چاہیئے، ایک حدیث میں ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں قیامت کے دن کی پیاس سے حفاظت کے

---

(۱) معجم کبیر طبرانی: ۱۵/۱۰

(۲) سنن الصغری للبیہقی: ۲/۲۰۵

(۳) ابن ماجہ: ۳۰۶۲، مسند احمد: ۱۴۸۹۲، دارقطنی: ۲۷۳۹، سنن بیہقی: ۵/۱۴۸

(۴) مسند طیالسی: ۱/۳۶۴، سنن بیہقی: ۵/۱۴۸، مسند بزار: ۹/۳۶۹

لئے پیتا ہوں پھر آپ نے زمزم پیا۔(۱)

نیز امام ابن المبارک رحمہ اللہ نے جب زمزم پینا چاہا تو فرمایا کہ اے اللہ! مجھ سے عبد اللہ بن المومل رحمہ اللہ نے بیان کیا کہ مجھ سے ابو الزبیر رحمہ اللہ نے بیان کیا، ان سے حضرت جابر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: زمزم کا پانی ہر اس کام کے لئے ہے جس کی نیت کی جائے؛ لہٰذا میں قیامت کی پیاس کے لیے اس کو پیتا ہوں۔(۲)

اس سلسلہ میں ایک لطیفہ بھی کتابوں میں لکھا ہے کہ امام حمیدی رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت سفیان بن عیینہ رضی اللہ عنہ کی خدمت میں تھے، آپ نے زمزم کی مذکورہ حدیث روایت کی، تو ایک شخص مجلس میں سے کھڑا ہوا اور جا کر پھر واپس آیا اور کہنے لگا کہ اے ابو محمد! آپ نے زمزم کے بارے میں جو حدیث بیان کی کیا وہ صحیح نہیں ہے؟ آپ نے فرمایا کہ ہاں صحیح ہے اس نے کہا کہ میں نے اس نیت سے زمزم جا کر پیا ہے کہ آپ مجھے سو حدیثیں سنائیں۔ حضرت سفیان رحمہ اللہ نے کہا کہ اچھا، بیٹھو، پھر ایک سو حدیثیں اس کو سنائیں۔(۳)

لہٰذا خوب سیر ہو کر زمزم پئیں، پھر دو رکعت نماز "واجب الطواف" مقام ابراہیم کے پاس یا جہاں بھی مسجد حرام میں موقعہ ہو پڑھیں۔

مقام ابراہیم اور نماز طواف

مقام ابراہیم کعبے کے دروازے اور حطیم کے درمیان رکھا ہوا ہے اور اس کے

(۱) شعب الایمان: ۳۰/۶

(۲) معجم ابن المقری: ۳۶۱/۱

(۳) المجالسۃ للدینوری: ۳۴۲/۲، اخبار الظراف لابن الجوزی: ۱۲۱/۱

بارے میں بہت سے اقوال ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ دراصل حضرت ابراہیم علیہ السلام کا وہ پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر آپ نے کعبۃ اللہ کی تعمیر کی تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قدم کے نشانات میں نے دیکھے ہیں جو لوگوں کے چھونے کی وجہ سے مٹ گئے ہیں۔ (۱)

بہ ہر حال یہ مقام بڑا مبارک مقام ہے، یہاں دو رکعت نماز کا طواف کے بعد پڑھنا مشروع ہے۔ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

﴿ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرَاهِيْمَ مُصَلًّى ﴾ (البقرۃ: ۱۲۵)

(اور مقام ابراہیم کو مصلیٰ بناؤ۔)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جگہ آ کر بعد طواف دوگانہ نماز ادا کی تھی، لہٰذا یہاں دو رکعت نماز پڑھیں، اور یہ دو رکعتیں واجب ہیں، اور ہر طواف کے بعد ان کا پڑھنا ضروری ہے۔ اور ان کو فوراً بعد طواف پڑھنا بہتر ہے اور تاخیر مکروہ ہے، ہاں اگر مکروہ وقت ہو تو مکروہ وقت نکلنے کے بعد پڑھنا چاہئے۔ تصویر دیکھئے:

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۱/۴۱۴، البحر المحیط: ۱/۵۵۲

صفا ومروہ پر

طواف اور نماز طواف ادا کرنے کے بعد اب آپ کو صفا ومروہ پر جانا ہے اور وہاں ان دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کے درمیان سعی کرنا ہے۔

صفا ومروہ کی ان دو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے ایک مقدس تاریخ وابستہ ہے، یہیں حضرت ہاجرہ نے اپنے نور نظر ولخت جگر حضرت اسماعیل کے لئے ان کی شیر خوارگی کے زمانے میں پانی یا کسی قافلہ کی تلاش میں سعی کی تھی اور ان پر سات بار چکر لگایا تھا اور ان کے درمیان ایک جگہ پر دوڑی بھی تھیں، اللہ کو ان کی یہ ادا اس قدر پسند آئی کہ اللہ نے اس عمل ''سعی'' کو قیامت تک زندۂ جاوید عمل بنا دیا اور ہر عمرہ و حج کرنے والے کے لیے اس سعی کو واجب ولازم اور سعی کے درمیان دوڑنے کو سنت قرار دے دیا۔

سعی کے چند مسائل

صفا ومروہ پر سعی کرنا حنفیہ کے نزدیک واجب ہے، سعی میں سات چکر ہیں: صفا سے مروہ تک ایک چکر اور مروہ سے صفا تک دوسرا چکر شمار ہوتا ہے، اس طرح سات چکر ہونا چاہیے، سعی صفا سے شروع کر کے مروہ پر ختم کرنا واجب ہے، اگر کوئی عذر نہ ہو تو سعی پیدل چل کر کرنا چاہئے: لہٰذا جو لوگ بلا عذر سواری و گاڑی پر سعی کرتے ہیں ان پر دم دینا واجب ہو جاتا ہے، اگر سعی پیدل شروع کرنے کے بعد بیماری یا کمزوری کی وجہ سے چلا نہ جا سکے تو باقی سعی کو گاڑی میں پورا کر لینا جائز ہے، طواف کے فوراً بعد سعی کرنا سنت ہے، واجب نہیں ہے، سعی کے پھیروں میں ایک کے بعد دوسرے کا مسلسل کرنا سنت ہے، بلا عذر درمیان میں فاصلہ مکروہ ہے، صفا ومروہ پر چڑھنا بھی سنت ہے، لہٰذا بلا عذر اس کو ترک کرنا مکروہ ہے، سعی میں وضو کا ہونا سنت ہے،

واجب نہیں، میلین اخضرین (ہرے لائٹوں) کے درمیان تیز قدموں سے چلنا بھی سنت ہے، مگر زور زور سے دوڑنا مکروہ ہے۔

اگر کسی عذر سے کسی سواری پر سعی کریں تو میلین کے درمیان سواری کو بھی تیز کردیں، اگر سعی کے دوران نماز کھڑی ہوجائے تو نماز میں شریک ہوجائیں اور نماز کے بعد اپنی باقی سعی پوری کرلیں۔

سعی کا طریقہ

سعی کا طریقہ یہ ہے کہ طواف کے بعد باب الصفا سے نکل کر صفا پر اس قدر چڑھیں کہ وہاں سے کعبۃ اللہ نظر آجائے، بہت اوپر تک نہیں چڑھنا چاہئے اور چڑھنے سے پہلے یہ دعاء پڑھ لیں :

"أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ عزوجل بِهِ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ".

اس کے بعد صفا پر چڑھ کر قبلہ رو ہو کر، دعاء میں جس طرح ہاتھ اُٹھاتے ہیں، اس طرح ہاتھ اُٹھا کر یہ دعاء پڑھیں:

"اَللّٰهُ أَكْبَرُ ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لاَ إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ لاَ شَرِيْكَ لَهُ ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَ هُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهُ أَنْجَزَ وَعْدَهُ وَ نَصَرَ عَبْدَهُ وَ هَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ." (تین بار۔)(۱)

اور اس جگہ خوب دعائیں مانگیں، کہ یہ بھی قبولیت دعاء کے مقامات میں سے

(۱) مسلم: ۳۰۰۹، ابو داود: ۱۹۰۷، صحیح ابن خزیمہ: ۴/۲۳۰، مسند احمد: ۱۴۴۸۰

ایک ہے اور خشوع وخضوع کے ساتھ جو جی چاہے وہ اللہ سے مانگیں، اس کے بعد صفا سے اتر کر مروہ کی جانب معمولی چال سے چلیں اور جب میلین اخضرین (ہرے لائٹ) پر پہنچیں تو مردوں کو چاہیے کہ ذرا تیز قدموں سے دوڑیں؛ مگر بھاگ کر نہ جائیں کہ یہ خلاف سنت ہے اور جب میلین اخضرین سے آگے نکل جائیں تو دوڑنا بھی بند کر دیں اور معمولی چال سے چلیں، یہ تیز چلنے کا حکم مردوں کو ہے، عورتوں کو نہیں؛ لہٰذا عورتیں پوری سعی میں معمولی چال ہی چلیں اور جب مروہ تک پہنچیں تو پھر وہی دعا پڑھیں جو صفا کے پاس پڑھی تھی یعنی:

”أَبْدَأُ بِمَا بَدَأَ اللّٰهُ عزوجل بِهٖ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ.“

اس کے بعد مروہ پر چڑھ کر ہاتھ اُٹھا کر یہ دعاء پڑھیں:

”اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، اَللّٰهُ أَكْبَرُ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيْكَ لَهٗ، لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ، لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ وَحْدَهٗ أَنْجَزَ وَعْدَهٗ وَنَصَرَ عَبْدَهٗ وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهٗ“. (تین بار۔)(۱)

یہاں بھی خشوع وخضوع کے ساتھ جو جی چاہے وہ اللہ سے مانگیں۔ یہ ایک چکر ہو گیا پھر مروہ سے اتر کر صفا کی طرف کو چلیں اور وہی دعائیں پڑھیں جو اوپر بتائی گئی ہیں، اس طرح سات چکر پورے کریں اور ساتویں چکر کے بعد مروہ سے اتر کر مسجد حرام میں آ کر دو رکعت نماز پڑھنا مستحب ہے۔

---

(۱) مسلم

سعی کی غلطیاں

سعی میں لوگوں سے بعض غلطیاں ہو جاتی ہیں ان کی اصلاح کر لینا چاہیے:

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ سعی میں ایک چکر صفا سے شروع ہو کر صفا پر ختم ہوتا ہے، یہ بات غلط ہے، سعی صفا سے مروہ تک ایک چکر اور مروہ سے صفا تک دوسرا چکر ہوتا ہے۔

بعض لوگ صفا و مروہ پر اس طرح ہاتھ اٹھاتے ہیں جیسے نماز میں کانوں تک اٹھائے جاتے ہیں، یہ بھی غلط ہے؛ بل کہ یہاں ہاتھ اس طرح اٹھانا چاہیے جیسے دعاء میں سینہ تک اٹھاتے ہیں۔

بعض لوگ پوری سعی میں تیز تیز چلتے ہیں اور بعض بھاگتے رہتے ہیں، یہ دونوں باتیں صحیح نہیں ہیں؛ بل کہ صرف میلین اخضرین کے درمیان تیز چلنا چاہیے۔

عورتیں بھی سعی میں بھاگتی رہتی ہیں، حالاں کہ عورت کو معمولی چال چالنا چاہئے۔

عمرے کا آخری عمل

سعی کے بعد عمرے کا صرف ایک کام باقی رہ جاتا ہے اور وہ ہے حلق یا قصر۔ حلق کے معنے سر کے بال مونڈنا اور قصر کے معنے ہیں سر کے بال کٹانا۔ لہٰذا جب سعی سے فارغ ہو جائیں تو نماز پڑھ کر سر کے بال مونڈ ڈالیں اور مونڈنا افضل ہے یا کم از کم ایک ربع یعنی پاؤ سر کے بالوں کو کٹا دیں۔ یاد رہے کہ سر کے ایک چوتھائی بالوں کا منڈانا یا کٹانا لازم ہے، اس سے کم سے احرام نہیں کھل سکتا۔

تمام سر کے بال منڈانا سنت ہے اور یہ کٹانے سے افضل ہے۔

اگر بال کٹانا ہو تو ایک انگل سے زیادہ بال کٹائیں تا کہ چھوٹے بڑے سب بال

کٹ جائیں۔

لیکن یہ منڈانے کا حکم مردوں کے لیے ہے اور عورت کے لیے صرف قصر یعنی کٹانے کا حکم ہے اور عورتیں اپنے بالوں میں سے ایک انگل کے برابر اس طرح کاٹیں کہ سارے سر کے یا کم از کم چوتھائی سر کے بال کٹ جائیں۔

الغرض جب سر کے بال منڈا دیں یا کٹا دیں تو آپ احرام سے حلال ہو جائیں گے اور وہ سب امور جو احرام کی وجہ سے ممنوع ہو گئے تھے وہ اب جائز و حلال ہو جائیں گے اور جب تک یہ عمل مکمل نہیں ہو گا احرام باقی رہے گا اور جب سر کے بال منڈا دیں یا کٹا دیں تو آپ کا عمرہ مکمل ہو جائے گا۔

زیارت مدینہ

حج یا عمرے کے سفر میں ایک نہایت بڑی فضیلت و مہتم بالشان عبادت زیارت مدینہ بھی ہے کہ آقائے نامدار سید الکائنات حضور پرنور سرور عالم صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کے روضہ اقدس و مسجد مقدس کی زیارت کی جائے۔ اگرچہ اس کو حج یا عمرے کے ارکان سے کوئی تعلق نہیں ہے؛ لیکن جب اللہ تعالیٰ کسی کو اس مقدس سرزمین میں حاضری کی سعادت بخشے تو اس سفر میں ''زیارت مدینہ'' کو بھی شامل کر لینا حج و عمرے کی قبولیت کا عمدہ ذریعہ ہے اور بذات خود بھی ایک بہترین عبادت ہے۔ پھر ذرا سوچیے کہ کون مسلمان ایسا ہوگا کہ حج یا عمرے کو جائے اور مدینہ کو اپنے سفر میں شامل نہ کرے الا یہ کہ کوئی عذر پیش آجائے۔

فضائل مدینہ

مدینہ پاک وہ مبارک بقعہ ہے جہاں ہمارے نبی حضرت محمد صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے ہجرت کرکے اپنی زندگی کے دس سال گزارے اور اللہ کے آسمانی پیغام کو اپنی خداداد صلاحیت و بصیرت سے پورے عرب میں پہنچادیا اور زمین پر بسنے والے کروڑوں بے راہ لوگوں کو ہدایت سے روشناس فرمایا۔ نیز مدینہ وہ شہر ہے جہاں خود اللہ کے نبی کا روضہ ہے، جہاں مسجد نبوی ہے، جہاں مسجد قبا ہے، جہاں روضۃ الجنۃ ہے۔ لہٰذا مدینہ منورہ کو پوری عظمت و محبت، عشق و نیاز کے ساتھ باادب و احترام

حاضر ہونا چاہیے۔

المدینۃ المنورۃ کے بہت سے فضائل احادیث مبارکہ میں وارد ہوئے ہیں، ایک حدیث میں فرمایا گیا کہ: مدینہ لوگوں کو اس طرح صاف و پاک کر دیتا ہے جس طرح بھٹی لوہے کو صاف کر دیتی ہے۔(۱)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاء کی:

« اللّٰهُمَّ حَبِّبْ إِلَيْنَا الْمَدِيْنَةَ كَحُبِّنَا مَكَّةَ أَوْ أَشَدَّ. »

(اے اللہ! مدینہ کو ہمارے لیے مکہ کی طرح یا اس سے بھی زیادہ محبوب بنا دے۔)(۲)

ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يَّمُوْتَ بِالْمَدِيْنَةِ فَلْيَمُتْ فَإِنِّيْ أَشْفَعُ لَهُ أَوْ أَشْهَدُ لَهُ. »

(تم میں سے جو شخص مدینہ میں مر سکتا ہو وہ مدینہ میں مرے، کہ میں اس کے حق میں شفاعت کروں گا یا یہ فرمایا کہ میں اس کے حق میں گواہی دوں گا۔)(۳)

لہٰذا مدینہ طیبہ کا سفر ایک مسلمان کے لئے جس قدر باعث خوشی و مسرت ہوسکتا ہے اور جس طرح جذبات عشق و محبت سے لبریز ہوسکتا ہے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے، اس سب کے ساتھ جب وہ اس جیسی حدیث پڑھتا ہے کہ رسول اللہ

(۱) بخاري: ۱۸۷۱،صحیح ابن حبان: ۳۷۲۳

(۲) بخاري: ۱۸۸۹،صحیح ابن حبان: ۳۷۲۳،مسند احمد: ۲۴۳۳۳

(۳) السنن الكبرى للنسائي: ۴۲۷۱،و اللفظ له شعب الايمان: ۶/۶۲

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ حَجَّ فَزَارَ قَبْرِيْ بَعْدَ وَفَاتِيْ فَكَأَنَّمَا زَارَنِيْ فِيْ حَيَاتِيْ. »

(جس نے میری وفات کے بعد حج کیا اور پھر میری قبر کی زیارت کی تو اس نے گویا میری زندگی میں میری زیارت کی۔)

اور ایک حدیث میں یہ:

« مَنْ زَارَ قَبْرِيْ وَجَبَتْ لَهُ شَفَاعَتِيْ. »

(جس نے میری قبر کی زیارت کی اس کے لیے میری شفاعت واجب ہوگئی۔)(۱)

اور یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَنْ حَجَّ فَلَمْ يَزُرْنِيْ فَقَدْ جَفَانِيْ. »

(جس نے حج کیا اور میری زیارت کو نہیں آیا اس نے مجھ سے بے وفائی کی۔)(۲)

یہ احادیث اگرچہ ضعیف ہیں مگر متعدد ہونے کی وجہ سے قابل احتجاج ہیں، سیوطی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اس کو ابن الجوزی رحمہ اللہ نے موضوعات میں داخل کیا مگر یہ صحیح نہیں، کنز العمال میں بھی اسی طرح ہے اور علامہ حسن بن احمد الصنعانی رحمہ اللہ نے فتح الغفار میں فرمایا کہ: اس کے شواہد ضعیفہ موجود ہیں جو ایک دوسرے کو تقویت دیتے ہیں اور تمام شہروں میں مسلمانوں کا عمل بھی اسی پر ہے۔(۳)

---

(۱) دار قطني: ۲۶۹۳-۲۶۹۵، اتحاف الزائر لابن عساكر: ۲۰-۲۵

(۲) جامع الاحاديث للسيوطي: ۲۱۹۹۷، كنز العمال: ۱۲۳۶۸

(۳) فتح الغفار: ۲/۸۴۷

علامہ عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ نے اسی لیے فرمایا کہ: یہ احادیث اگر چہ کہ ضعیف ہیں؛ لیکن ان میں سے بعض ضعف قادح سے سالم ہیں اور ان کے مجموعہ سے قوت حاصل ہو جاتی ہے، جیسا کہ حافظ ابن حجر رحمہ اللہ نے "التلخیص الحبیر" میں اور علامہ تقی الدین السبکی رحمہ اللہ نے "شفاء السقام" میں تحقیق کی ہے اور ان کے بعض معاصرین اور وہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ہیں انھوں نے غلطی کی کہ یہ گمان کرلیا کہ اس باب میں وارد تمام احادیث ضعیف بلکہ موضوع ہیں۔ (۱)

الغرض مدینہ کا سفر اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کی زیارت ایک نہایت مبارک عمل ہے جس کی ہر مومن کے دل میں خواہش و آرزو ہوتی ہے۔

مسجد نبوی وریاض الجنۃ میں

جب مدینہ طیبہ میں حاضر ہوں تو سب سے پہلے غسل کرکے پاک و صاف لباس پہن کر عطر سے معطر ہو کر مسجد نبوی حاضر ہوں اور مسجد کے داخلہ کے آداب کا پورا لحاظ کرتے ہوئے دعاء پڑھ کر داخل ہوں اور بہتر ہے کہ باب جبریل سے داخل ہوں، پھر ریاض الجنۃ میں آئیں۔

مسجد نبوی وہ مسجد ہے جس کی بنیاد اللہ کے حکم سے خود حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھی اور اس کی تعمیر بھی خود آپ نے اپنے ہاتھوں سے فرمائی۔ اس میں نماز پڑھنے کا ثواب دوسری مسجدوں کے لحاظ سے ایک ہزار نمازوں کے برابر ہے۔ چناں چہ ایک حدیث میں خود اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« صَلَاةٌ فِيْ مَسْجِدِيْ هٰذَا خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ صَلَاةٍ فِيْمَا سِوَاهُ إِلَّا الْمَسْجِدَ الْحَرَام. »

---

(۱) التعلیق الممجد به تحقیق علامه تقی الدین ندوی: ۳/۴۴۸

(میری اس مسجد میں نماز دوسری مسجدوں کے لحاظ سے ایک ہزار نمازوں سے بڑھ کر ہے، سوائے مسجد حرام کے۔)(۱)

اور ایک حدیث میں مسجد نبوی میں نماز کا ثواب پچاس ہزار نمازوں کے برابر ہونا آیا ہے، جس کے الفاظ یہ ہیں:

« وَصَلَاتُهُ فِي مَسْجِدِي هٰذَا بِخَمْسِينَ أَلْفُ صَلَاةٍ. »

(میری اس مسجد میں آدمی کی نماز پچاس ہزار کے برابر ہے۔)(۲)

لیکن اس کی سند ضعیف ہے، جیسا کہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فرمایا اور اس کا متن بھی منکر ہے جیسا کہ حافظ ذھبی رحمہ اللہ نے کہا ہے۔(۳)

پھر ریاض الجنۃ میں حاضر ہوں اور وہاں دو رکعت نماز "تحية المسجد" پڑھیں، ریاض الجنۃ مسجد نبوی میں روضۂ اقدس اور ممبر رسول کے درمیان کا ایک حصہ ہے، جس کے بارے میں حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَا بَيْنَ بَيْتِي وَ مِنْبَرِي رَوْضَةٌ مِّنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ. »

(میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان کا حصہ جنت کے باغات میں سے ایک باغ ہے۔)(۴)

اس حدیث کی تشریح میں علماء نے لکھا ہے کہ اس حدیث کا ایک معنی یہ ہے کہ یہ حصہ جنت کے باغ کے جیسا ہے، کہ جس طرح جنت میں اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے اور سعادتوں کا حصول ہوتا ہے اسی طرح یہاں بھی یہ دولت حاصل ہوتی ہے۔

(۱) بخاري: ۱۱۹۰، مسلم: ۳۴۴۰
(۲) ابن ماجه: ۱۴۱۳، معجم اوسط طبرانی: ۱۱۲/۸
(۳) دیکھو: التلخيص الحبير: ۴/۴۳۸، تخريج الاحياء للعراقی: ۱/۲۰۲
(۴) بخاري: ۱۱۹۶، مسلم: ۳۴۳۴

ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس میں عبادت جنت میں پہنچنے کا وسیلہ و ذریعہ ہے اور ایک مطلب یہ بیان کیا گیا کہ یہ حصہ حقیقت میں جنت ہی ہے؛ اس لیے کہ یہ حصہ قیامت میں جنت میں منتقل کر دیا جائے گا۔ علامہ انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میرے نزدیک اس کی یہی شرح سب سے زیادہ صحیح ہے۔ (۱)

اور ریاض الجنۃ میں عبادت کا بڑا ثواب ہے، ایک حدیث میں ہے کہ جو شخص ریاض الجنۃ میں چار رکعات نماز پڑھتا ہے اسے ''بطنان عرش'' یعنی عرش کے درمیانی حصہ سے پکارا جاتا ہے کہ اے بندے! تیرے تمام گزشتہ گناہ بخش دئے گئے؛ لہٰذا از سرنو عمل کرو۔ (۲)

لہٰذا اس جگہ پہنچنا دراصل جنت میں داخل ہوجانا ہے، یہاں جا کر سوچے کہ اللہ نے مجھے جنت کے ایک حصہ میں داخل فرمایا ہے، بظاہر تو یہ دنیا ہے؛ مگر حقیقت میں یہ جنت ہے، اس پر اللہ کا شکر ادا کریں اور یہ دعاء کریں کہ اے اللہ! جس طرح تو نے مجھے یہاں اس جنت میں داخل کیا ہے قیامت میں بھی جنت میں داخلہ نصیب فرما اور یہ موقعہ بھی قبولیت دعاء کا ہے؛ لہٰذا خوب گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں مانگیں اور نماز و ذکر و تلاوت کا اہتمام کریں؛ لیکن یہ یاد رکھیں کہ یہاں لوگوں کا ہجوم رہتا ہے اور لوگ دوسروں کو تکلیف دے کر یہاں جانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ بات غلط ہے ذرا انتظار کریں تو یہاں آرام سے جگہ مل جاتی ہے۔

روضۂ خضراء پر حاضری

اے زائرین کرام! اب وہاں سے چل کر روضۂ نبوی پر حاضری دیں، یہ کس کا

---

(۱) فتح الباري: ۴/۱۰۰، شرح البخاري لابن بطال: ۴/۵۵۷، عمدة القاري: ۱۱/۳/۴۷۳، فیض الباري: ۴/۴۵

(۲) اخبار مکه فاکهی: ۱/۴٦۸

روضہ ہے؟ یہ سرورعالم، سیدالکائنات، فخر موجودات، افضل المخلوقات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا روضہ شریف ہے، جہاں آپ آرام فرما ہیں اور اہل سنت کے عقیدے کے مطابق آپ اپنی قبر اطہر میں زندہ موجود ہیں اور آپ کا مرتبہ ومقام کس مسلمان سے پوشیدہ ہوگا؟ اور آپ کا تمام انبیاء ورسل میں سب سے افضل ہونا کس سے مخفی ہے؟ کہنے والے نے سچ کہا ہے:

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

اور آپ یہ نہ بھولیں کہ اس وقت آپ ایک ایسی مقدس ومحترم جگہ پر ہیں جہاں اللہ کے فرشتے بھی با ادب واحترام حاضر ہوتے ہیں، یہ وہ مقام ہے جہاں ارباب تخت وتاج واصحاب بخت وباج بھی سرنگوں آتے ہیں، اولیاء کرام ومشائخ عظام، علماء وفضلاء سب کے سب غلامانہ حاضری دیتے ہیں، دنیا کے رؤساء وارباب دولت، اہل عقل ودانش سب کی سطوتیں جھکی ہوئی نظر آتی ہیں۔

لہٰذا نہایت ادب واحترام کے ساتھ خشوع وخضوع کا لحاظ کرتے ہوئے، نگاہوں کو باوقار طریقہ سے نیچے رکھتے ہوئے مواجہ شریف میں سرہانے کی دیوار کے کونے والے ستون سے تین چار ہاتھ کے فاصلے سے کھڑے ہوجائیں اور پشت قبلہ کی جانب رکھیں، ادھر ادھر ہرگز نہ دیکھیں، پوری توجہ آنحضرت کی جانب ہو، یہ خیال ہو کہ آپ کے سامنے میں اس طرح حاضر ہوں جیسے آپ کی زندگی میں حاضری ہوتی۔ پھر آپ پر درمیانی آواز کے ساتھ سلام ودرود کا تحفہ بھیجیں۔ یہ سلام وصلاۃ خود بہ نفس نفیس آپ سنتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

« مَا مِنْ أَحَدٍ يُسَلِّمُ عَلَيَّ إِلَّا رَدَّ اللّٰهُ عَلَيَّ رُوْحِيْ حَتّٰى أَرُدَّ عَلَيْهِ السَّلَامَ. »

(کوئی بھی شخص مجھ پر سلام نہیں بھیجتا؛ مگر اللہ تعالی میری روح کو

لوٹاتے ہیں حتی کہ میں اس کے سلام کا جواب دیتا ہوں۔)(۱)

درود وسلام بھیجنے کا طریقہ یہ ہے کہ: نہ زور سے نہ بہت آہستہ؛ بل کہ درمیانی آواز کے ساتھ یوں عرض کریں:

اَلسَّلاَمُ عَلَیْکَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہ، اَلسَّلاَمُ عَلَیْکَ یَا نَبِيَّ اللّٰہ، اَلسَّلاَمُ عَلَیْکَ یَا حَبِیْبَ اللّٰہ، اَلسَّلاَمُ عَلَیْکَ یَا خَیْرَ خَلْقِ اللّٰہ، اَلسَّلاَمُ عَلَیْکَ یَا خَاتَمَ الْأَنْبِیَاء، اَلسَّلاَمُ عَلَیْکَ یَا سَیِّدَ الْأَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْنَ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَ بَرکَاتُہٗ.

پھر دل کھول کر گڑگڑا کر آپ سے اپنے حق میں دین و دنیا کے لیے اللہ سے دعا کرنے کی درخواست کریں اور گناہوں کی معافی کے لیے اللہ سے استغفار اور قیامت میں ''شفاعت'' کرنے کی گزارش کریں اور یوں عرض کریں کہ یا رسول اللہ! میرے گناہوں نے میری کمر توڑ دی ہے، میں آپ کے سامنے اللہ سے توبہ کرتا ہوں اور آپ سے گزارش کرتا ہوں کہ میری معافی کے لیے آپ اللہ سے شفارش فرمائیں اور روز قیامت بھی ضرور میری سفارش فرمائیں۔ اس کے بعد اگر کسی نے آپ کے دربار میں سلام پیش کرنے کہا ہو تو اس کا سلام پیش کریں یا خود آپ کسی کا سلام پیش کرنا چاہیں تو پیش کریں اور ان لوگوں کے لیے بھی دعاء کی درخواست کریں۔

روضہ پر لوگوں کی اغلاط

روضۂ خضرا کے پاس بھی بعض لوگ اپنی جہالت و ناواقفیت کی وجہ سے بعض کام بے ادبی و گستاخی کے یا کفریہ وشرکیہ قسم کے کرتے ہیں، ان سے بچنا ضروری ہے؛ لہٰذا یہاں ان کی نشان دہی کی جاتی ہے۔

(۱) ابو داؤد: ۲۰۴۳، مسند احمد: ۱۰۸۲۷، سنن بیہقی: ۵/ ۲۴۵

سجدہ ورکوع یا اور کوئی عبادت صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے، اس میں کسی کا کوئی حصہ نہیں، غیر اللہ کے لیے عبادت شرک ہے؛ لہٰذا یہاں بھی کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہئے۔حدیث میں ہے کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اپنے مرض الوفات میں فرمایا:

« لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى، اِتَّخَذُوْا قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ مَسَاجِدَ. »

(اللہ یہود ونصاریٰ کو غارت کرے کہ انھوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔)(۱)

ایک روایت میں حضرت جندب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے وفات سے پانچ دن قبل فرمایا:

« إِنَّ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ كَانُوْا يَتَّخِذُوْنَ قُبُوْرَ أَنْبِيَاءِ هِمْ وَ صَالِحِيْهِمْ مَسَاجِدَ، أَلَا فَلَا تَتَّخِذُوْا الْقُبُوْرَ مَسَاجِدَ ، فَإِنِّيْ أَنْهَاكُمْ عَنْ ذٰلِكَ. »

(بے شک تم سے پہلے لوگ اپنے انبیاء اور نیک لوگوں کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا کرتے تھے، خبردار تم قبروں کو سجدہ گاہ نہ بنالینا، پس میں تم کو اس سے منع کرتا ہوں۔)(۲)

بعض لوگ روضہ شریف کی جالیوں کو چھونے اور بوسہ دینے کی کوشش کرتے ہیں، یا اس کے سامنے جھکنے کی ادا اختیار کرتے ہیں، یہ صحیح نہیں ہے، اس سے بچنا چاہئے، کیوں کہ خود اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے اس قسم کی تعظیم سے منع کیا ہے۔

بعض لوگوں کو دیکھا گیا کہ زور زور سے سلام و درود پیش کرتے ہیں، اور مسجد میں

---

(۱) بخاری: ۲۶۶۵، مسلم: ۵۲۹، مسند احمد: ۲۴۹۳۹، وغیرہ

(۲) مسلم: ۵۳۲، صحیح ابن حبان: ۱۴/۳۳۴

ایک شور سا ہونے لگتا ہے، یہ بات منع ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ادب کے خلاف ہے۔ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک بار میں مسجد نبوی میں تھا کہ کسی نے مجھے کنکری ماری، میں نے دیکھا تو وہ حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تھے، آپ نے (دو شخصوں کو دکھا کر) فرمایا کہ ان دو کو میرے پاس لے آؤ، وہ کہتے ہیں کہ میں ان کو لیکر آپ کے پاس آیا، آپ نے ان سے پوچھا کہ تم کون ہو؟ انھوں نے کہا کہ ہم طائف کے رہنے والے ہیں، آپ نے فرمایا کہ اگر تم یہاں کے ہوتے تو تمہاری پٹائی کرتا، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد میں آواز بلند کرتے ہو؟ (۱)

تاریخ میں ہے کہ ایک بار حضرت امام مالک رحمہ اللہ سے ان کے زمانے کا بادشاہ امیر المومنین ابو جعفر المنصور رحمہ اللہ نے مسجد نبوی میں کسی سلسلہ میں بحث کی اور اس کی آواز بلند ہوگئی تو امام مالک رحمہ اللہ نے فرمایا کہ اے امیر المومنین! اس مسجد میں آواز بلند نہ کریں، اللہ نے صحابہ کی ایک جماعت کو یہ ادب سکھایا ہے۔

﴿لَا تَرْفَعُوْا أَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ﴾

(اپنی آواز کو نبی کی آواز پر بلند نہ کرو۔)

اور ایک جماعت کی تعریف اس طرح کی:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ﴾

(جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنی آواز کو پست کر لیتے ہیں۔)

اور پھر فرمایا کہ آپ کی عظمت وفات کے بعد بھی اسی طرح ہے جیسے زندگی میں ہوتی ہے۔ (۲)

---

(۱) بخاري: ۴۷۰

(۲) ترتیب المدارک قاضی عیاض: ۱/۶۸، خلاصہ الوفاء للسمهودی: ۱/۵۱

بعض لوگ اس موقعہ پر بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرتے اور دوسروں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، اس سے ایک جانب ادب رسول کے خلاف گستاخانہ انداز ظاہر ہوتا ہے تو دوسری جانب دوسروں کو اذیت دینے کی قباحت بھی لازم آتی ہے۔

حضرت صدیق وفاروق کی خدمت میں سلام

اس کے بعد حضور علیہ السلام کے جوار میں مدفون آپ کے دو صحابہ حضرت ابوبکر الصدیق وحضرت عمر الفاروق رضی اللہ عنہما کی خدمات مقدسہ میں سلام پیش کریں، اول حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سلام پیش کریں، آپ کی مزار حضور علیہ السلام کے جوار میں ایک ہاتھ داہنی جانب کو ہے اور پھر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اس سے ایک ہاتھ داہنی جانب مدفون ہیں؛ لہٰذا یکے بعد دیگرے ان حضرات کو سلام پیش کریں اور کسی کا سلام ہو تو اس کو بھی پیش کریں۔ اور قارئین کتاب سے بندہ کی عاجزانہ گزارش ہے کہ اس عاجز وفقیر کا سلام بھی دربار عالی میں پیش کردیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا صَلَّيْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ ، اَللّٰهُمَّ بَارِكْ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّ عَلٰى اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰى إِبْرَاهِيْمَ وَ عَلٰى اٰلِ إِبْرَاهِيْمَ إِنَّكَ حَمِيْدٌ مَجِيْدٌ .

فقط

محمد شعیب اللہ خان

مہتمم الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم

ایک اہم فتویٰ بہ سلسلہ

جماعتِ تبلیغ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فتوی بہ سلسلۂ جماعت تبلیغ

سوال

باسمہ تعالی عز اسمہ

کیا فرماتے ہیں علمائے دین ومفتیان شرع متین مسئلہ ذیل کے بارے میں کہ ایک شخص جوکہ بنگلورشہر کے مشہور مفتی صاحب ہیں، انہوں نے اپنے بیان میں ﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ کی تفسیر کرتے ہوئے ارشادفرمایا کہ اگرلوگ گشت نہ کریں گے اور جماعت میں نہ نکلیں گے اور جماعت کے کاموں میں لگنے سے جی چرائیں گے تو اللہ ان کی جگہ پر دوسری قوم کولے کرآئے گا جو جماعت میں نکلنے، گشت کرنے اور جو جماعت کے دوسرے کاموں کو کرنے میں بہانہ نہیں بنائیں گے، کوئی عذر پیش نہیں کریں گے اور بیوی بچوں کا خیال نہ کرتے ہوئے جماعتوں میں نکلیں گے۔

اسی طرح قرآن کریم کی آیت کریمہ ﴿وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ﴾ کا مطلب بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ جماعت میں نہ جانے والوں کو اللہ دنیا ہی میں عذاب کا مزہ چکھائیں گے اور آخرت کا عذاب تو سخت ہوگا ہی۔

نیز دوران بیان فرمایا کہ جو جماعت کے کام میں نہ لگے وہ کتے سے بھی زیادہ

ذلیل ہوگا، کہ کتے کو تو قدرے عزت بھی ملتی ہے؛ مگر اس کو اتنی بھی عزت نہ ملے گی، یہاں تک کہ تھوک کر آدمی اپنے اس تھوکے ہوئے کو تو پلٹ کر دیکھ لیتا ہے؛ مگر اس کو کوئی نہ دیکھے گا۔

نیز فرمایا کہ مسجدوں سے اللہ گواہی لیں گے کہ کون جماعت کے کام میں شریک ہوتا تھا کون نہیں؟ کون جھوٹا وعدہ کرتے ہوئے نام لکھاتا تھا، کون سچے دل سے نام لکھاتا تھا۔

ایسے ہی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ کا ایک واقعہ بیان کیا کہ پنجاب کے علاقے میں انہوں نے جماعت روانہ کرنا چاہی جس وقت کہ وہاں پر ۱۹۴۷ء میں فساد ہو رہا تھا، حضرت مدنی رحمہ اللہ کو معلوم ہوا تو انہوں نے سختی سے منع کیا کہ کیا غضب کر رہے ہو! ان کو بھیج کر وہاں مرواؤ گے؟ تو حضرت مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ اللہ کے غضب کو ٹھنڈا کرنے کے لیے ہی تو بھیج رہا ہوں۔

یہ مفتی صاحب موصوف کی تقریر کے چند اقتباسات تھے۔ اب اس سلسلے میں چند سوالوں کے جواب مطلوب ہیں۔

(۱) مفتی صاحب نے آیات کی جو تفسیر کی ہے آیا یہ کسی معتبر قدیم وجدید مفسر کی کی ہوئی تفسیر ہے یا تفسیر بالرائے میں داخل ہے؟

(۲) کیا ان آیات کا مدلول وہی ہے جو مفتی صاحب نے بیان کیا ہے؟

(۳) کیا جماعت میں جانا اور جماعت کے کاموں میں لگنا اتنا ہی ضروری ہے کہ نہ لگنے والوں کو اللہ تباہ و برباد کر کے ان کی جگہ پر دوسری قوم لے کر آجائے گا؟ اور جماعت میں نہ جانے والے جب کہ وہ دین کے دوسرے اہم شعبوں میں

خدمات انجام دے رہے ہیں اللہ ان کو دنیا ہی میں عذاب کا مزہ چکھائیں گے؟ اور ایسا شخص دنیا والوں کی نظروں میں کتے سے بھی زیادہ ذلیل ہوگا؟ پھر گزشتہ چودہ سو سال کے وہ اکابر و اسلاف امت جنہوں نے اپنی پوری زندگی دین کے لیے قربان کر دی مروجہ تبلیغی جماعت ان کے زمانہ میں تھی ہی نہیں تو کیا یہ سب نعوذ باللہ الف الف مرۃ کتے سے ذلیل ہیں؟

(۴) مولانا یوسف صاحب اور حضرت مدنی رحمہما اللہ کا یہ واقعہ کیا صحیح ہے؟ اگر صحیح ہے تو کیا اس میں حضرت مدنی کی تنقیص لازم نہیں آرہی ہے؟

(۵) ایسے علماء و مفتیان جو تبلیغ میں نہ لگنے والوں کے بارے میں ایسے گھناؤنے خیالات رکھتے ہوں ان کے اوپر شریعت کی طرف سے کیا فتوی لگتا ہے۔

(۶) کیا ایسے علمائے کرام ہی کی تقریروں کی وجہ سے تبلیغ والوں میں غلو پیدا نہیں ہو رہا ہے؟ بینوا و توجروا

محمد طارق قاسمی
الیاس نگر، شیموگہ، کرناٹک

الجواب ومنہ الحق والصواب

آپ نے جو اقتباسات کسی مفتی صاحب کے بیان سے لے کر بھیجے ہیں، اولاً تو یقین نہیں آتا کہ کوئی مفتی و عالم دین ایسی بات بیان کرے گا یا کوئی صاحب فہم تبلیغی جماعت سے لگا ہوا بھی ایسی بات کہے گا؛ ہاں! البتہ عوام الناس میں سے بعض لوگ جو جماعت کے کام سے متأثر ہو کر دین میں لگ گئے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اسی راہ سے ہدایت دی، ایسے بعض حضرات کو غلو کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے کہ وہ ایسی باتیں ''دعوت و تبلیغ'' کی محبت و عظمت میں کہہ جاتے ہیں؛ لیکن کوئی معتبر مفتی صاحب ایسی بات کہیں یہ یقیناً قابل حیرت بات ہے، تاہم بصورتِ صدقِ سوال آپ کے سوالات کا جواب یہ ہے:

(۱) آیات مذکورہ فی السوال کا جو مطلبِ مذکورہ مفتی مذکور نے بیان کیا ہے، اگر ان کی مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان میں جماعت میں نہ جانے پر اور چلہ وگشت میں نہ چلنے پر وعید بیان کر رہے ہیں، تو یہ تفسیر ان آیات کی کسی معتبر مفسر نے نہیں بیان کی ہے اور یہ تفسیر بالرائے میں داخل ہے۔

(۲) ان دو آیات میں سے پہلی آیت کریمہ:

﴿وَاِنْ تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُوْنُوْٓا اَمْثَالَكُمْ﴾ (محمد: ۳۸)

کا مقصود، مراد و مدلول یہ ہے کہ اگر تم اللہ و رسول کی اطاعت و فرمانبرداری سے اور اس کی شریعت و احکامات پر عمل سے روگردانی کرو گے تو اللہ تعالیٰ دوسری قوم کو پیدا کر کے ان سے اپنے دین و شریعت کو نافذ کرے گا۔

اس سے صرف جماعتِ تبلیغ میں نکلنے کا مفہوم نکالنا قرآن کریم کو غلط معنی پر ڈھالنا ہے۔

دیکھئے علامہ ابن کثیر رحمۃ اللہ نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا:

”وإن تتولوا أي عن طاعته واتباع شرعه.“ (۱)

اور معروف ومستند مفسر امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ اس آیت کی مراد بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

”يقول تعالى ذكره: وإن تتولوا أيها الناس عن هذا الدين الذى جاء به محمد صلی اللہ علیہ وسلم فترتدوا راجعين عنه يستبدل قوما غيركم، يعنى يهلككم ثم يجيء بقوم آخرين غيركم بدلا منكم يصدقون به ويعملون بشرائعه.“ (۲)

نیز علامہ ابوحیان رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

”و إن تتولوا عن الايمان والتقوى .“ (۳)

تفسیر خازن میں ہے:

”وإن تتولوا عن طاعة اللّٰه وطاعة رسوله صلی اللہ علیہ وسلم وعن القيام بما أمركم به و ألزمكم إياه يستبدل قوماًالخ.“ (۴)

---

(۱) تفسیر ابن کثیر: ۷/۳۲۴

(۲) طبری: ۲۲/۱۹۲

(۳) البحر المحيط: ۹/۴۷۸

(۴) تفسير خازن: ۴/۱۵۱

معاصر عالم وفقیہ علامہ زحیلی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

”وإن تعرضوا عن الایمان والتقوی و عن طاعة اللّٰہ واتباع شرعہ یستبدل قوما آخرین.“ (۱)

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ: اور اگر تم ہمارے احکام سے روگردانی کروگے تو خدا تعالیٰ تمہاری جگہ دوسری قوم پیدا کر دے گا۔ (۲)

مفسر قرآن حضرت مفتی شفیع صاحب رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ:

”اس آیت میں حق تعالیٰ کے غنی الاغنیا ہونے کو اس طرح واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے اموال کی تو کیا خود تمہارے وجود کی بھی کوئی ضرورت نہیں، اگر تم سب کے سب ہمارے احکام کی تعلیم چھوڑ دو تو جب تک ہمیں دنیا کو اور اس میں اسلام کو باقی رکھنا ہے، ہم اپنے دین کی حفاظت اور اپنے احکام کی تعمیل کے لئے دوسری ایسی قوم پیدا کر دیں گے جو تمہاری طرح احکام شرعیہ سے گریز اور اعراض نہ کرے گی؛ بلکہ ہماری مکمل اطاعت کرے گی۔“ (۳)

ان سارے علمائے مفسرین نے جو تفسیر کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ دین وشریعت کو اور اطاعت خدا و رسول کو چھوڑ دینے پر لوگوں کو یہ وعید سنانا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں، اللہ تمہاری جگہ دوسری قوم کو پیدا کر کے اپنے دین وشرع کو جاری ونافذ کر دے گا۔

---

(۱) التفسیر الوسیط: ۳/ ۲۴۴۹

(۲) بیان القرآن: ۲/ ۵۴۰

(۳) معارف القرآن: ۸/ ۵۱

لہٰذا اس آیت کا یہ مطلب لینا کہ جماعت میں نہ جانے پر اس میں وعید و دھمکی ہے، صریح طور پر اللہ کے کلام کی تفسیر بالرائے ہے۔

اور دوسری آیت:

﴿ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾

یہ بھی کافروں کے بارے میں ہے؛ کیوں کہ یہاں اوپر سے مضمون چلا آ رہا ہے، غور کیجیے:

﴿اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ﴾

(السجدۃ: ۱۹-۲۰)

(رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل کیے تو ان کے لیے بطور مہمانی قیام کی جنتیں ہیں، ان اعمال کے صلے میں جو وہ کیا کرتے تھے، اور رہے وہ لوگ جو نافرمانی کرتے ہیں تو ان کا ٹھکانہ جہنم ہے، جب بھی وہ اس سے نکلنا چاہیں تو اسی میں لوٹا دیئے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا کہ جس دوزخ کو تم جھٹلاتے تھے اس کا مزا چکھو، اور اس بڑے عذاب سے پہلے ہم ان کو کم درجے کا عذاب چکھائیں گے، تاکہ وہ باز آجائیں۔)

ان آیات کو پڑھتے ہوئے ہر شخص بھی محسوس کر سکتا ہے کہ یہاں مؤمنین و کفار کا ذکر ہے، مؤمنین سے ان کی ایمان و عمل صالح پر جنت کا وعدہ کیا گیا اور کفار وفساق کو ان کی بے ایمانی و بدعملی پر دوزخ کی وعید سنائی گئی ہے۔

امام ماوردی رحمۃ اللہ نے ان آیات کے بارے میں فرمایا کہ یہاں مؤمن سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاسق سے مراد عقبہ بن معیط کافر ہے اور بتایا ہے کہ یہ آیات ان کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔(۱)

ابن الجوزی رحمۃ اللہ نے بھی لکھا ہے کہ ان آیات میں مؤمن سے مراد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور فاسق سے مراد ولید بن عقبہ ابن ابی معیط ہے، اور ایک قول یہ ہے کہ مؤمن سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور فاسق سے ابوجہل مراد ہے۔(۲)

عام طور پر مفسرین نے یہاں فسق سے مراد کفر لیا ہے۔

علامہ قرطبی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ:

''وأما الذین فسقوا (خرجوا عن الایمان الی الکفر).''

(جنھوں نے فسق کیا یعنی جو ایمان سے کفر کی طرف چلے گئے۔)(۳)

امام ابن جریر طبری رحمۃ اللہ کہتے ہیں کہ:

''وأما الذین فسقوا یقول: تعالی ذکرہ: وأما الذین کفروا باللّٰہ و فارقوا طاعتہ''.

پھر انھوں نے اس تفسیر کے حوالے کے طور پر امام قتادہ رحمۃ اللہ کا قول نقل کیا ہے کہ انھوں نے کہا کہ:

---

(۱) النکت والعیون: ۳۶۵/۴

(۲) زاد المسیر: ۱۱۷/۵

(۳) تفسیر قرطبی: ۱۰۷/۱۴

"وأما الذين وأشركوا."

(کہ مراد شرک کرنے والے ہیں۔)(۱)

اسی طرح ابو حیان رَحِمَهُ اللهُ نے (البحر المحيط :۸/ ۴۳۸) میں ، ابن عادل رَحِمَهُ اللهُ نے (اللباب :۱/ ۴۸۷) میں اور علامہ شوکانی رَحِمَهُ اللهُ نے (فتح القدير: ۹/۶) میں اسی طرح ذکر کیا ہے؛ بل کہ سبھی مفسرین کا یہی قول ہے۔

پس آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ اللہ و رسول کی اطاعت اور فرمانبرداری سے روگردانی کریں انھیں جہنم میں ٹھکانا دیا جائے گا۔لہٰذا اس آیت سے یہ مراد لینا کہ جو جماعت تبلیغ میں نہیں جاتا اس کو یہ عذابِ ادنی ہوگا، من مانی تفسیر ہے جو تفسیر بالرائی میں داخل ہے۔

(۳) آپ کے تیسرے سوال کے جواب سے پہلے چند امور سمجھ لیں کہ:

پہلی بات یہ ہے کہ "دعوت" اور "تبلیغ" یہ دو لفظ قرآن وسنت کے ذخیرے میں بکثرت استعمال کئے گئے ہیں، جن میں سے "تبلیغ" کے معنی یہ ہیں کہ اللہ کی جانب سے نازل کئے گئے احکامات وشریعت کو بلا کم و کاست اللہ کے بندوں کو پہنچانا اور "دعوت" کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کو ان احکامات پر چلنے کی طرف بلانا۔

حضرات انبیاء عَلَيهِمُ الصَّلاةُ وَالسَّلامُ کو اللہ تعالی نے تبلیغ ودعوت کی ذمہ داری دی اور دنیا میں بھیجا کہ اللہ کے دین وشریعت کو بلا کم وکاست لوگوں تک پہنچا دو اور پھر ان کی جانب انھیں دعوت بھی دو کہ وہ اس کو اپنائیں؛ کیوں کہ اسی میں ان کی نجات مقدر ہے۔اور امت کو بھی حکم ہے کہ وہ اللہ کے بندوں تک اللہ کے احکام وفرامین پہنچائیں اور ان کو اللہ کے دین کی جانب دعوت دیں۔

---

(۱) تفسير طبري:۲۰/ ۱۸۸

اور یہ کام تبلیغ و دعوت کا کسی بھی شرعی طریقے سے کیا جائے وہ دعوت و تبلیغ ہے، خواہ انفراداً ہو یا اجتماعاً ہو،تقریر و بیان کو ذریعہ بنا کر ہو یا تحریر و قلم کو واسطہ بنا کر ہو، پھر یہ علمی دلائل کو کام میں لاتے ہوئے ہو یا ترغیب و ترہیب کے وسائل سے کام لے کر وعظ و نصیحت کا انداز اختیار کرتے ہوئے ہو، یا مباحثہ و مناظرے کے طریق پر ہو، نیز یہ جمعہ کے دن خطبات کی صورت سے ہو یا کسی اور موقعہ و تقریب سے خطاب سے ہو، الغرض یہ ساری صورتیں دعوت الی اللہ و تبلیغ دین کی ہوسکتی ہیں، ان میں سے کسی بھی طریقے سے یہ کام کیا جائے وہ دعوت و تبلیغ ہے۔

یہ اس قدر واضح بات ہے کہ بظاہر تنبیہ کی ضرورت تو نہ تھی ؛ مگر بعض وقت اصطلاحات شرعیہ پر رسمیت کے غلبے سے حقائق پردے میں چلے جاتے ہیں تو پھر یہ واضح امور بھی وضاحت طلب بن جاتے ہیں۔

جیسے آج کل بعض لوگ یہ سمجھنے لگے ہیں کہ ''دعوت الی اللہ'' اور ''تبلیغ دین'' کسی خاص جماعت کے ساتھ مل کر اور اس کے نظام کے تحت کام کرنے کا نام ہے؛ حالاں کہ یہ اصل معنی پر بلا دلیل زیادتی ہے جس کا کسی کو حق نہیں کہ قرآنی و دینی اصطلاحات میں اپنی جانب سے نئے معنی داخل کرے۔

لہٰذا جو بھی شخص لوگوں کو اللہ کے دین کی جانب دعوت دے گا، خواہ وہ انفرادی طریقہ پر ہو یا اجتماعی طریقہ پر، پھر یہ اجتماعی دعوت کسی بھی جماعت کے ساتھ مل کر کرے، سب اللہ کے دین کی دعوت و تبلیغ کہلائے گی، اس کو کسی خاص جماعت کا اپنے لیے مخصوص کر لینا دین میں زیادتی ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ ''تبلیغ و دعوت'' اسلامی نقطہ نظر سے ایک ضروری کام ہے، جس پر قرآن و حدیث کے نصوص واضح طور پر دلالت کرتے ہیں۔ مگر یہ لازمی و

ضروری ہونا کبھی اور کسی کے حق میں فرض عین کے طور پر ہوتا ہے تو کبھی اور کسی کے حق میں فرض کفایہ کے لحاظ سے ہوتا ہے۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے:

''اس کی دو قسمیں ہیں: ایک خطاب خاص ایک خطاب عام، امر بالمعروف بخطاب خاص تو آپ کے ذمہ ہے، یہ کسی فرد بشر سے ساقط نہیں ہوتا اور امر بالمعروف بہ خطاب عام یعنی وعظ کہنا یہ سب کے ذمہ فرض نہیں ہے؛ بل کہ یہ صرف علما پر واجب ہے۔ اور امر بالمعروف خاص کا مدار قدرت پر ہے، یعنی جس کو جس کسی پر قدرت ہے، اس کے ذمہ واجب ہے، کہ امر بالمعروف کرے۔ مثلاً ماں باپ کے ذمہ واجب ہے کہ اپنی اولاد کو نماز روزہ کی نصیحت کریں، خاوند پر فرض ہے کہ اپنی بی بی کو احکام شرعیہ پر مجبور کرے، آقا کے لئے لازم ہے کہ اپنے نوکر چاکر جو ان کے ماتحت ہیں ان کو امر بالمعروف کرے۔''(۱)

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ نے ''تفسیر معارف القرآن'' میں قرآن وسنت سے متعدد دلائل دعوت وتبلیغ کی ضرورت پر بیان کرنے کے بعد اس کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے کہ:

''ان تمام آیات اور روایات سے یہی ثابت ہوا کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر امت کے ہر فرد پر لازم ہے، البتہ تمام احکام شرعیہ کی طرح اس میں بھی ہر شخص کی قدرت و استطاعت پر احکام دائر ہوں گے، جن کو جتنی قدرت ہو اتنا ہی امر بالمعروف کا فریضہ اس پر عائد ہوگا

(۱) خطبات حکیم الامت: ۱۳/ ۱۹

......پھر استطاعت وقدرت ہر کام کی جدا ہوتی ہے......(اس کی تفصیل بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ) امر بالمعروف کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے ایک جماعت خاص دعوت وارشاد ہی کے لیے قائم رہے، اس کا وظیفہ ہی یہی ہو کہ اپنے قول وفعل سے لوگوں کو قرآن و سنت کی طرف بلائے اور جب لوگوں کو اچھی کاموں میں سست یا برائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور برائی سے روکنے کی اپنے مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے۔''(۱)

اس میں حضرت نے یہ بتا دیا کہ ایک کام دعوت کا ہر فرد پر لازم ہے جس کو وہ اپنی قدرت و طاقت کے موافق انجام دیگا، جس کی تفصیل حضرت تھانوی کے کلام میں گزر چکی، اور دوسرا درجہ وہ ہے جس کو ایک مخصوص جماعت انجام دے گی، یہ سب پر نہیں ہے کہ وہ اس کام کے لئے نکل جائیں یا انجام دیں۔

قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ: ''ولتكن منكم الخ'' اس میں اسی فرض کفایہ کا بیان ہے، جیسا کہ امام ابو بکر الجصاص رحمہ اللہ نے احکام القرآن میں لکھا ہے:

''قد حوت هذه الآية معنيين: أحدهما وجوب الامر بالمعروف والنهي عن المنكر أنه فرض على الكفاية، ليس بفرض على كل أحد في نفسه إذا قام به غيره''. (۲)

اسی طرح امام ابن العربی رحمہ اللہ نے ''احکام القرآن'' میں اور امام قرطبی رحمہ اللہ نے اپنی تفسیر میں تصریح کی ہے۔(۳)

---

(۱) معارف القرآن: ۲/۷-۱۳۷-۱۳۹

(۲) احکام القرآن: ۲/۳۱۵

(۳) دیکھو: احکام القرآن: ۲/۱۱۴، تفسیر قرطبی: ۴/۱۶۵

لٰہذا ہر ایک پر اس کو فرض قرار دینا احکام شرعیہ کے خلاف ہے، لٰہذا عام انسان پر اس قدر ضروری ہے کہ وہ اپنے ماتحت لوگوں کو دعوت دے اور ان کو اسلامی احکام پہنچائے۔

تیسری بات یہ کہ ''دعوت وتبلیغ'' کے لیے اللہ تعالیٰ نے یا حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی خاص صورت وشکل متعین نہیں فرمائی؛ بل کہ اس کے اصول کی تعلیم دے دی ہے۔ جیسے آیت مذکورالذیل:

﴿ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِیْنَ ﴾

(آپ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کے راستے کی جانب دعوت دیجیے حکمت یعنی علمی دلائل سے اور موعظت یعنی اثر انگیز نصیحت سے اور (ضرورت پڑے تو) اچھے طریقہ سے ان سے بحث کیجیے، بلا شبہ تیرا رب خوب جانتا ہے اس کو جو اس کے راستے سے بھٹک گیا اور ان کو بھی خوب جانتا ہے جو راہ پر ہیں۔)

اس میں علی اختلاف الاقوال دعوت الی اللہ کی تین یا دو صورتیں: دعوت بالحکمت، دعوت بالموعظت اور دعوت بالمباحثہ بیان کئے گئے ہیں؛ مگر ان کو کن کن طریقوں سے انجام دینا چاہئے، یہ متعین نہیں؛ بل کہ اپنے اپنے احوال وظروف، ضرورت وسہولت، تقاضے ومطالبے کے لحاظ سے متعدد ومختلف صورتیں وشکلیں ان کی ہو سکتی ہیں اور ہوتی آرہی ہیں۔ اور اللہ کا کوئی بھی بندہ ان میں سے کسی بھی طریقہ وشکل سے دعوت الی اللہ وتبلیغ دین کا فریضہ انجام دے وہ درست وصحیح ہے، جب کہ وہ

دائرۂ شرع کے اندر ہو، اس میں کسی کو حق نہیں کہ وہ کسی کو ملامت کرے کہ فلاں ہی طریقہ سے دعوت الی اللہ و تبلیغ کا کام کیوں نہ انجام دیا؟ یہ حدود سے تجاوز و غلو فی الدین ہے، جس سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔

جیسے علم کا حاصل کرنا بھی فرض ہے؛ مگر اس کے لیے ایک شخص کسی مدرسے میں داخلہ لے یا کسی عالم کے پاس جا کر مدرسے کی خاص شکل کے بغیر پڑھ لے، یا کسی معتبر کتاب سے پڑھ کر حاصل کرے، اس کے اوپر کا فرض ادا ہو جاتا ہے، اس کو یہ پابند کرنا کہ مدرسے ہی میں پڑھنا چاہیے یا یہ کہ فلاں مدرسے ہی میں پڑھنا چاہیے، اس کا کسی کو حق نہیں اور اگر کوئی شخص ان میں سے کسی بھی طریق و ذریعہ کو اپنا کر علم دین حاصل کرلے تو اس پر یہ الزام لگانا کہ اس نے ہمارے طریق پر علم حاصل نہیں کیا، اس لیے وہ جاہل کا جاہل ہے، تجاوز عن الحدود ہے۔

چوتھی بات یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبے ہیں اور خود ''دعوت الی اللہ'' اور ''تبلیغ دین'' کی بھی صورتیں متعدد ہیں، ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ دین کو زندہ رکھنے کے لئے تمام شعبوں پر محنت ہو اور دعوت الی اللہ کی بھی مختلف صورتوں کو بروئے کار لایا جائے، اور یہ بھی واضح ہے کہ سب لوگ سب شعبوں میں نہ کام کر سکتے ہیں اور نہ اس کی صلاحیت ہی رکھتے ہیں، ایسی صورت میں شریعت ہی سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ تقسیم کار کے اصول پر کام کیا جانا چاہیے۔ لہٰذا اگر کچھ لوگ ایک شعبے یا چند شعبوں میں اور دوسرے حضرات دوسرے شعبوں میں کام کریں اور اسی طرح دعوت کی مختلف شکلوں میں سے بعض کسی کو اور دوسرے حضرات کسی اور کو اختیار کرلیں تو دین کے زندہ رہنے کا بھرپور سامان ہوگا۔

لہٰذا اس میں کوئی قباحت تو کجا؛ بل کہ یہی طریق و نظام مقرر ہے کہ تقسیم کار سے

اس نظامِ دین کو چلایا جائے۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

’’اگر تبلیغ کی قسمیں کردی جائیں کہ ایک تبلیغ اصول وعقائد کی ہے کفار کو، دوسری قسم تبلیغ فرد ہے مسلمانوں کو، تیسری قسم ایک جماعت کو تبلیغ کے قابل بنانا ہے۔ پھر تو درس وتدریس کا تبلیغ میں داخل ہونا بالکل ظاہر ہے اور جب تبلیغ کی مختلف قسمیں ہیں تو اب یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص ساری قسمیں ادا کرے؛ بل کہ اس کے لئے تقسیم خدمات ضروری ہے، پس ان سب کاموں کو خاص خاص جماعت کے سپرد کیا جائے یعنی قابلیت ومناسبت کو دیکھ کر تقسیم خدمات کی جائے؛ کیوں کہ ہر ایک آدمی ہر ایک کام کے قابل نہیں ہوتا۔‘‘(۱)

اب اس پر کسی کا یہ کہنا کہ میں نے جو طریق یا صورت دعوت کی یا کسی دینی شعبے کو زندہ رکھنے کی اختیار کی ہے وہی ایک صورت سبھی لوگوں کو اختیار کرنا چاہئے، اگر وہ کسی اور شعبے یا دعوت الی اللہ کی دوسرے صورت وشکل کو انجام دینے میں لگے ہیں تو وہ نہ تو دین کا کام کررہے ہیں اور نہ دعوت الی اللہ کا، تو کیا یہ بات معقول یا شرعاً صحیح ہے؟ یا یہ کہ دین سے ناواقفیت وعدم بصیرت کا نتیجہ ہے؟

پانچویں بات یہ ہے کہ تبلیغ و دعوت کے نام سے حضرت اقدس مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ نے جو تحریک جاری فرمائی ہے، یہ اپنے اصل پیغام ونظام کے لحاظ سے ایک مفید ومبارک تحریک ہے جس کا مقصد بھی واضح ہے اور جس کا طریق بھی روشن اور اس میں بھی کوئی کلام نہیں کہ اس کے آغاز کے وقت سے

(۱) خطبات حکیم الامت: ۱۳/ ۸۸-۸۹

بلا شک وشبہ ہر دور میں اس کے ذریعہ لاکھوں انسان راہِ راست وہدایت پر آئے، کتنے شرابی وکبابی لوگ نماز پنج گانہ کے پابند ہو گئے، کتنے آخرت سے غافل انسان اس سے متقی وپرہیز گار وتہجد گزار بن گئے، کس قدر چور وڈاکو قسم کے لوگوں کو اس سے راہِ راست میسر آئی! یہ سب ایک ایسی حقیقت ہے کہ کوئی بھی انصاف پسند وحق آشنا اس سے انکار نہیں کرسکتا۔ اس لیے احقر یہاں یہ واضح کر دینا چاہتا ہے کہ میرے نزدیک اس اصل کام کی مخالفت حرام و ناجائز ہے۔ ہاں! اس میں کوئی غلطیاں کرے، خلاف شرع یا خلاف اصول کوئی بات کرے تو علماء کا فرض ہے کہ وہ اس کی بھی اصلاح کریں اور اس کی اصلاح بھی امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں داخل ہے؛ لیکن نفس کام کی مخالفت صحیح نہیں۔

لیکن ایک بات ہمیشہ یاد رکھنا چاہئے کہ کسی کام کے مفید و نافع ہونے سے یہ لازم نہیں آتا کہ دیگر سارے طریقے غلط وحرام ہیں؛ اس لیے ان سب کو ترک کر دینا لازم ہے اور نہ اس سے یہ لازم آتا ہے کہ سارے کے سارے لوگوں پر اسی کو اختیار کرنا شرعاً لازم وواجب ہو جاتا ہو۔

مثال کے طور پر دار العلوم دیوبند ایک نافع دار العلوم ہے؛ مگر کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ دار العلوم دیوبند کے علاوہ کوئی دار العلوم قائم نہ رکھا جائے اور سب بند کر دئے جائیں یا یہ کہ دیگر سارے مدارس غیر نافع وغیر مفید ہیں؟ اسی طرح سمجھ لیا جائے کہ تبلیغی جماعت کا کام بے حد مفید و نافع ہے؛ مگر دوسرے تمام کام نہ غیر مفید ہو گئے اور نہ بند کر دئے جانے کے قابل؛ بلکہ سب اپنی اپنی جگہ مفید و نافع ہیں اور حسب حیثیت لازم وضروری بھی ہیں۔

جب یہ امور واضح ہو گئے تو آپ کے تیسرے سوال کی جانب متوجہ ہوتے ہیں

کہ تبلیغ کے نام سے جو جماعت حضرت اقدس مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی نے جاری فرمائی، وہ ایک نہایت مفید و نافع تحریک اور عوام الناس کے لیے ایک مناسب طریق کار ہونے کی وجہ سے اس میں جانا اور اس سے فائدہ اٹھانا خوب کام ہے اور باعث فضیلت امر ہے اور خود کو اعمال پر لگانے کا ایک عمدہ طریقہ و راستہ ہے، جیسا کہ اوپر بھی لکھا جا چکا ہے۔

لیکن دین اور علم دین سیکھنے کے لیے اسی میں جانا و نکلنا فرض و لازم نہیں ہے؛ بلکہ کسی بھی معتبر ذریعے سے دین سیکھنا اور علم دین کا حاصل کرنا ہر مؤمن پر ضروری ہے، خواہ وہ مدارس میں یا مکاتب میں داخل ہو کر ہو یا تبلیغی جماعتوں میں جا کر ہو یا علمائے کرام کی صحبتوں میں بیٹھ کر ہو یا معتبر کتابیں پڑھ کر ہو، بہ ہر حال علم کا حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح اپنی ظاہری و باطنی اصلاح و تربیت بھی لازم ہے تا کہ اللہ کے دین پر استقامت کے ساتھ چلتا رہے اور یہ بھی مختلف صورتوں و شکلوں سے ہو سکتا ہے اور انہی طریقوں میں سے ایک طریقہ جماعت میں جانا بھی ہے، ایک طریقہ مشائخ کی خانقاہوں سے ربط رکھ کر ان سے اصلاح لینا بھی ہے اور یہ طریقہ نہایت موزوں ہونے کے ساتھ ساتھ ہر دور میں کامیاب بھی ثابت ہوتا رہا ہے اور اسی طریقہ سے ہمیشہ اولیاء اللہ نے اپنے مریدوں کی اصلاح کی ہے اور خود ہمارے اکابر دیوبند جن میں حضرت مولانا قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا عبد الرحیم رائے پوری، حضرت مولانا عبد القادر رائے پوری، حضرت مولانا شاہ محمد الیاس کاندھلوی اور حضرت مولانا شیخ الحدیث زکریا کاندھلوی رحمہم اللہ بھی ہیں، یہ سب حضرات بھی اسی خانقاہی نظام سے وابستہ رہتے ہوئے خود اپنی بھی اصلاح کراتے رہے اور دوسروں کی اصلاح بھی

اسی طریقے سے کرتے رہے۔

لہٰذا اس فرض کو کسی بھی مناسب شکل سے انجام دے گا تو وہ اس فرض سے سبکدوش ہو جائے گا؛ لہٰذا جو شخص بھی اس طرح کسی طریقہ سے یہ کام انجام دے اور وہ جماعت میں نہ جائے تو اس پر کوئی الزام نہیں، کیوں کہ اس نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے اور اگر کوئی شخص کسی بھی طرح دین سے وابستہ نہ ہو، علم دین سے جاہل رہے، عمل سے کورا رہے، یا یہ کہ دینی و دعوتی کسی بھی کام سے تعلق نہ رکھے نہ انفراداً نہ اجتماعاً، حتی کہ بے دینی کی زندگی گزارتا ہو تو اس کے حق میں یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ عذاب کا مستحق ہے۔

لیکن جو شخص اللہ کے دین کے کسی بھی شعبے سے منسلک ہو کر دین کا کام اور دعوت کے کسی بھی طریقہ سے لگ کر دعوت و تبلیغ کا کام کر رہا ہے؛ لیکن خاص جماعت تبلیغ میں کسی وجہ سے نہیں جاتا یا اس سے جڑ کر کام نہیں کرتا تو اس کو برا سمجھنا، اس کے حق میں عذاب کی دھمکیاں بیان کرنا، یا اس کو کتے کی طرح ذلیل کہنا، یہ سب نہایت بے اعتدالی و غلو کی باتیں ہیں، نہ قرآن سے ایسا ثابت ہوتا ہے اور نہ احادیث سے، نہ علمائے کرام کی تحقیقات سے؛ بل کہ دوسرے دینی شعبوں سے صرف نظر یا ان کی تحقیر خود قابل مواخذہ ہے۔ لہٰذا اس قسم کی بے اعتدالیوں اور غلو آمیز کلام سے پرہیز کرنا چاہئے اور خود کو بھی محاسبۂ خداوندی سے مستغنی نہ سمجھنا چاہیے۔

(۴) اس واقعہ کی بندہ کو تحقیق نہیں اور اس میں کوئی قابل اشکال بات بھی نہیں؛ کیوں کہ اس سے اتنا ثابت ہوا کہ حضرت جی مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ کا اللہ پر یقین و توکل اس قدر تھا کہ انھوں نے ایسے حالات میں اللہ پر یقین کے ساتھ جماعتوں کو بھیجا، جس طرح ہمارے اکابر میں سے بعض نے ایسے سنگین حالات میں توکل و اعتماد علی اللہ سے وہ کچھ حاصل کیا کہ زبان ان کے بیان سے قاصر ہے۔

حضرت شیخ الحدیث رحمہ اللہ نے ”آپ بیتی“ میں اس قسم کے متعدد واقعات لکھے ہیں۔
مثلاً یہ واقعہ کہ مدرسہ مظاہر علوم کے ابتدائی محسنوں میں سے حافظ فضل حق صاحب کا یہ واقعہ لکھا ہے کہ انھوں نے حضرت مولانا مظہر نانوتوی رحمہ اللہ سے صبح یہ عرض کیا کہ حضرت! رات تو اللہ کے فضل سے اللہ کا غضب ہی ہو گیا، پوچھا کہ فضل سے غضب ہو گیا؟ کہا کہ رات اکیلا سو رہا تھا کہ تین چار آدمی گھس آئے، میں نے ان سے پوچھا کہ کیا تم چور ہو؟ کہا کہ ہاں! میں نے کہا کہ دیکھو میرا اور مدرسے کا سارا روپیہ اسی کوٹھری میں ہے، اس پر تالہ چھ پیسے کا لگ رہا ہے؛ مگر تم سب مل کر بھی اور دوسروں کو بھی بلا لو تب بھی اس کو توڑ نہیں سکتے، میں نے حضرت (مولانا مظہر صاحب رحمہ اللہ) سے سنا ہے کہ جس مال کی زکوۃ ادا کی جاتی ہے، وہ اللہ کی حفاظت میں ہو جاتا ہے، لہٰذا تم کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ کہنے لگے کہ حضرت! یہ کہہ کر میں تو سو گیا، پھر اٹھا اور ان لوگوں کو وہیں چھوڑ کر میں نماز کو چلا گیا اور وہ چور بھاگ گئے۔ (۱)

مگر اس واقعہ سے جیسے کوئی یہ نتیجہ نہیں نکال سکتا ہے کہ جو لوگ چور کو پکڑتے یا اس کے خلاف قانونی چارہ جوئی کرتے ہیں، وہ ایمان و یقین والے نہیں؟ اسی طرح حضرت جی کے واقعہ سے بھی یہی بات معلوم ہوتی ہے آپ کا توکل واعتماد علی اللہ اس قدر بڑھا ہوا تھا۔ اور ایسے واقعات دراصل ان حضرات اکابر کے مخصوص احوال کے مرہون منت ہوتے ہیں۔

نیز اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعتی و تبلیغی کام ایک بابرکت کام ہے، جس سے اللہ تعالی خوش ہوتے ہیں اور اس سے اللہ کی جانب سے انعامات ہوتے ہیں اور مصائب ٹلتے ہیں، وغیرہ۔ اور اس میں کسی کو کلام نہیں، کلام اس میں ہے کہ کیا

---

(۱) آپ بیتی: ۲/۹۷

اس کے علاوہ کسی اور کام سے ایسا نہیں ہوتا اور کیا دوسرے کام سے برکات کا نزول نہیں ہوتا؟ اور کلام اس میں ہے کہ کیا اس سے یہ بھی لازم آیا کہ اس میں شامل نہ ہو نے والا گنہ گار ہے؟ تو پھر کیا حضرت مولانا یوسف صاحب رحمہ اللہ نے حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمہ اللہ کو گنہ گار سمجھا اور قرار دیا تھا؟ اور ان کے علاوہ اس وقت کے لاکھوں انسان اور بالخصوص علما ومشائخ جو اس میں نہیں نکلے انھیں کیا گنہ گار و جہنمی تصور کیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ اس واقعہ سے یہ نہیں ثابت ہوتا اور جو ثابت ہے اس سے انکار نہیں۔

(۵) اس کا جواب اوپر سے معلوم ہو چکا کہ ایسی باتیں غلو کا نتیجہ ہیں اور قرآن و سنت سے ہٹی ہوئی ہیں، کہ جو بھی جماعت میں یا اس کے گشتوں و چلوں میں نہ جائے اس کو جہنمی یا مستحق عذاب سمجھا اور قرار دیا جائے۔ اور اس کے لئے نصوص کو غیر محل پر محمول کیا جائے۔ اگر ایسا ہونے لگے کہ جو بھی کوئی دینی کام و تحریک جاری ہو اس کے لوگ اس تحریک میں شامل ہونے کو لازم و ضروری قرار دیں اور نہ شامل ہونے والے کو جہنمی یا مستحق عذاب تو پھر کیا ہوگا؟ لہٰذا یہ بات سخت قابل مواخذہ و قابل تردید ہے۔

(٦) جی ہاں! اس طرح کی تقاریر جو اپنے حدود کو پھلانگ کر دین میں تجاوز کر جاتی ہیں، ان سے غلو پیدا ہوتا ہے اور لوگ دعوت کے مفہوم کو صرف اپنے طریقۂ کار تک محدود کر دیتے ہیں اور دوسرے دعوتی کاموں و صورتوں کو سرے سے دعوت ہی نہیں سمجھتے، نیز دین کے دوسرے شعبوں سے متعلق ان کی فکر یہ ہو جاتی ہے کہ وہ سب کوئی اہم کام نہیں ہیں، اہم و اصل کام صرف یہی ایک ہے، حالاں کہ خود اکابر تبلیغ نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ اس معاملے میں بھی ایسا غلو نہ کیا جائے اور حدود کو برقرار

رکھا جائے؛ لہٰذا اعتدال کو ملحوظ رکھنا ہر عالم دین کا فرض ہے، تاکہ عوام الناس کسی طرح بھی غلو میں مبتلا نہ ہو۔

حضرت اقدس مولانا سعید احمد خان صاحب مکی رَحِمَہُ اللہُ جو تحریک دعوت وتبلیغ کے اساطین میں مانے جاتے ہیں، انھوں نے اپنے ایک مکتوب میں جو "تبلیغی کام کے اہم اصول" کے نام سے شائع شدہ ہے، لکھا ہے:

"دین کے تمام شعبے ایسے ہی ہیں جیسے انسان کے اعضاء و جوارح، آنکھ سے دیکھنے کا کام، زبان سے بولنے کا کام، ہاتھ سے پکڑنے کانوں سے سننے، پیروں سے چلنے، دماغ سے سوچنے کا کام، یہ سارے کام انسان کے لئے ضروری ہیں۔ اگر ایک عضو میں بھی کمزوری ہوگی یا نقص ہوگا تو اس سے تمام جسم کو تکلیف ہوگی اور چیزوں سے استفادہ میں نقصان ہوگا۔ ان سب اعضاء کی سخت ضرورت ہے۔ یہ سب اعضاء ایک دوسرے کے معاون ہیں، مقابل نہیں ہیں۔ اسی طرح سے اللہ کا ذکر اور علم، عبادت، خدمت، اور معاملات، قضاۃ، سب ایک دوسرے کے معاون ہیں، مقابل نہیں ہیں، معاون ہونے ہی کی وجہ سے دین مکمل ہوتا ہے، دعوت تو ان تمام شعبوں کو دنیا میں پھیلانے اور عام کرنے ہی کے لئے ہے۔"(۱)

نیز حضرت والا نے اس سے ذرا پہلے ان لوگوں کے طرزِ عمل پر نکیر کی ہے جو دیگر شعبوں کا ذکر اس طرح کرتے ہیں جس سے ان شعبوں کی تنقیص و تحقیر لازم آتی ہے۔ آپ اسی مکتوب میں لکھتے ہیں:

---

(۱) تبلیغی کام کے اہم اصول: ۷-۸

''بہت سارے حضرات کو خصوصاً کسی دینی شعبے کو چلانے والے کے لیے ہماری دعوت اور ہمارے بیانوں سے اعتراض پیدا ہو جاتے ہیں کہ گویا ہم ان شعبوں کو ناقص سمجھ رہے ہیں یا ان کو حقیر سمجھ رہے ہیں، اگر ہمیں دعوت کا صحیح صحیح طرز آجائے تو ہر ایک ہمیں اپنا ہمدرد اور خیر خواہ سمجھ کر خود بھی قریب ہوگا اور ہمیں بھی اپنے سے قریب کرے گا، مثلاً جب ہم دعوت کے نمبر کو اور اس کی اہمیت کو بیان کرتے ہیں تو کبھی علم والوں کے شعبے پر یعنی مدارس پر اس طرح فوقیت دیتے ہیں گویا وہ اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں اور کبھی ذکر والوں کے مقابلے میں، جیسا کہ بہت سے واعظین حضور ﷺ کی فضیلت دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں اس طرح بیان کرنے لگتے ہیں کہ دوسرے انبیاء کی تنقیص لازم آنے لگتی ہے اور ان کا یہ طرز بیان دین کے لیے بہت خطرناک ہے، ایسے ہی ہمارا طرز بیان بھی خطرناک ہو جاتا ہے۔''(۱)

حضرت مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی رحمہ اللہ جو حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمہ اللہ کے بلاواسطہ فیض یافتہ ہیں، انھوں نے اپنے مواعظ میں متعدد مواقع پر اس بات کی وضاحت اور اس پر تنبیہ کی ہے کہ دین کے شعبے: علم وذکر اور دعوت سب ایک دوسرے سے مربوط ہیں اور سب کی ضرورت ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں:

''اللہ جل جلالہ وعم نوالہ نے ہماری کامیابی کے لئے اور ہم سب کو

(۱) تبلیغی کام کے اہم اصول: ۵

ایمان دار بنانے کے لئے تین چیزیں اتاری ہیں۔ تعلیم، تبلیغ اور تزکیہ،
اور ان تین چیزوں میں تضاد نہیں ہے، بلکہ تو اُم (جڑواں) ہیں۔ بغیر
ذکر کے علم پر عمل مشکل، بغیر علم کے ایمانی زندگی کا حاصل ہونا مشکل،
بغیر تبلیغ کے ایمانی زندگی کا چلنا اور پھیلنا مشکل۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کو یہ تینوں چیزیں ساتھ دی ہیں۔"(۱)

ان تینوں شعبوں کی ضرورت وافادیت اور ان کے باہمی ربط وتعلق کے سلسلے میں بانی جماعت تبلیغ حضرت اقدس مولانا شاہ محمد الیاس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ کا نقطۂ نظر سن لیں، حضرت مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

"حضرت مولانا الیاس صاحب رحمۃ اللہ نے ان تینوں کو جوڑا، ان تینوں کو اکٹھا کیا ہے، جو صرف علم حاصل کر رہا ہے، بے شک اس کے پاس علم کا نور ہو اور علم کے اعتبار سے اس کو پتہ چل جائے؛ لیکن اگر اس کے پاس ذکر نہیں ہے تو ہوسکتا ہے کہ وہ علم والا ظلمت میں رہے اور بہک جائے اور پھسل جائے اور جو صرف ذکر کر رہا ہے اور علم حاصل نہیں کر رہا ہے، ہوسکتا ہے کہ اس ذکر کرنے والے کو نور ذکر کامل ہو جائے؛ لیکن اس سے کوئی لغزش ہو جائے، کوتاہی ہو جائے، علم نہ ہونے کی وجہ سے۔ وہ زیادہ خطرہ کے موقعہ پر ہے۔ اور صرف علم وذکر والا جو دعوت وتبلیغ (یعنی کسی بھی نہج وطریقہ سے اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے اور اور پھیلانے کا کام) کے میدان میں نہیں ہے تو اس کے علم وذکر سے ہوسکتا ہے کہ ایک دائرے میں اسلام محفوظ رہے اور کچھ خاص

(۱) مواعظ عبیدیہ:۵۵۶

اشخاص کے پاس علم آجائے اور ذکر آجائے، لیکن پوری دنیا میں خدا کا نظم آجائے اور پوری دنیا میں اللہ کا حکم نافذ ہوجائے، تو یہ غلبہ بغیر دعوت و تبلیغ کے کام کے نہیں ہوگا۔ اس واسطے یہ تینوں چیزیں متلازم ہیں اور بڑے حضرت رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ تینوں چیزیں متلازم ہیں۔"(۱)

اسی کے ساتھ حضرت مولانا شاہ محمد الیاس صاحب رحمہ اللہ کا ایک ملفوظ سن لیجئے جس کو حضرت مولانا عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اپنے مواعظ میں نقل کیا ہے، فرمایا:

"حضرت مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ فرماتے تھے کہ میں علم اور ذکر کی تقویت کے لئے تبلیغ کا کام کر رہا ہوں، جب آدمی جماعت میں چل کر تین چلے لگالے گا اور پھر تم اس کو علم پر اور دوازدہ تسبیح پر ڈال دو گے تو وہ زیادہ نفع بخش کام کرنے والا بن جائے گا۔ فرماتے تھے کہ تبلیغ سے ذریعہ تصوف کی طرف کھینچنا ہے اور تبلیغ کے ذریعہ علم کی طرف کھینچنا ہے۔......مولانا عبید اللہ صاحب رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ...... "اسی طرح حضرت (مولانا الیاس صاحب رحمہ اللہ) بغیر ذکر اور علم کے تبلیغ سے بہت جلد فتنوں کے آنے کا اندیشہ ظاہر کرتے تھے، اور فرماتے تھے کہ بغیر علم و ذکر والی تبلیغ کے ذریعہ صدیوں میں آنے والا فتنہ و فساد منٹوں میں آجائے گا اور جب تبلیغ کا کام صحیح اصولوں پر ہوگا تو صدیوں کے فتنے و فساد منٹوں میں ٹل جائیں گے۔"(۲)

(۱) مواعظ عبیدیہ: ۴۵۱

(۲) مواعظ عبیدیہ: ۱۹۷

الغرض ان اکابر کے بیانات وتصریحات سے یہ بات واضح ہوگئی کہ دین کے تمام شعبے اپنی اپنی جگہ لازم وضروری ہیں، اور ایک دوسرے سے مربوط بھی، اور ایک شعبے والے دوسرے شعبے والوں کے معاون ہیں نہ کہ مقابل، اور ایک دوسرے کے رفیق ہیں، نہ کہ فریق، لہٰذا سب کو اسی طرح دین کے شعبوں میں معاون بننا چاہئے نہ کہ ایک دوسرے کے مقابل۔

خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ تبلیغی جماعت کی تحریک امت کے حق میں ایک مفید ونافع ومبارک تحریک ہے، اور فی نفسہ اس کا کام ونظام شریعت کے کلیات واصول کے تحت جاری فرمایا گیا ہے، اور اس لئے اس کے اصل کام ونظام کی مخالفت جائز نہیں، ہاں! اس میں مرور زمانہ کے اعتبار سے یا بعض نا تربیت یافتہ لوگوں کی وجہ سے غلو نے اپنی جگہ بنالی ہے اور عوامی سطح پر یہ غلو بہت سی بے اعتدالیوں وغلطیوں کا سبب بن گیا ہے، جن کی اصلاح حضرات علماء کرام پر ہے، وہ پوری بصیرت کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش کرتے رہیں اور اس میں تغافل نہ برتیں تا کہ اس میں مزید غلو نہ پیدا ہو اور مفید تحریک ضرر کا باعث نہ ہو جائے۔

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہئے کہ علمائے کرام کی جانب سے یہ اصلاحی کام، تبلیغی کام کے مخالف نہیں، بلکہ درحقیقت اس کا معین و مددگار ہے، بعض لوگ جب دیکھتے ہیں کہ علماء کی جانب سے ان کی غلطیوں و بے اعتدالیوں پر نکیر ہو رہی ہے تو وہ اس کو اصل کام کی مخالفت سمجھ جاتے اور اسی طرح لوگوں میں پروپگنڈہ کرتے ہیں کہ فلاں مولانا یا عالم تبلیغ کے مخالف ہے، حالانکہ مولانا و عالم اگر غلطیوں پر نکیر کرتے ہیں تو در حقیقت ان لوگوں کی اور اس تبلیغی کام کی ہمدردی میں کرتے ہیں۔

لہٰذا اہل حق ہمیشہ حق کی تلاش اور حق کے سامنے آنے پر اس کو قبول کرنے تیار

رہتے ہیں، اور یہی دراصل اہل حق کی پہچان ہے، اگر غلط کو غلط اور غلو کو غلو نہ کہا جائے تو دین وشریعت اپنی اصلی شکل میں کیسے باقی رہ سکتے ہیں؟

سوال کے جواب میں یہ تحریر کافی طویل ہوگئی؛ مگر چوں کہ اس قسم کی باتیں لوگ بار بار پوچھتے بھی رہتے ہیں اور خود بعض اوقات ہمیں بھی بعض ناواقف لوگوں کی جانب سے غلو آمیز صورت حال سے سابقہ پڑتا ہے؛ اس لئے خیال ہوا کہ اس کا جواب مفصل لکھ دیا جائے، امید ہے کہ یہ سطور کسی مزید غلط فہمی کا ذریعہ نہیں؛ بل کہ حقائق کو سمجھنے اور غور وفکر کی راہ کھولنے میں مفید ونافع ہوگی۔

اللہ مجھے اور سبھی کو اپنے نفسوں کے شرور اور اپنے اعمال کے قصور سے محفوظ رکھے۔ آمین یارب العالمین

فقط

الجامعۃ الاسلامیۃ مسیح العلوم، بنگلور

۲۸/محرم الحرام/۱۴۳۵ھ

ہندوستان میں

سعودی عرب کے مطابق رمضان وعید

ایک علمی و فقہی تبصرہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ہندوستان میں سعودی عرب کے مطابق رمضان وعید

ایک علمی وفقہی تبصرہ

عام طور پر رمضان وعید کے چاند میں ہمارے ہندوستان میں نیز بعض اور ممالک میں اور سعودی عرب میں ایک یا دو دن کا اختلاف ہوتا ہے، اس موقعے پر بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب سعودی میں چاند نظر آ گیا تو سب کو اسی کا اتباع کرنا چاہئے۔ اور بعض لوگ ایسا کرتے بھی ہیں کہ سعودی چاند کے حساب سے ہی یہاں روزے رکھتے اور عید مناتے ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر ممالک لندن، امریکہ وغیرہ بعض اور ممالک میں بھی یہی اختلاف لوگوں میں دیکھنے و سننے کو ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں کیا صحیح ہے؟ اور جو لوگ سعودی عرب کی اتباع کرتے ہیں ان کی یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ احقر کے پاس ایک صاحب کا اس سلسلے میں سوال آیا تو اس کا جواب احقر نے لکھا اور وہ مسئلہ کی صورت حال کی وجہ سے ذرا تفصیلی لکھا گیا۔ یہاں اسی جواب کو پیش کیا جا رہا ہے۔

سب سے پہلے ایک بات یہ سمجھ لیں کہ اہل علم میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ ایک جگہ چاند نظر آ جائے تو دوسرے تمام مسلمانوں پر اس کا اتباع لازم ہے یا

نہیں؟اس میں متعدد اقوال ہیں اور اس میں اکثر علما کا مختار و معتمد یہ ہے کہ اختلاف مطالع کی وجہ سے ایک جگہ کا چاند لازمی طور پر دوسری جگہ کے لیے قابل قبول نہیں ہوتا، کیوں کہ یہ بات مسلم ہے کہ چاند کے مطالع میں علاقے کے لحاظ سے اختلاف ہوتا ہے؛لہذا یہاں کے لوگ یہاں کے مطلع کا اور وہاں کے لوگ وہاں کے مطلع کا اعتبار کریں۔شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ نے بھی اسی رائے و نظریے کو اختیار کیا ہے۔نیز ''المجمع الفقہی الاسلامی (جدہ)'' نے بھی اپنی قرار داد میں اسی کی تائید کی ہے،جیسا کہ ہم نقل کریں گے۔اس پر تفصیلی کلام ہماری کتاب ''نفائس الفقہ'' میں دیکھیے۔تاہم ایک نقطۂ نظر کے مطابق یہ گنجائش ہے کہ کوئی سعودی عرب کا اتباع کر لے۔مگر یہاں جس اہم پہلو پر توجہ دینے کی ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ایک شخص ایک ایسی بستی میں ہو جہاں اہل علم کی کمیٹی ہو اور وہ رویت ہلال کے بارے میں جانکاری لیتی ہو اور سب کے لئے ایک لائحہ سناتی ہو،اور وہاں کے مسلمان اس کمیٹی کے فیصلوں کا اعتبار کرتے ہوئے روزہ وعید کرتے ہوں،ایسی جگہ میں کسی کا یہ نعرہ لگانا کہ سعودی میں جو فیصلہ ہوا ہم اس کی اتباع کرتے ہیں اور وہی قابل اتباع ہے، یہ بات صحیح نہیں ہے،ایک تو اس لیے کہ یہ کہنے والے سعودی کے علاوہ میں اگر چاند پہلے ہوتو اس کو ماننے تیار نہیں ہوتے، حالاں کہ اسلام میں سعودی کی تخصیص کی کوئی دلیل نہیں اور نہ کسی امام کا مسلک ہے کہ صرف سعودی کے چاند کا اعتبار ہے، دوسرے اس لیے کہ اس سے امت میں انتشار و اختلاف پیدا ہوتا ہے، جو کہ صحیح نہیں۔

یہاں ہم اس سلسلے کے چند اہم فیصلے و فتاوی نقل کرنا مناسب سمجھتے ہیں،تا کہ بات واضح ہو جائے۔سب سے پہلے ہم سعودی عرب کے بڑے بڑے علما کی مجلس کا متفقہ فیصلہ نقل کرتے ہیں جس کو ''مجلس هيئة كبار العلما'' کہا جاتا ہے،اس مجلس نے

جو فیصلہ کیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''چاند کے مطلع میں اختلاف کا ہونا ان امور میں سے ہے جو حسّاً و عقلاً معلوم ہیں اور اس میں کسی بھی عالم کا اختلاف نہیں، ہاں اس میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ اختلاف مطالع کا اعتبار ہے یا نہیں ہے؟ اور اختلاف مطالع کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا مسئلہ ان نظری مسائل میں سے ہے جن میں اجتہاد کی گنجائش ہے۔ اور اس میں ان حضرات کی جانب سے اختلاف ہوا ہے جن کو علم و دین میں ایک شان حاصل ہے اور یہ وہ جائز اختلاف ہے جس پر حق کو پا جانے والے کو دو اجر ایک اجتہاد کا اور ایک حق کو پانے کا ملے گا اور خطا کرنے والے کو ایک اجر ملے گا۔.......... پس اس دین پر چودہ صدیاں گزر گئیں جس میں سے کبھی بھی ایک ہی رویت پر پوری امت اسلامیہ کا اتحاد ہوا ہو یہ ہم نہیں جانتے۔ لہٰذا کبار علما کی یہ مجلس کا نظریہ ہی یہ ہے کہ اس مسئلہ کو اپنی سابقہ حالت پر رہنے دیا جائے۔ اور اس موضوع کا نہ چھیڑا جائے اور یہ کہ ہر ملک کے لوگوں کو یہ حق دیا جائے کہ وہ اپنے علما کے واسطے سے ان میں سے جس رائے کو چاہیں اختیار کریں۔''(۱)

اس اصولی بحث کے بعد خاص زیر بحث صورت کے بارے میں بھی علمائے عرب کے فتاوی ملاحظہ کیجئے کہ وہ کیا فرماتے ہیں؟ سعودی عرب کے معروف عالم دین اور وہاں کے مفتیٔ اعظم علامہ شیخ عبدالعزیز بن باز رَحِمَہُ اللہُ کا فتوی نقل کرتا ہوں جو اس سلسلے میں نہایت واضح وبصیرت افروز ہے، اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں وہ کہتے ہیں:

---

(۱) بہ حوالہ فتاوی اللجنة الدائمة: ۱۰/ ۱۰۹-۱۱۱

’’الذي يظهر لنا من حكم الشرع المطهر أن الواجب عليكم الصوم مع المسلمين لديكم ؛ لأمرين: أحدهما : قول النبي صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم : (الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والأضحى يوم تضحون) خرّجه أبو داود وغيره باسناد حسن ، فأنت و اخوانک مدة وجودكم في الباكستان ينبغي أن يكون صومكم معهم حين يصومون ، و افطاركم معهم حين يفطرون، لأنكم داخلون في هذا الخطاب، ولأن الروية تختلف بحسب اختلاف المطالع، و قد ذهب جمع من أهل العلم منهم ابن عباس الى أن لأهل كل بلدة رؤيتهم. الأمر الثاني: أن في مخالفتكم المسلمين لديكم في الصوم والافطار تشويشاً ودعوةً للتساؤل والاستنكار واثارةً للنزاع والخصام ، والشريعة الاسلامية الكاملة جاء ت بالحث على الاتفاق والوئام والتعاون على البر والتقوى ، وترک النزاع والخلاف الخ ‘‘. (۱)

(اس سلسلے میں پاکیزہ شریعت کا جو حکم ہمارے سامنے واضح ہوا وہ یہ ہے کہ آپ پر اپنے یہاں کے مسلمانوں کے ساتھ روزہ رکھنا واجب ہے ،اس کی دو وجوہ ہیں: ایک یہ کہ اللہ کے نبی صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّم نے فرمایا کہ: ’’روزہ اس دن ہے جس دن تم (مسلمان) روزہ رکھواور افطار

(۱) مجموع فتاوی ابن باز:۱۵/۱۰۳-۱۰۴

یعنی عید اس دن ہے جس دن تم (مسلمان) افطار کرو اور قربانی اس دن ہے جس دن تم قربانی کرو‘‘۔اس حدیث کو ابو داود وغیرہ نے سند حسن سے روایت کیا ہے۔لہٰذا آپ اور آپ کے بھائی جب تک پاکستان میں ہیں آپ پر ضروری ہے کہ وہاں کے مسلمان جب روزہ رکھیں اس وقت ان کے ساتھ روزہ رکھیں اور وہ جب افطار (یعنی عید) کریں اس وقت ان کے ساتھ افطار کریں، کیونکہ آپ بھی اس خطاب میں داخل ہیں، اور اس لیے بھی کہ اختلاف مطالع کی وجہ سے رویت میں بھی اختلاف ہوتا ہے اور علما کی ایک جماعت جن میں ابن عباس بھی ہیں اس طرف گئی ہے کہ ہر بستی والوں کے لیے ان کی اپنی رویت کا اعتبار ہے۔اور دوسری وجہ یہ ہے کہ تمہارا وہاں کے مسلمانوں کے ساتھ روزہ و افطار میں اختلاف کرنا تشویش وانتشار اور سوال جواب کے سلسلہ کی دعوت اور نزاع واختلاف کو بھڑکانے کا باعث ہے جب کہ اسلامی شریعت کاملہ اتفاق واتحاد اور ایک دوسرے سے تقوی ونیکی میں تعاون پر ابھارتی ہے اور ترک اختلاف کی تعلیم دیتی ہے۔)

شیخ بن باز رحمہ اللہ نے اسی سلسلہ کے ایک سوال کے جواب میں ایک اور فتوے میں لکھا ہے کہ:

’’على المسلم أن يصوم مع الدولة التي هو فيها و يفطر معها لقول النبي صلى الله عليه وسلم (الصوم يوم تصومون والفطر يوم تفطرون والأضحى يوم تضحون) والله أعلم.‘‘

(مسلمان پر واجب ہے کہ وہ اس ملک کے لوگوں کے ساتھ روزہ رکھے اور افطار کرے جس میں وہ رہتا ہے ، کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ: روزہ اس دن ہوگا جس میں تم روزہ رکھو اور افطار اس دن جس میں تم افطار کرو اور قربانی اس دن جس میں تم قربانی کرو، واللہ اعلم ۔)(۱)

اور معروف عربی عالم و مفتی علامہ شیخ محمد بن صالح العثیمین رحمہ اللہ نے اپنے بعض فتاوی میں اگر چہ اس کی اجازت دی ہے کہ علما کے ایک نظریے کے مطابق کوئی چاہے تو مملکت سعودیہ کی اتباع کر سکتا ہے، تاہم جہاں اختلاف وانتشار پیدا ہونے کا خطرہ محسوس کیا تو اس سے منع کیا ہے اور یہی کہا ہے کہ ہر علاقے کے لوگوں کو اپنے یہاں کے لوگوں کے ساتھ ہی روزہ وعید کرنا چاہئے ۔اس سلسلے میں ان کے ایک دو فتاوی ملاحظہ کیجئے ۔ان سے کسی نے سوال کیا ہے:

''ہم فلاں......ملک میں خادم الحرمین کی جانب سے سفیر ہیں، یہاں ہمیں رمضان المبارک کے روزوں اور عرفہ کے روزے کے بارے میں پریشانی ہے۔اس بارے میں ہمارے ساتھی تین قسم کے ہیں: ایک وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم مملکت سعودیہ کے ساتھ روزہ رکھیں گے اور افطار یعنی عید بھی کریں گے، دوسرے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم جس ملک میں ہیں وہاں کے مطابق روزہ وعید کریں گے اور تیسرے وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم روزہ تو اس ملک کے مطابق رکھیں گے اور یوم عرفہ سعودی کے مطابق مانیں گے۔آپ اس میں شافی جواب سے رہنمائی کریں۔''

(۱) فتاوی شیخ ابن باز: ۳/ ۱۷۵

اس سوال کے جواب میں علامہ العثیمین رحمہ اللہ نے لکھا:

''ایک ملک میں چاند نظر آئے اور دوسرے میں نہ دکھائی دے تو اس بارے میں علماء کا اختلاف ہے کہ کیا تمام مسلمانوں پر اس پر عمل لازم ہے یا صرف ان پر جنھوں نے دیکھا اور جو ان کے مطلع میں ان کے موافق ہیں، یا صرف ان پر جو ایک ولایت کے تحت رہتے ہیں، اس میں متعدد اقوال ہیں۔ اور اس میں راجح قول یہ ہے کہ اگر دو ملکوں کا مطلع ایک ہو تو وہ ایک مانا جائے گا۔ لہٰذا ان میں سے ایک جگہ چاند دکھائی دے تو دوسرے ملک میں بھی اس کا حکم ثابت ہوگا، لیکن اگر مطلع میں اختلاف ہو تو ہر ملک کا الگ حکم ہوگا...... (پھر اس کے دلائل ذکر کر کے فرماتے ہیں)...... اس بنا پر تم لوگ روزہ رکھو اور افطار کرو جس طرح کہ اس ملک کے لوگ کرتے ہیں جس میں تم لوگ ہیں، خواہ وہ تمہارے اصل وطن (سعودی عرب) کے موافق ہو یا اس کے خلاف ہو۔''(۱)

اسی طرح شیخ العثیمین رحمہ اللہ نے اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ:

''مسلمانوں پر واجب ہے کہ ان کا کلمہ ایک ہو اور وہ اللہ کے دین میں تفرقہ نہ ڈالیں، اور یہ کہ ان کا روزہ اور ان کے عید بھی متحد ہو اور وہ اپنے یہاں کے دینی مرکز کی اتباع کریں، اور وہ اختلاف نہ کریں حتی کہ اگر ان کے یہاں روزہ سعودی مملکت یا کسی اور اسلامی ملک کے لحاظ

(۱) فتاوی شیخ العثیمین: ۱۷/۳۹-۴۱

سے بعد ہی میں کیوں نہ ہو، بہر حال وہ اپنے مرکز کا اتباع کریں۔"(۱)

سعودی عرب کے مشہور دار الافتاء "اللجنة الدائمة للبحوث العلمية والافتاء" کے فتاوی میں بھی یہی بات کہی گئی ہے، ایک سوال اس کے مفتیان سے کیا گیا ہے کہ:

"ہم ریڈیو سے سعودیہ میں چاند ہو جانے کی خبر سنتے ہیں، جب کہ ہمارے یہاں چاند نظر نہیں آتا، تو بعض لوگ اس پر روزہ رکھ لیتے ہیں اور اکثر لوگ انتظار کرتے ہیں، اس سے بہت سخت اختلاف پیدا ہو گیا ہے؛ لہٰذا اس سلسلے میں فتوے دیں؟ اس کے جواب میں فتوے میں اولا اختلاف مطالع کا ذکر اور اس میں ائمہ کے مسالک کا ذکر کیا گیا ہے، پھر آخر میں لکھتے ہیں کہ: "جب ریڈیو یا کسی اور ذریعہ سے اپنے علاقے کے مطلع کے علاوہ کسی اور جگہ چاند ہو جانے کا ثبوت ہو تو آپ لوگوں پر لازم ہے کہ روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کا معاملہ وہاں کے حاکم کے حوالے کر دیں۔"(۲)

اسی طرح ایک اور فتوے میں لکھتے ہیں کہ اگر اختلاف ہو تو وہاں اگر مسلمان حاکم ہو تو اس کے کا فیصلہ لیں اور اگر مسلمان نہ ہو تو وہاں کے مرکز اسلامی کی مجلس کا فیصلہ مانیں تاکہ اس ملک کے مسلمانوں کا روزہ وعید میں اتحاد باقی رہے۔(۳)

اور سعودی عرب کے ہی ایک اور معروف عالم علامہ شیخ صالح بن فوزان رحمہ اللہ سے سوال کیا گیا کہ:

---

(۱) فتاوی العثیمین: ۱۷/۵۲

(۲) فتاوی لجنة الدائمه: ۱۰/ ۹۷-۹۸

(۳) فتاوی لجنة الدائمه: ۱۰/ ۱۰۱-۱۰۲

''اگر کسی اسلامی مملکت مثلاً سعودی میں رمضان کے آنے کا ثبوت ہو جائے اور دوسرے ممالک میں اس کے آنے کا اعلان نہ ہو تو کیا حکم ہے؟ کیا ہم سعودیہ کے مطابق روزہ رکھیں؟ اور دونوں ممالک میں اختلاف ہو تو کیا حکم ہے؟ شیخ صالح بن فوزان رحمہ اللہ نے اس کا جواب یہ دیا کہ: ''ہر مسلمان اپنے ملک میں موجود مسلمانوں کے ساتھ روزہ وافطار کرے، اور مسلمانوں پر اپنے علاقے میں رویت کا اہتمام کرنا لازم ہے اور وہ لوگ دوسرے ایسے علاقے کی رویت پر روزہ نہ رکھیں جو دوری پر واقع ہو، کیونکہ مطالع مختلف ہیں، اور اگر یہ فرض کیا جائے کہ کچھ مسلمان کسی غیر اسلامی ملک میں ہیں اور وہاں مسلمان نہیں ہیں جو رویت کا اہتمام کریں تو وہ لوگ سعودیہ کے ساتھ روزہ رکھیں تو کوئی حرج نہیں۔''(۱)

یہ علمائے عرب میں سے معروف اصحابِ افتا کے چند فتاویٰ ہیں، جن سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوگئی جو یہاں یا کہیں اور رہتے ہوئے سعودی عرب کے چاند پر رمضان وعید کرتے ہیں۔ لہٰذا ان کو اس طرح کی غلطی سے باز آنا چاہیے اور مسلمانوں میں اختلاف وانتشار پھیلانے سے احتراز کرنا چاہیے۔

فقط والسلام
محمد شعیب اللہ خان

(۱) المنتقی: ۲۴/۳

اجمالی فہرست

جلد پنجم

Co-Published By:

Head Office: #30, 2nd Floor, Bannerghatta Road, Opp. MICO Back Gate, Bangalore-560 030. Tel.: 080-45174517

Branch Office: # 426/3, Matia Mahal, Jama Masjid, Delhi-110 006.

Published by:
MAKTABA MASEEHUL UMMAT, DEOBAND, Minara Market,
Near Masjid Rasheed, Deoband - 247 554.
Mobile: +91-9634307336 Email: maktabamaseehulummat@gmail.com
MAKTABA MASEEHUL UMMAT, BANGALORE,
#84, Armstrong Road, Bangalore - 560 001. Mobile: +91-90367 01512

www.muftishuaibullah.com